پھولوں کو مرجھانے نہ دینا

عابدہ نرجس

پھولوں کو مُرجھانے نہ دینا

عابدہ نرجس

اسٹاکسٹ :-
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاھور۲۔ فون:7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

صبح ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی خضرا کو صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھولتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر وہ آنکھیں کھولے گی تو باہر بھی ویسا ہی اندھیرا ہو گا جیسا اس کی آنکھوں کے اندر بھرا ہے۔ شور سے اس کے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ چاروں طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ خوفناک، لرزا دینے والی، غیر انسانی، نامانوس آوازیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے......؟ اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی تھیں۔ تکیے میں منہ چھپائے سہمی ہوئی دبکی پڑی تھی۔ اس کی ساری گردن پسینے میں بھیگ رہی تھی۔ دروازہ زور سے بجا اور آوازیں قریب آ گئیں۔ اس کا سارا جسم لرز گیا اور وہ سمٹ کر گٹھڑی سی بن گئی۔

''تم نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ تم نکھٹو، آوارہ اور بیکار ہو۔ اگر میری ماں کا یہ مکان نہ ہوتو ہم فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوں۔'' ماں کی آواز میں انگاروں کی سی تپش تھی۔

''بکواس بند کرو......'' باپ دھاڑا۔ ''اپنی ماں کی جائیداد کا رعب کسی اور پر جمانا سمجھیں۔ میں اپنے بچوں کو کھلا سکتا ہوں۔''

''کبھی دو پیسے تو میرے ہاتھ پر رکھے نہیں، تم بچوں کو کیا کھلاؤ گے؟'' ماں کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

''تمہارے ہاتھ پر دو پیسے رکھنے کے لئے میں چوری نہیں کر سکتا، ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے ملازمت مل جائے تو تمہاری یہ حسرت بھی پوری کر دوں گا۔'' باپ کا لہجہ دبا ہوا تھا۔

''اونہہ......تم ملازمت کرو گے؟ تم ملازمت کرنے والے ہوتے تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔'' ماں نے طنزیہ انداز میں جتایا۔

''تو پھر کہیں سے کوئی خزانہ لا دو تاکہ میں کوئی کاروبار شروع کر دوں اور تم دنوں میں دولت سے کھیلنے لگو۔'' باپ نے چبا چبا کر فقرہ مکمل کیا۔

"کاروبار کے نام پر تم نے پہلے بھی سارے جمع جتھے کو آگ لگائی ہے۔ اب میں اور کہاں سے لاؤں؟ اور جیسا تم کاروبار کرتے ہو ناں میں جانتی ہوں۔" ماں کا طعنہ بڑا کاٹ دار تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" باپ کو جیسے آگ لگ گئی اور دونوں کی آوازوں کا لاوا پوری شدت سے بہنے لگا۔

خضرا کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں لیکن پگھلے ہوئے سیسے جیسی گرم آوازیں پھر بھی اس کی سماعت میں اترتی آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آپ سے آپ بہے چلے آتے تھے۔

پھر کرسی کو ٹھوکر لگی، میز الٹا، مونڈھے لڑھکے، برتن ٹوٹے۔ ماں کی چیخوں کی آواز گونجی اور یکدم باپ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بستر سے اتار لیا۔ دوسرے ہاتھ سے خرم کو گھسیٹا۔ وہ دونوں کاندھے سکیڑے، سہمے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگے۔

"میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر جا رہا ہوں۔ تم جیسی آوارہ، بدچلن سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔" باپ غصے میں منہ سے کف گراتا ہوا بولا۔

"نہیں......تم ان کو نہیں لے جا سکتے۔" ماں دوڑ کر سامنے آ گئی۔

"امی، امی!" خرم روتے ہوئے ماں کی طرف لپکا۔ لیکن باپ نے اس کا بازو نہیں چھوڑا اور اسے جھٹکا دے کر ماں سے دور کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا لیکن اس جھٹکے نے اس کے سہمے ہوئے ہونٹوں کے بند کھول دیئے۔ وہ پوری قوت سے چیخنے لگا اور آنسوؤں کے بغیر روتا چلا گیا۔

خضرا کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ آنسوؤں سے خالی آنکھوں کے ساتھ گرد و پیش کو خوفزدگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بازو پر اس کے باپ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اسے اس کی انگلیاں اپنی کلائی میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

ماں دونوں بازو پھیلائے ہوئے پھر سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "یہ میرے بچے ہیں...... تم انہیں نہیں لے جا سکتے۔" وہ اتنی قوت سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

"تم کون ہوتی ہو میرا راستہ روکنے والی۔" باپ غرایا اور دونوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لے چلا۔

"میں تمہاری بیوی ہوں......تمہارے بچوں کی ماں ہوں۔ میں انہیں نہیں جانے دوں گی۔" وہ دیوانگی سے آگے بڑھی۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بکواس نہ کرو......نہ تم ماں ہو نہ بیوی۔ تم صرف عورت ہو، ذلیل اور آوارہ عورت۔ تمہیں بچوں کی کیا پرواہ ہے......تم اپنے عیش و عشرت سے غرض رکھو۔" باپ نے دانت پیستے ہوئے کہا اور اسے دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

خضرا نے دیکھا کہ ماں اس کے دھکے سے پلنگ پر جا گری لیکن فوراً ہی سنبھل کر اٹھی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں نہ جانے کیا کچھ کہتی ہوئی باپ کے پیچھے دوڑتی چلی آئی لیکن باپ ان دونوں کو لئے تیزی سے زینے کی سیڑھیاں اترا اور گھر کے دروازے میں سے باہر آ گیا۔

ماں دروازے تک آئی لیکن باپ نے نہ پیچھے مڑ کر دیکھا نہ ان دونوں کو دیکھنے دیا۔ خرم سہم کر بالکل خاموش ہو گیا۔ خضرا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار سا بندھ گیا۔ ماں پیچھے رہ گئی تھی اور باپ اسے نہ جانے کہاں لئے جاتا تھا، کچھ پتہ نہیں تھا۔ لاعلمی خوف بن کر اس کے ننھے سے دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ آگے کیا ہونے والا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

وہ کھلی سڑک پر آ گئے تھے۔ دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک پر آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ ہر طرف کی سواریاں ان کے برابر سے گزر رہی تھیں۔ باپ نے ان کی کلائیاں اب بھی مضبوطی سے تھام رکھی تھیں اور اتنی تیز چل رہا تھا کہ خرم کو اس کا ساتھ دینے کے لئے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ وہ خود نہ جانے کس دھن میں تھا کہ اسے اپنے ہمراہ گھسٹتے ہوئے بچوں کی بھی کچھ خبر نہیں تھی کہ دونوں پر کیا گزر رہی تھی۔

اچانک ایک جگہ رک کر اس نے سامنے سے آتے ہوئے رکشے کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ رکشہ ڈرائیور نے سر باہر نکال کر ابرو کے اشارے سے پوچھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اس نے کوئی ایسا نام لیا جو خضرا نے کبھی نہیں سنا تھا۔ رکشہ ڈرائیور نے چلنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو اس نے پہلے ان دونوں کو رکشے میں سوار کرایا اور پھر خود بھی جھک کر اندر داخل ہوا۔ رکشہ ایک بھدی آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوا اور ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر دوڑنے لگا۔

باپ اب بھی کسی سوچ میں گم تھا۔ خرم خضرا کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا اور جیسے اپنے آنسو

ضبط کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے ہونٹ بار بار ٹیڑھے ہو جاتے تھے۔ خضرا خوف، غم اور نا امیدی میں گھری بیٹھی تھی۔ وہ ناوان بچی نہیں تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کس المیے سے گزر آئی ہے۔ ان کی پناہ گاہ، ان کی عافیت کا گہوارہ، محبتوں کا مرکز، ان کا گھر ٹوٹ گیا تھا، محبتیں بٹ گئی تھیں، بچھڑ گئی تھیں۔ ماں کہیں بہت دور پیچھے رہ گئی تھی۔

باپ جو بالکل ان کے قریب بیٹھا ہوا تھا، محبت اور اپنائیت سے تہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ بالکل اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی اپنی ملکیت کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اس کے چہرے کا کوئی نقش بھی پہچانا ہوا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

خوف نے خضرا کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ شعور کی اس منزل پر نہیں تھی کہ کچھ سمجھ سکتی کہ یہ سب کیوں ہوا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ یہ رواں دواں رکشہ انہیں کہاں لئے جاتا ہے۔ پیچھے گھر میں اکیلی رہ جانے والی ماں کیا کر رہی ہو گی؟ شاید وہ ان کا پیچھا کرے گی۔ ہوسکتا ہے جب ان کا رکشہ کہیں رکے گا تو اچانک کسی ٹیکسی، کسی رکشے، کسی تانگے میں سے ماں بھی باہر نکل آئے گی اور انہیں گھر لے جائے گی۔ اس خوش آئند خیال نے جیسے اسے ڈھارس سی دے دی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا، یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اگر ماں انہیں واپس لے جانے کے لئے کہے تو کیا وہ مان جائے گا؟

مگر اسے فوراً ہی نگاہ جھکا لینی پڑی۔ باپ کی پیشانی پر ابھی تک تیوریاں پڑی ہوئی تھیں اور اس کے پھڑکتے ہوئے نتھنے اس کے اندر کے غصے کو ظاہر کر رہے تھے۔ خضرا کانپ گئی۔ اس کے ننھے سے دل میں کھلنے والا امید کا نرم و نازک گلاب آپ سے آپ مرجھا گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر ماں انہیں منانے بھی آ جائے تو باپ کبھی نہیں مانے گا وہ ماں کو اسی طرح دھکا دے کر راستے سے ہٹا دے گا جس طرح اس نے گھر میں اسے اتنی بری طرح دھکیلا تھا کہ وہ دور پلنگ پر جا پڑی تھی۔

اس خوش آئند امید کے یاس کے رنگوں میں ڈھل جانے نے خضرا کو پھر پژمردہ کر دیا۔ آنے والے وقت میں چھپے ہوئے اندیشے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنانے لگے۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے خرم نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شاید وہ ڈر رہا تھا۔ خضرا نے

اس کی طرف دیکھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ زرد ہو رہا تھا، اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ خضرا کے اندر کی ممتا بیدار ہو گئی۔ وہ ایک لمحے میں ہی اپنی عمر سے کہیں بڑی ہو گئی۔ اسے اپنے سے دو تین سال چھوٹے خرم پر بالکل ماں کی طرح سے پیار آیا۔ اس نے بڑے لگاؤ کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور ہولے ہولے اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنے ہاتھ سے یوں سہلانے لگی جیسے اسے تسلی دے رہی ہو۔ خرم سیٹ پر اس کی جانب کھسک کر بالکل اس کے ساتھ لگ گیا۔ باپ نے گردن گھما کر دونوں کی جانب دیکھا اور پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

''باؤ جی کس طرف مڑنا ہے؟'' رکشے والے نے بیک ویو مرر میں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دائیں طرف اندر کو۔'' باپ نے چونک کر کہا اور خود ہی دائیں طرف کا اشارہ دے دیا۔ رکشہ دائیں طرف مڑ گیا۔ تنگ تنگ سی سڑکیں اور دونوں جانب خوانچہ فروشوں کی چھابڑیاں نظر آنے لگیں۔ دو رویہ دکانوں پر بنے ہوئے چوبارے اور اندرون شہر کی خاص آوازیں اور زبان سنائی دینے لگی۔ خضرا اس طرف کبھی نہیں آئی تھی اس لئے اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ باپ انہیں کہاں لے جا رہا ہے۔ وہ ماموں، خالہ اور پھوپھو ایسے رشتوں سے نا آشنا تھی۔ اس کا گھر جیسے ایک جزیرہ تھا جو اردگرد کی دنیا سے کٹا ہوا تھا۔

باپ کے اشاروں پر رکشہ کبھی دائیں مڑ جاتا اور کبھی بائیں۔ پھر رکشے والے نے رفتار مدھم کی اور گردن گھما کر بولا۔

''باؤ جی آگے راستہ خراب ہے۔ گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔''

''تم چلو تو سہی۔'' باپ نے اکھڑ پنے سے کہا۔

''نہیں جی، آگے تو ساری گلی کھدی پڑی ہے۔'' رکشے والے نے رکشہ روک دیا۔ باپ بڑبڑاتا ہوا رکشے سے باہر نکلا اور ناگواری سے رکشے والے کو کرایہ ادا کیا۔ پھر اس نے جھک کر رکشے کے اندر دبکے ہوئے خرم اور خضرا کی طرف دیکھا اور اپنا لمبا بازو بڑھایا اور ان دونوں کو باری باری رکشے سے باہر نکال لیا۔ دونوں ہاتھوں میں ان کے بازو پکڑے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گلی میں مڑ گیا۔

ساری گلی کھدی پڑی تھی۔ اس کے دونوں جانب مٹی کے اونچے نیچے بے ترتیب ڈھیر

پڑے ہوئے تھے جن سے راستہ چلنا دشوار ہوگیا تھا۔ وہ دونوں گرتے پڑتے کنکروں پتھروں سے بچتے بچاتے باپ کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گلی چھوٹی اور غلیظ تھی۔ دونوں طرف کی نالیاں گندگی سے بھری ہوئی تھیں۔ اوپر نالے ٹپک رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر باپ نے کھدا ہوا نالہ پھلانگ کر عبور کیا۔ پھر ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر باری باری انہیں پار اتارا اور ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ایک مکان میں داخل ہوگیا۔

سیلی ہوئی ڈیوڑھی میں تاریکی اور ایک عجیب طرح کی بدبو پھیلی ہوئی تھیں۔ سورج کی روشنی سے چندھیائی ہوئی ان کی آنکھیں اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں ہو رہی تھیں۔ باپ نے ڈیوڑھی کے اختتامی دروازے پر دستک دی اور کواڑ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میلے سے پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے ایک تکونا صحن تھا۔ باپ نے صحن میں سے آواز دی۔

''مہر النساء بیگم! میں اندر آجاؤں؟''

اس کی آواز کے جواب میں کسی نے کہا۔ ''مختار...... اندر آجاؤ۔''

سرکنڈوں کی چلمن اٹھا کر باپ اندر داخل ہوگیا۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور تھے۔ کمرے میں ایک پرانے طرز کا ایک بڑا سا پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر ایک پختہ عمر عورت بیٹھی کڑھائی کر رہی تھی۔

''آؤ مختار...... سناؤ، کیسے ہو؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کڑھائی کے فریم پر سوئی اٹکا کر کہا پھر اس کی نگاہ اس کے ساتھ لگے ہوئے بچوں پر پڑی تو وہ مسکرائی۔

''ارے واہ...... آج تو خضرا اور خرم بھی تمہارے ساتھ ہیں...... کیا بات ہے...... خیریت تو ہے؟''

خضرا کو حیرت سی ہوئی۔ وہ تو اس عورت کو پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی لیکن وہ اس سے خوب اچھی طرح واقف معلوم ہوتی تھی۔

''آجاؤ بچو...... یہاں آجاؤ میرے پاس۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر انہیں قریب بلانا چاہا۔ اس کا چہرہ عام پختہ عمر عورتوں کا سا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں نرمی اور لگاؤ تھا جس نے خضرا کا خوف قدرے کم کر دیا۔ مگر خرم اسی طرح سہما سہما باپ کے ساتھ چمٹا رہا۔ باپ نے خرم کا بازو پکڑ کر اسے آگے بڑھایا۔

''جاؤ آنٹی کے پاس۔''

خرم روہانسا ہوگیا۔ لیکن باپ کے دھکیل دینے سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پلنگ کے نزدیک پہنچ گیا جہاں آنٹی بیٹھی تھی۔ آنٹی نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا۔

''آجا بیٹی تو بھی۔'' اس نے خضرا سے کہا۔

وہ قریب آئی تو آنٹی نے اسے دوسری طرف بٹھا لیا اور دونوں کو پیار کرتی ہوئی بولی۔

''مختار! تمہارے بچے بہت پیارے ہیں۔''

''پیارے ہیں تو تم انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔'' باپ نے برجستہ کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ بولی۔ ''ان کی ماں سے کوئی جھگڑا ہوا ہے تیرا؟''

''اس کا نام نہ لو میرے سامنے۔'' باپ نے منہ ہی منہ میں ایک موٹی سی گالی بکی۔

''میں اس کے ساتھ آج مک مکا کر آیا ہوں۔ آوارہ، بدچلن، حرافہ نہ ہو تو کہیں کی۔''

''بس کرو بھئی۔ وہ تمہاری کچھ نہیں لگتی لیکن بچوں کی تو ماں ہے نا۔'' آنٹی نے ان دونوں کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ خضرا کو اپنی اپنی سی لگی۔

''وہ ماں نہیں ڈائن ہے۔ چھل پیری، چڑیل۔ میں اپنے بچوں پر اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔'' باپ نے دانت کچکچا کر کہا۔

''اچھا اچھا...... زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ اس وقت تو تم بہت غصے میں ہو۔ ذرا تمہارا پارہ اتر لے تو پھر بات کرنا۔'' آنٹی نے بات سمیٹنے کو کہا اور ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''بچوں بے چاروں نے کچھ کھایا بھی ہے یا انہیں یونہی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے ہو۔ تم دونوں اپنے جھگڑوں میں بچوں کو مفت میں خوار کر رہے ہو۔''

ہمدردی کے ان لفظوں نے خضرا کی آنکھوں کو آنسوؤں سے نم کر دیا۔

''ہاں۔ انہوں نے ناشتہ نہیں کیا۔ ٹھہرو میں ابھی کچھ لے آتا ہوں بازار سے۔'' باپ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں، تم رہنے دو...... گھر میں ہے سب کچھ۔'' آنٹی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ سے اٹھی اور باپ کے قریب سے گزرتی ہوئی بولی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہوگا۔''

"اتنا کنگال بھی نہ سمجھو مجھے۔" باپ نے قدرے خوش دلی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مڑے تڑے میلے میلے کرنسی نوٹوں سے مٹھی بھر کر اس کے سامنے پھیلا دی۔

"واہ!" آنٹی نے ابرو اچکا کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "تم نے اگر یہ پیسے زرینہ کو دے دیئے ہوتے تو تمہارا اس سے جھگڑا نہ ہوتا۔"

"وہ جھگڑا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسے روپے نہیں، کچھ اور چاہئے۔" باپ نے نفرت سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا...... بس جانے دو۔ بچوں کے سامنے غلط سلط باتیں نہ کرو۔" آنٹی نے ٹوکا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

خضرا اور خرم وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ باپ نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ آنٹی تھوڑی ہی دیر بعد کمرے میں واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کی سینی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا سا اسٹول گھسیٹ کر وہ سینی اس پر رکھ دی۔ خضرا اور خرم نے دزدیدہ نگاہوں سے سینی کی طرف دیکھا۔ اب انہیں بھی محسوس ہو گیا تھا کہ ان کا پیٹ خالی ہے۔ پیتل کی سینی میں دو پیالے دودھ اور ایک تھالی میں کچھ باقر خانیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آنٹی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور باپ سے بولی۔

"مختار! میں نے تمہارے لئے چائے کا پانی رکھ دیا ہے۔ جا کر چائے بنا لو۔"

وہ کچھ کسلمندی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ آنٹی دودھ کے پیالے میں باقر خانیاں توڑ توڑ کر ڈالنے لگی۔ پھر اس نے پیالے میں چمچہ رکھا اور پیار سے خرم کے ہاتھ میں تھما دیا اور چمکار کر بولی۔

"لو شاباش...... کھاؤ۔ تم صبح سے بھوکے ہو۔ شرمانا بالکل نہیں۔ سمجھے؟"

خرم کھانے پینے کا شوقین تھا۔ اس وقت تو وہ صبح سے بھوکا تھا۔ اس نے بغیر کسی جھجک کے پیالہ آنٹی کے ہاتھ سے لے لیا تو وہ خضرا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"لو شاباش...... تم بھی کھاؤ......" آنٹی نے پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔

خضرا دودھ میں بھیگی ہوئی باقر خانیاں شوق سے نہیں کھاتی تھی لیکن، اس وقت وہ انکار نہ کر سکی...... مجبوراً پیالہ ہاتھ میں لے کر دودھ اور باقر خانی کے چورے سے بنے ہوئے آمیزے کو حلق سے اتارنے لگی لیکن یہ کام خاصا مشکل تھا۔ اسے ابھی تک ماں کا خیال آ

رہا تھا۔ باپ کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انہیں ہمیشہ کے لئے ماں کی محبت سے محروم کر دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ شاید انہیں آنٹی کے پاس اس بدبودار گلی اور تنگ سے مکان میں رہنا پڑے گا اور یہ خیال بار بار اس کی آنکھوں میں نمی بھر رہا تھا اور اسے دودھ اور باقر خانی کا ملغوبہ نگلنا دشوار ہو جاتا تھا۔

"لو بھئی، میں چائے لے آیا۔" باپ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی دو پیالیاں تھیں۔

"تم نے اپنے لئے ہی بنائی تھی۔ میں تو ابھی پی کر فارغ ہوئی ہوں۔" آنٹی کے انداز میں بے نیازی تھی۔

"پانی تو تم نے دو پیالیوں کا رکھا ہوا تھا۔" باپ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہارے لئے ہی رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم جو اتنا بڑا معرکہ سر کر کے آئے ہو تو دو پیالیاں تو اور پیو گے۔" آنٹی نے ہنس کر کہا۔

"ظاہر ہے...... تم نہیں پیو گی تو پھر مجھے ہی پینی پڑے گی۔" باپ نے ہاتھ بڑھا کر سینی میں سے ایک باقر خانی اٹھائی اور کھانے لگا۔ خضرا اور خرم دونوں سہمے ہوئے اپنا اپنا پیالہ خالی کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ تب تک باپ نے چائے کی دونوں پیالیاں ختم کر لیں۔ سینی میں بچی ہوئی باقر خانیاں ایک ایک کر کے کھا لیں۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا، دو تین گہرے کش لئے اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا مہر النساء! تم ان دونوں کو کچھ دن اپنے پاس رکھو۔ ذرا خیال شیال رکھنا، ان کی ماں پرلے درجے کی پھاپھا کٹنی ہے، آسمان پر تاک لگاتی ہے۔ دیکھنا کہیں دھوکے سے انہیں پار ہی نہ کر لے۔"

"ویسے مختار! میری مانو تو بچوں کو ماں سے نہ چھڑاؤ۔ تم سیلانی آدمی ہو، ان کو کہاں لئے لئے پھرو گے؟" آنٹی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا مہر النساء؟" وہ برافروختہ ہو کر پلٹا۔ "تم انہیں نہیں رکھ سکتیں تو صاف صاف کہو ناں۔ میں ابھی انہیں کہیں اور لے جاتا ہوں۔" وہ ان دونوں کی طرف یوں بڑھا جیسے ابھی انہیں اپنے ہمراہ گھسیٹتا ہوا لے جائے گا۔ خضرا اور خرم دونوں ہی دبک گئے۔ انہوں نے سہم کر اپنی گردنیں شانوں میں گھسا لیں۔

"فضول میں بکواس نہ کرو۔" مہر النساء نے بازو پھیلا کر خضرا اور خرم کو جیسے اپنی پناہ میں لے لیا ہو۔ "میں صرف تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ اگر تم نے گھر بسایا ہے تو اسے بسا رہنے دو۔ اسے اجاڑنے کا چارہ نہ کرو مختار۔ ان ننھی روحوں کے لئے، ان معصوم فرشتوں کے لئے گھر کو گھر بناؤ۔"

"میں پاگل نہیں ہوں، سمجھیں تم؟ سکھ، آرام مجھے کاٹنے کو نہیں دوڑتا۔ میں ان بچوں کے لئے ہی اس گھر کو چھوڑ آیا ہوں۔ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ یہ اپنی ماں کے سائے سے بھی دور رہیں۔" وہ چڑچڑے پن سے بولا۔ "ہاں اگر......"

"اچھا...... اپنی اس بک بک سے بچوں کو اور پریشان نہ کرو۔ وہ پہلے ہی گھبرائے ہوئے ہیں۔ ابھی تم جاؤ۔ خلاصی کرو۔ میں پھر تم سے بات کروں گی۔" آنٹی نے باپ کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے...... میں بھی پھر تم سے بات کروں گا۔" باپ نے چلتے چلتے کہا۔ "مگر دھیان سے رہنا، ان کا خیال رکھنا، ہوشیاری سے۔" اس نے تاکیداً کہا اور خضرا اور خرم سے کوئی بات کئے بغیر بانس کی تیلیوں کی چلمن اٹھا کر کمرے سے باہر صحن میں نکل گیا۔

✿......✿

آنٹی زیادہ وقت سلائی کڑھائی میں مصروف رہتی۔ کشیدہ کاری کا فریم ہاتھ میں لئے وہ بڑے ہی نفیس گل بوٹے کاڑھتی رہتی۔ درمیان میں کھانا پکانے، ہنڈیا دیکھنے اور ایسے ہی کسی کام کے لئے اٹھتی اور پھر وہیں آ کر اپنے کام میں لگ جاتی۔ وہ باتیں کم کرتی تھی۔ زیادہ تر اس کا دھیان اپنے ہی کام میں لگا رہتا تھا۔ خضرا اور خرم کچھ دیر وہیں دبکے ہوئے بیٹھے رہے، پھر آنٹی نے ان کی طرف دیکھا اور محبت سے بولی۔

"ارے بچو! تم اس طرح بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ بھلا بچے بھی یوں کبھی چپ چاپ بیٹھتے ہیں؟ چلو اٹھو، کھیلو کودو۔ ہاں خضرا تم جا کر بھائی کا منہ ہاتھ دھلاؤ، بال بناؤ۔ اور دیکھو باہر گلی میں نہ جانا۔ اچھا شاباش......!

وہ دونوں میکانکی انداز میں اٹھے اور ڈر ڈر کر قدم رکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ صحن میں بھری ہوئی چمکیلی دھوپ نے ان کی آنکھیں چندھیا کر رکھ دیں۔ خضرا نے خرم کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں پانی کے نل کے پاس بیٹھ گئے۔

خرم نے گھٹنوں میں سر جھکا لیا اور چپکے چپکے رونے لگا۔ ہچکیوں کے زور سے اس کے ہلتے ہوئے شانوں کو دیکھ کر خضرا کا بھرا ہوا دل بھی چھلکنے لگا۔ آج کا دن کتنا خوفناک اور ظالم تھا جس نے انہیں گھر کی پناہ گاہ سے نکال کر ساری محبتوں سے، تمام آشنا چہروں سے محروم کر دیا تھا، جس نے ماں کی آغوش کی ٹھنڈک چھین کر انہیں کڑی دھوپ کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو قطرہ قطرہ اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ خرم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپی! امی یاد آ رہی ہیں۔"

خضرا نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ وہ خرم کی بڑی بہن تھی اور اس کے ننھے سے دل کا خیال رکھنا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ لئے اور خرم کے بال سنوارتے ہوئے پیار سے بولی۔

"خرم! تم گھبراؤ نہیں۔ ابو آئیں گے ناں تو میں ان سے کہوں گی کہ ہمیں گھر واپس لے جائیں امی کے پاس۔"

"نہیں...... وہ تمہاری بات نہیں مانیں گے آپی!" خرم ایک مرتبہ پھر رو پڑا۔

"مانیں گے کیوں نہیں...... مانیں گے، ضرور مانیں گے۔" خضرا نے اپنے انداز میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ وہ بھی یہ جانتی تھی کہ وہ باپ سے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکے گی۔ لیکن وہ پھر بھی خرم کے دکھ میں کمی کرنا چاہتی تھی۔

اس نے خرم کا منہ دھلایا، اس کے بال بنائے اور دونوں رات کا انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے باپ کو ہمیشہ رات کے وقت ہی گھر میں دیکھا تھا اس لئے ان کا یہی اندازہ تھا کہ جب اندھیرا چاروں طرف اترے گا تو باپ بھی ضرور یہاں آئے گا اور وہ اس سے گھر چلنے کی ضد کریں گے۔

سورج ڈھلا اور اپنے ساتھ دھوپ کی چمکیلی بساط بھی اٹھا کر لے گیا۔ دن کا رنگ ملگجا ہوا اور سارے صحن میں شام کا دھندلکا پھیل گیا۔ خرم اور خضرا دونوں صحن میں نکل آئے۔ ان کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ دونوں ہلکی سی آہٹ پر بھی چونک جاتے تھے۔ آس بندھ گئی تھی اور انہیں جیسے یقین سا ہو چلا تھا کہ اندھیرا گہرا ہوتے ہی باپ کی صورت نظر آئے گی۔

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے صحن میں بے مقصد چکر لگاتے رہے۔ ایک کونے میں رکھے ہوئے گملوں میں لگے پودوں کو چھو چھو کر دیکھتے رہے۔ اونچے اونچے مکانوں اور چوباروں کے بیچ دکھائی دیتے ہوئے آسمان کے چھوٹے سے ٹکڑے کو تکتے رہے۔ پھر کمرے کی چک اٹھا کر آنٹی نے باہر جھانکا۔

''بچو! اندر کمرے میں آ جاؤ۔ اندھیرے میں یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ دونوں چونک گئے اور انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ صحن میں اتنی تاریکی چھا گئی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو صاف طور پر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ڈیوڑھی کے آخری سرے پر دروازہ بند تھا، اس کے پار کوئی آہٹ نہیں تھی۔ دونوں کے دل میں سرد کر دینے والے اندیشے نے کروٹ لی۔ نہ جانے باپ آئے گا بھی یا نہیں......

''بچو! اندر آ جاؤ۔'' آنٹی کی آواز پھر سنائی دی اور اس نے بٹن دبا کر صحن میں ایک میلا سا بلب روشن کر دیا۔ خضرا اور خرم مردہ قدموں سے اندر آئے اور خضرا نے پہلی بار آنٹی کو مخاطب کیا۔

''آنٹی! ابو کب آئیں گے؟''

آنٹی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی تھی۔

''خضرا بیٹی! اتنی پریشان نہ ہو۔ آ جائیں گے تمہارے ابو۔ گھر میں کس وقت آتے ہیں؟''

''گھر میں بھی بہت رات کو آتے ہیں۔'' خضرا نے معصومیت سے جواب دیا۔

''تم لوگ کھانا وغیرہ کھا کر آرام کرو۔ جب تمہارے ابو آئیں گے تو میں تمہیں جگا دوں گی۔'' آنٹی نے نرمی سے کہا۔

وہ دونوں کھانا کھا کر لیٹے اور بہت دیر تک کھلی آنکھوں کے ساتھ چھت کی کڑیوں کو گھورتے رہے پھر نیند نے خرم کی آنکھوں کو بوجھل بنایا۔ اس کی پلکیں بند ہوئیں اور وہ ایک بے چین نیند میں کھو گیا لیکن خضرا بہت دیر تک عجیب عجیب سوچوں اور صورتوں میں گھری رہی۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی آوازیں اس کی سماعت میں اترتی رہیں۔ خرم کو سوتے پا کر اس نے آنکھوں میں بھر جانے والے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔ اس کا تکیہ بھیگتا رہا اور وہ بازوؤں میں چہرہ چھپائے سوتی جاگتی رہی۔

اگلی صبح بھی ویسی ہی ویران اور اجنبی تھی۔ وہ دونوں گھر میں اس طرح اکیلے تھے جس طرح رات کو سوئے تھے۔ خالی خالی گھر میں دن کی روشنی میں بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ایک نامانوس سی وحشت ناک خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ آنٹی نے انہیں ناشتہ وغیرہ کروا دیا اور خود اپنے روزمرہ معمولات نمٹا کر پھر کشیدہ کاری کرنے میں محو ہو گئی۔

یہ گھر ایک چھوٹے سے صحن، باورچی خانے اور مستطیل کمرے پر مشتمل تھا جس میں آنٹی بڑے پلنگ پر بیٹھی کشیدہ کاری کرتی رہتی تھی۔ وہ کوئی اتنا لمبا چوڑا گھر نہیں تھا کہ وہاں کوئی شخص نظروں سے اوجھل رہ سکتا لیکن پھر بھی خضرا اور خرم چھوٹے سے صحن اور باورچی خانے میں باپ کو ڈھونڈتے رہے مگر وہ کہیں نہیں تھا۔

خضرا نے ڈرتے ڈرتے آنٹی سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ صبح صبح ہی گھر سے نکل گیا ہے۔ لیکن یہ سن کر اس کا ننھا سا دل بیٹھ گیا کہ وہ رات آیا ہی نہیں...... خضرا پریشان ہو گئی۔ خرم رو پڑا۔ آنٹی نے ہاتھ سے کڑھائی کا فریم رکھا اور خرم کو بازوؤں میں لے کر پیار کرنے لگی۔

''نہ بیٹے...... اچھے بچے تو نہیں روتے۔ تمہارے ابو آ جائیں گے۔ تم بالکل مت گھبراؤ۔''

خضرا بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پیتی رہی۔ آنٹی نے پچکار پچکار کر خرم کو خاموش کروایا اور انہیں کچھ الجھے ہوئے ریشمی دھاگے دے دیئے تاکہ وہ ان کے الجھاوے دور کر کے رنگ علیحدہ علیحدہ کر دیں۔ وہ دونوں وہیں فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے اور بے طرح الجھے ہوئے ریشمی دھاگوں کو سلجھانے میں مصروف ہو گئے۔ وقت لمحہ لمحہ آگے بڑھتا رہا اور وہ الجھے ہوئے دھاگوں کی ڈور سلجھانے میں لگے رہے۔

دن اور رات آگے پیچھے آتے جاتے رہے۔ ان کے کپڑے میلے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں اور وہ ایک سوال پوچھ پوچھ کر اکتا گئے لیکن باپ نہیں آیا۔ آنٹی نے کسی محلے دار عورت سے کچھ پرانے کپڑے انہیں پہننے کے لئے منگوا دیئے جو انہیں ٹھیک طرح پورے بھی نہیں آئے تھے لیکن انہیں پہنے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ باپ نے چلتے وقت غصے میں ان کے کپڑے بھی ساتھ نہیں لئے تھے۔ ایک جوڑا کپڑوں میں اتنے بہت سے دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

آنٹی ہر روز باپ کو اس کی غفلت اور لاپرواہی پر کوستی، انہیں بہلاتی اور ہر روز ایک ہی بات کہہ کر تسلی دیتی کہ اسے باپ کا ایک ٹھکانہ معلوم ہے، وہ بہت جلد وہاں جا کر اسے کان سے پکڑ کر لے آئے گی۔ لیکن اس کا یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوا۔ خضرا اور خرم انہی شب و روز کے عادی ہو گئے۔ انہیں اجاڑ دنوں اور خوف زدہ کر دینے والی راتوں میں رہنے کی عادت سی ہو گئی۔ انہیں از خود جیسے اندازہ ہو گیا کہ انہیں ماں اور باپ کے بغیر اپنے گھر سے دور اجنبی ماحول میں زندگی گزارنی ہے۔ محلے کی کچھ ہم عمر لڑکیوں سے خضرا کی جان پہچان ہو گئی تھی وہ آنٹی کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی تھی یا اس کے پاس بیٹھی اس کی سوئی کی کرشمہ سازیاں دیکھتی رہتی جس پر آنٹی مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی۔ ''کیوں خضرا، تم بھی سگھڑ بیٹیوں کی طرح کڑھائی سیکھو گی؟''

خضرا جواب میں کچھ بھی نہ کہتی۔ بس ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی رہتی۔

اب وہ دونوں صبح و شام گلی کی نکڑ پر لگے ہوئے کمیٹی کے نل میں پانی بھرنے جانے لگے۔ انہیں کبھی اس کا تجربہ نہیں تھا۔ پہلے پہل وہ بالٹیوں، ڈولوں اور ڈبوں کی لمبی قطار اور دھکے دیتے، جھگڑا کرتے بچوں کو دیکھ کر پریشان ہوتے اور دبک کر ایک جانب کھڑے ہو جاتے لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے بھی سیکھ لیا کہ پانی کس طرح بھرا جاتا ہے۔ اپنی باری پر کس طرح اصرار کیا جاتا ہے اور کسی دوسرے کی زیادتی دیکھ کر کس طرح شور مچایا جاتا ہے۔ خضرا تو زیادہ تر خاموش رہتی لیکن خرم دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر خوب دھما چوکڑی مچاتا۔

ایک روز وہ دونوں بالٹیوں کی لمبی قطار کے پاس اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہولے سے خضرا کے بالوں کو چھوا۔ وہ چونک کر پلٹی اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''تم خضرا ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

خضرا نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کرے یا اقرار۔ وہ یونہی سہمی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''یہ تمہارا بھائی خرم ہے؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔ خرم نے اپنا نام سن کر اس عورت کی جانب دیکھا جس سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہی خرم ہے۔ اس نے خضرا کا بازو پکڑ لیا۔

''ذرا میرے ساتھ آؤ۔''

خرم اس کی آواز سن کر قریب آ گیا اور قدرے اکھڑ پن سے بولا۔

''چھوڑو میری بہن کو۔''

خرم کی اس جرأت آمیز بدتمیزی پر وہ خفا ہونے کی بجائے ہنسنے لگی اور اس کا رخسار تھپتھپا کر بولی۔

''ارے تم کتنے پیارے بچے ہو۔ آؤ تم بھی۔ دونوں میرے ساتھ آؤ......''

''نہیں......ہم نہیں جاتے۔'' خرم دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور خضرا سے بولا۔ ''چلو آپی گھر چلیں۔''

وہ عورت اس کے جارحانہ انداز پر مسکرائی اور خضرا کے قریب ہو کر قدرے رازداری سے بولی۔

''تمہاری امی میرے گھر بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر اس سے ملنا ہے تو میرے ساتھ آؤ۔''

خضرا ہونق سی بنی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے یہ لفظ کئی صدیوں بعد سنا ہے۔ یہ بھولا ہوا رشتہ برسوں بعد اس کی یادوں میں اترا ہے۔ گزرے ہوئے وقت کے سارے لمحے اس کے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا ننھا سا دل پھر اسی چھاؤں کے لئے مچلنے لگا جو اس سے زبردستی چھین لی گئی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں......تمہاری ماں میرے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تم تھوڑی دیر آ کر اس سے مل لو۔ اور کسی کو بتانا نہیں۔'' اسے ساکت کھڑا دیکھ کر اس عورت نے پھر آہستگی سے کہا تو خضرا ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

اس عورت نے ابرو سے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ متذبذب سی ہو گئی۔ حالات نے اسے اتنا سہما دیا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ وہ اس کی بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔

''چلو آؤ ناں...... ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔ لائن لمبی ہے۔'' اس نے ڈول اور بالٹیوں کی لمبی قطار کی طرف اشارہ کیا جس میں ان کی بالٹی بہت پیچھے تھی۔

خضرا اپنے دل کا اصرار نظر انداز نہ کر سکی۔ اس نے چلنے پر آمادگی ظاہر کرنے کی خاطر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور خرم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ باپ اور ماں کے بعد بھائی سے نہیں بچھڑنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اس رشتے کو بچا کر رکھنا چاہتی تھی۔ ماں کی طلب میں وہ

اس عورت کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی تھی۔ لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ماں سے مل بھی سکے گی یا نہیں۔ اسی لئے اس نے خرم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہیں اس بے یقینی میں خرم ہی اس سے نہ بچھڑ جائے۔

خرم اس سے پوچھتا رہا کہ وہ اسے کہاں لئے جاتی ہے لیکن وہ خاموشی سے اس عورت کے پیچھے چلتی گئی۔ ایک غلیظ سی گلی کا موڑ مڑنے کے بعد وہ بوسیدہ مکانوں کی قطار میں سے ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ خضرا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے مضبوطی سے خرم کا ہاتھ تھام لیا اور ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ اس مکان کی ڈیوڑھی بھی آنٹی کے گھر کی طرح سیلن زدہ اور نیم تاریک تھی۔ چھوٹے سے صحن سے ہوتے ہوئے وہ جھجک کر ابھی دہلیز پر ہی کھڑے تھے کہ ایک کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ یوں جیسے کوئی اندر سے چوری چوری جھانک رہا ہو۔ پھر اس کے پٹ چوپٹ کھل گئے۔

خضرا اور خرم کی روح آنکھوں میں سمٹ آئی۔ وہ حیرت سے بت بنے ٹکر ٹکر دیکھنے لگے۔ اپنے بیتاب بازو کھولے ماں ان کی طرف دوڑی اور اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں سمٹے ہوئے تھے اور اس کے ترسے ہوئے ہونٹ دیوانہ وار انہیں چوم رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے ان کے رخسار بھیگ رہے تھے۔ اس نے انہیں یوں سمیٹ رکھا تھا جیسے اب کبھی جدا نہیں ہونے دے گی۔ خرم تو گھبرا کر رونے لگا تھا لیکن خضرا پر ایک بے حسی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور جذبات کچھ گڈمڈ سے لگ رہے تھے۔ نہ شوخی کا احساس تھا نہ غم کا۔ ایک حیرت اور بے یقینی سی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

ماں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور کبھی خضرا کا چہرہ دیکھنے لگی اور کبھی خرم کا۔ وہ کبھی ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی، کبھی بال سنوارتی اور کبھی چہرہ چھو کر دیکھتی۔ پھر رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میرے بچوں کے کتنے ذرا ذرا سے منہ نکل آئے ہیں۔ یہاں اس نے تمہیں کس ڈائن کے پاس رکھا ہوا ہے؟"

خضرا اور خرم دونوں ہی خاموش رہے۔

"مارتی پیٹتی تو نہیں...... تم سے زیادہ کام تو نہیں کرواتی؟...... کھانا تو پیٹ بھر کر دیتی

ہے؟...... تمہارا باپ کس وقت اس کے پاس آتا ہے؟" ا نے ڈھیروں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اس کے کچھ سوالوں کے جواب خضرا نے دیئے، کچھ کے خرم نے تو اسے قدرے اطمینان ہوا اور وہ حیرت سے بولی۔

"اچھا...... تو تمہارا باپ اس روز سے نہیں آیا......؟"

خضرا نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ وہ عورت قریب آئی اور ماں کو مخاطب کر کے بولی۔

"زرینہ! بس اب انہیں جانے دو۔ دونوں کو کافی دیر ہو گئی ہے۔ کہیں آنٹی کو شک نہ ہو جائے۔ کیا پتہ کسی نے انہیں میرے ساتھ ہی دیکھ لیا ہو۔"

"مجھے انہیں جی بھر کر دیکھ تو لینے دو......" ماں ایک سرد آہ بھر کر اور حسرت سے ان کے گال چھو کر بولی۔ "میں کل پھر آؤں گی، اسی وقت۔ یہ خالہ گلزار تمہیں بتا دے گی۔ تم اسی طرح چوری چھپے آ جانا اچھا، سمجھ آ گئی ناں؟"

انہوں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ خالہ گلزار بول اٹھی۔

"بھئی زرینہ اب انہوں نے گھر دیکھ لیا ہے، انہیں سمجھا دو کہ پرسوں یہ خود ہی آ جائیں۔ مجھے اس محلے میں رہنا ہے، کوئی بات ہو گئی تو اور مصیبت ہو جائے گی۔ پھر انہیں تو پتہ ہی ہے۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور آنکھ و ابرو کے اشارے سے ماں کو باقی بات سمجھانے کی کوشش کی جو شاید اس نے سمجھ لی۔ وہ خضرا کے بال سنوارتی ہوئی بولی۔

"خضرا بیٹی تمہیں خالہ گلزار کے گھر کا راستہ سمجھ میں آ گیا ہے ناں اچھی طرح سے؟"

خضرا کو صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوا تھا لیکن اس نے پھر بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس ٹھیک ہے...... کل جب تم پانی بھرنے آؤ گے تو سب کی نظر بچا کر خالہ گلزار کی طرف آ جانا خرم کو لے کر۔" ماں نے سمجھایا۔

خضرا چپ چاپ یوں اس کی طرف دیکھتی رہی جیسے اس کی بات سمجھ لی ہو۔ ماں نے پھر تاکید کی۔

"اور ہاں، دیکھو کسی کو بالکل کچھ مت بتانا اچھا......؟"

پھر اس نے خرم کو قریب بلایا اور اسے پیار کرتے ہوئے اچھی طرح سے سمجھایا کہ وہ ماں سے ملنے کا تذکرہ کسی سے نہ کرے۔

"چلو زرینہ! اب انہیں جانے دو...... ان کی باری آنے والی ہوگی۔ یہ دونوں نہ ہوئے تو پتہ چل جائے گا۔" خالہ گلزار نے پھر دخل دیا۔

ماں نے ایک مرتبہ پھر ان کی پیشانیوں کو باری باری چوما اور ان کے ساتھ ساتھ چلتی صحن کے دروازے تک آئی۔

خرم کے قدم بوجھل ہو گئے اور اس نے پیچھے مڑ کر رکتے ہوئے بڑی بے چارگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"امی......!" اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے لفظ میں اس کے اندر کی ساری محرومیاں بول اٹھیں۔

خضرا کے گلے میں آنسوؤں کا ایک گولہ سا اٹک گیا۔ وہ بھی اپنی محرومیوں کو اس ایک لفظ میں گھول دینا چاہتی تھی لیکن ایک نامعلوم سے خوف اور جھجک نے اسے روک لیا۔ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھتی رہی مگر اس پر واضح نہ ہو سکا کہ وہ ماں کے پیار سے محروم ہو جانے پر کیوں مجبور ہے؟ اسے اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار کیوں بننا پڑتا ہے؟ اس کا دل اندر ہی اندر کٹنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ چند لمحے اور یہاں رک گئی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو جائیں گی اور وہ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح ماں کے دامن سے لپٹ کر کبھی اس سے جدا ہونے پر تیار نہیں ہوگی۔ اس لئے اس نے جلدی سے خرم کا ہاتھ پکڑا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر دروازے سے باہر نکل آئی۔

✿......✿

اس رات انہیں بستر پر لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ خرم غنودگی میں تھا۔ اس نے صاف طور پر نہیں سنا تھا لیکن خضرا کے روئیں روئیں میں جیسے وہ دستک جاگ اٹھی مگر وہ اسی طرح چپ چاپ پڑی رہی۔ چند لمحوں بعد دستک دوبارہ ہوئی۔ پھر آنٹی کے کچھ بڑبڑانے اور پلنگ کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ آنٹی اپنے بستر سے اٹھی اور اس کے قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف بڑھی...... دروازے کی زنجیر گری اور کوئی اندر آیا...... دروازہ بند ہونے اور زنجیر پڑنے کی صدا آئی اور پھر آنٹی نے کہا۔

"شاباش ہے تم پر مختار...... معصوم بچوں کو چھوڑ کر تم کہاں مر گئے تھے؟ تمہیں ذرا خیال

نہیں آیا کہ بے چارے بچے ماں سے دور ہیں اور تم نے بھی شکل نہیں دکھائی...... کچھ تو احساس کرو۔"

"تمہیں کیا پتہ میں کن پھوڑیوں میں پڑا ہوا ہوں...... یہ دو دن بچے رکھنا بھی تمہیں دو بھر ہو گیا ہے۔" باپ کی اکھڑ آواز صحن میں گونجی۔

خضرا ہمیشہ کی طرح لرز گئیں...... آوازیں، شور اور ہنگامہ جیسے اس کے چاروں طرف پھیل گیا...... ویسے ہی شور میں وہ گلے گلے دھنس گئی جیسا شور باپ کے گھر آنے پر فضا میں چھا جاتا۔ وہ آنکھیں بند کر کے وہیں دبک گئی۔

"بکواس نہ کرو۔ میں بچوں کی وجہ سے کہہ رہی ہوں...... بیچارے بہت پریشان رہتے ہیں...... ان کی یہ عمر تو نہیں ماں باپ سے جدا ہونے کی۔" آنٹی کی آواز قریب آگئی۔

"میں بھی مجبور ہوں۔ اور ان کی ماں اس قابل نہیں کہ یہ اس کی صحبت میں رہیں۔" باپ کی آواز کے زہر سے سارا کمرہ بھر گیا۔ خضرا کا ننھا سا دل خوف میں ڈوب گیا۔

"ماں پھر بھی ماں ہوتی ہے مختار...... تم کچھ سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا۔" آنٹی نے ماں کی حمایت کی تو وہ خضرا کو بہت اچھی لگی۔

"تم چھوڑو اب اس ماں، ماں کی رٹ کو اور مجھے بتاؤ کہ وہ حرافہ یہاں آئی تو نہیں تھی؟" باپ کے لفظوں میں نفرت کھول رہی تھی۔

"اسے کیا پتہ یہاں کا؟" آنٹی نے کہا۔

"اسے کیا نہیں پتہ؟...... میں تمہیں پھر بتا دوں، اس کی طرف سے ہوشیار رہنا...... وہ اپنی قسم کی ایک ہی ہے...... سمجھیں؟" باپ نے اپنی بات پر زور دیا۔

"چلو چھوڑو اس قصے کو...... تم بتاؤ، کوئی کام دھندا تلاش کیا تم نے؟......" آنٹی نے پوچھا۔

"ہاں...... کوشش تو کر رہا ہوں۔" باپ نے گہرا سانس لیا۔

"تمہاری بیٹی سیانی ہو گئی ہے...... بس اب ٹک کر ڈھنگ کا کوئی کام کرو...... یہ آوارہ گردیاں چھوڑ دو......" آنٹی نے نرم لہجے میں کہا۔

"بس شروع ہو گیا تمہارا وعظ...... کوئی دو منٹ سانس تو لے لینے دیا کرو...... ویسے فکر نہ کرو، بچوں کا خرچہ تمہیں ملتا رہے گا۔" اس کا انداز تلخی آمیز تھا۔

"مختار! تُو نے پھر بکواس شروع کی...... میں نے تیرا ہاتھ پکڑ کر تجھے گھر سے باہر نکال دینا ہے اور پھر کبھی یہاں قدم نہیں رکھنے دوں گی...... اللہ نے میرے ہاتھ میں ہنر دیا ہے...... میں بچوں کو کھلا سکتی ہوں۔" آنٹی کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

باپ نے قہقہہ لگایا...... "میں نے کیا قصور کیا ہے...... بچی کبھی مجھے بھی دے دیا کرنا۔"

"نہیں...... میرے پاس تجھ جیسے مسٹنڈوں کے لئے کچھ نہیں ہے۔" آنٹی نے ناراضگی سے کہا۔

"ہائے ہائے...... اپنے تو نصیب ہی ایسے ہیں۔" وہ مزاحیہ پن سے بولا۔

شاید آنٹی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی...... پھر باپ کی آواز سنائی دی۔

"کوئی جگہ مجھے بھی سونے کے لئے مل جائے گی؟ بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔"

"نہیں مختار!...... تم بچوں سے ملو اور جاؤ...... محلے داری کا معاملہ ہے۔" آنٹی نے صاف جواب دے دیا۔

"جیسی تمہاری مرضی......" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "مگر بچے تو سو رہے ہیں۔"

"تو جگا لو ناں ان کو...... بیچارے تمہارے لئے بہت پریشان رہتے ہیں۔" آنٹی نے اصرار کیا۔

خضرا اور سمٹ گئی۔ یہ سوچ کر کہ اب باپ اس کے قریب آ کر اسے جگائے گا وہ ایک ناقابل فہم بے چینی محسوس کرنے لگی۔ باپ کے ساتھ کبھی وہ خاص وابستگی نہیں رہی تھی جو باپ کی شفقت اور محبت آپ سے آپ استوار کر دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک اجنبی اور سخت گیر انسان کی طرح گھر آتا، ماں کے ساتھ گالی گلوچ اور تند و تیز فقروں کا تبادلہ کرتا اور غصے میں گھر کے دروازے اپنے پیچھے دھماکے سے بند کرتا، دن بھر کے لئے غائب ہو جاتا۔ اسی لئےس کی ذات سے محبت کی بجائے ایک خوف وابستہ ہو گیا تھا۔

خضرا کے دل کا چور اسے اندر ہی اندر سہار رہا تھا۔ اگر اس نے ماں کے بارے میں کچھ پوچھ لیا تو وہ اتنی بڑی بات کیسے چھپا سکے گی...... اگر خرم کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو کیا ہوگا...... باپ انہیں اس گھر سے بھی دور لے جائے گا...... جہاں چند لمحوں کے لئے سہی،

ماں سے ملنے کی آس تو تھی۔ خضرا کا ننھا سا ذہن ایسے بے شمار اندیشوں میں گھرا ہوا تھا لیکن وہ خرم کے ساتھ لپٹی ہوئی خود کو گہری نیند میں کھویا ہوا ظاہر کر رہی تھی۔

"گہری نیند میں ہیں...... اب کیا انہیں بے آرام کروں......؟" باپ کی آواز بالکل چارپائی کے قریب سنائی دی۔

"عجیب باپ ہو تم...... لگتا ہے تمہیں بچوں سے بالکل محبت نہیں۔" آنٹی نے کوسا۔

باپ ہنسا۔ "وہ کون باپ ہے جسے اپنے بچوں سے محبت نہیں۔"

"میرا خیال ہے بہت سے ہوں گے اور ان میں سے ایک تم بھی ہو......" آنٹی نے جتلایا۔

"جو دل میں آئے کہو...... میں تمہاری بات کا برا نہیں مانتا......" باپ فراخدلی سے بولا۔

"کیوں......؟" آنٹی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے پتہ ہے کہ تمہیں اس قسم کی باتیں کرنے کی عادت ہے۔" باپ نے جواب دیا۔

آنٹی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کے لئے پھر خاموشی کا وقفہ آیا جسے آنٹی کی آواز نے توڑا۔

"کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں، میں کھا کر آیا ہوں۔" باپ نے جواب دیا۔ پھر اس کے قدموں کی آہٹ چارپائی کے نزدیک آئی۔ "سو رہے ہیں دونوں......؟" جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر آنٹی سے مخاطب ہوا...... "اچھا میں چلتا ہوں مہرالنساء۔"

"تم بچوں کو جگا ہی لیتے۔" آنٹی نے کہا۔

"اب کیا انہیں کچی نیند سے اٹھاؤں۔ تم بس ذرا ان کی ماں کی طرف سے ہوشیار رہنا...... اچھا...... اللہ بیلی۔" باپ کی آواز اس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ پھر صحن کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کا پتہ ملا اور وہ انہیں حالات اور مفارقت کی منجدھار میں چھوڑ کر چلا گیا۔ خضرا کی بھینچی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ اس نے اپنے برابر سوئے ہوئے خرم کے گرد اپنا بازو لپیٹ دیا۔ آنٹی نے کمرے میں آ کر ان کی چادر درست کی، روشنی گل کی اور کمرہ سیاہ سناٹے میں ڈوب گیا۔

اگلی صبح آنٹی نے ناشتہ کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ رات کو باپ آیا تھا۔ خرم نے بیتابی سے آنٹی سے استفسار کیا۔

''کہاں ہیں ابو؟''

''اُسے کام تھا۔ اس لئے وہ رات ہی چلا گیا...... تم لوگ سو رہے تھے، ہم نے جگایا بھی لیکن تم نے تو اٹھنے کا نام نہیں لیا۔'' آنٹی نے ملائمت سے بات بنائی۔

خضرا خاموش رہی...... وہ آنٹی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ رات وہ جاگ رہی تھی۔ خرم کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے...... اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گیا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے چائے کے پیالے کی طرف رخ پھیر کر بیٹھ گیا۔

''ارے خرم...... پگلے، تم اپنا ناشتہ کیوں چھوڑ رہے ہو؟ وہ رات کو پھر آئے گا۔ فکر نہ کرو۔'' آنٹی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا رخ پھر سامنے پڑے ہوئے چائے کے پیالے اور باقر خانیوں کی پلیٹ کی طرف کر دیا۔ خضرا نے محسوس کیا کہ آنٹی اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید یہ اندازہ لگانے کو کہیں وہ بھی تو باپ کے یوں چلے جانے پر پریشان تو نہیں؟ اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی گئی۔ آنٹی نے اسے مخاطب نہیں کیا، اٹھ کر اپنے روزمرہ کے معمولات میں الجھ گئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ان دونوں نے بالٹیاں اٹھائیں اور گھر سے باہر گلی میں آ گئے۔ چند قدم بعد ہی خرم بے صبری سے بولا۔

''خضرا آپی...... آج امی سے ملنے جائیں گے نا......؟''

''چپ رہو...... کوئی سن لے گا۔'' خضرا نے دبی زبان سے اسے ٹوکا۔

لائن میں بالٹیاں پیچھے رکھیں گے۔'' وہ جوش سے بولا۔

''چپ رہو خرم...... چپ رہو...... کسی کے سامنے کوئی بات نہ کر دینا۔'' خضرا نے گھبراہٹ سے کہا۔

بات شاید خرم کی سمجھ میں بھی آ گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں آج روز کی نسبت ڈر ڈر کر قدم رکھ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلی میں موجود ہر متنفس یہ جان گیا ہے کہ

انہیں آج خالہ گلزار کے گھر ماں سے ملنے جانا ہے...... وہ سہمے سہمے سے بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور دوسروں سے نگاہیں چرا لیتے۔ انہوں نے اپنے بچوں سے بھی کوئی بات نہیں کی اور بالٹیوں اور ڈبوں کی لمبی قطار میں اپنی بالٹیاں بھی رکھ دیں۔ بچوں نے نلکے کے گرد گھیرا سا ڈال رکھا تھا اور دوسرے قطار کے اردگرد کھڑے چوکس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ کوئی ان کی باری آگے پیچھے نہ کر دے۔

خضرا کے من میں کھد بدی ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے ہی کانپ رہی تھی کہ اتنی نگاہوں اور اتنی آنکھوں کے سامنے وہ کس طرح خالہ گلزار کے گھر جائے گی جس کا رستہ بھی صحیح طور پر اس کی یادداشت میں محفوظ نہیں تھا۔

خرم بہت پُرجوش تھا۔ وہ ماں سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ بار بار خضرا کا ہاتھ پکڑ کر اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں چلنے کے لئے کہتا تو خضرا پوری جان سے لرز جاتی۔ اس کا ذہن اس ادھیڑ بُن میں بری طرح سے الجھا ہوا تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی نظر بچا کر خالہ گلزار کے گھر تک کس طرح جائیں؟ اگر انہیں اس کے گھر کا رستہ نہ ملا تو؟...... اگر کسی نے آنٹی کو بتا دیا تو؟...... ہزار طرح کے وسوسوں میں وہ اس طرح گھر گئی تھی کہ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے کہ اچانک خرم نے اس کا بازو ہلایا...... وہ ڈر سی گئی...... خرم نے ایک جانب اشارہ کیا...... خضرا کی نگاہ اس کے تعاقب میں گئی...... اس نے دیکھا کہ ایک مکان کے تھڑے پر کھڑی ہوئی خالہ گلزار انہیں اشارے سے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ خرم نے اس کی جانب لپک کر جانا چاہا لیکن خضرا نے اس کا بازو تھام لیا۔

''ٹھہر جاؤ......'' اس نے دبی زبان میں کہا اور کچھ دیر خاموش کھڑی رہی...... پھر ڈرتے ڈرتے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب بچے اپنے آپ میں مگن تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے ہجوم میں سے باہر نکل آئی۔ خالہ گلزار نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور تھڑے سے اتر کر گلی میں گھس گئی۔

خضرا اور خرم نے بھی اپنے قدموں کو تیز کیا اور خالہ گلزار کے قدموں پر قدم رکھتے وہ اس کے تعاقب میں چلتے چلے گئے۔ پھر وہی گندگی سے بھری ہوئی گلی، بوسیدہ مکانوں کی قطار اور سیلی ہوئی ڈیوڑھی نظر آئی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور صحن میں چاروں طرف دیکھنے لگے۔ کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھلا اور ماں تیزی سے باہر نکلی...... اس نے بڑی سی چادر

لپیٹ رکھی تھی۔ اس نے نہ انہیں پیار کیا...... نہ ہی کوئی سوال پوچھا...... دونوں کے بازو پکڑے اور پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا گلزار...... میں جا رہی ہوں۔''

خضرا اور خرم کچھ سمجھ نہیں پائے۔ افراتفری میں ماں انہیں گلی میں سے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ رکشہ اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر بھاگنے لگا۔ ماں نے دونوں کو اپنی چادر کی بغل میں اس طرح چھپالیا جیسے وہ سامان کی گٹھڑیاں ہوں۔

خضرا کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کسی سمت کی کوئی خبر نہیں تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟...... ماں نے بھی کچھ نہیں بتایا تھا وہ جس طرح باپ کے ساتھ گھسٹتے چلے گئے تھے اسی طرح ماں کے ساتھ آنکھیں بند کئے، کھنچتے چلے جا رہے تھے۔ رکشہ رکا اور ماں نے اپنی چادر کی بغل سے انہیں آزاد کیا۔

''چلو آؤ......'' اس نے دونوں کو رکشے سے اترنے میں مدد دی۔

خضرا نے سہمی سہمی سی نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ اس کی جان میں جان آئی۔ اسے حوصلہ سا ہوگیا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دونوں دوڑ کر دروازے پر پہنچے۔ ماں نے دروازہ کھولا اور انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹے اندر چلی آئی۔ اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور ان دونوں سے بولی۔

''خضرا، خرم...... تم دونوں خیال رکھنا، میں بڑی مشکل سے تمہیں لے کر آئی ہوں۔ دیکھنا کہیں تمہارا باپ تمہیں لے نہ جائے۔''

خضرا پریشان سی ہوگئی۔ اس کا ننھا سا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ وہاں باپ کہتا تھا کہ دیکھنا کہیں انہیں ان کی ماں نہ لے جائے اور یہاں ماں پریشان تھی کہ کہیں انہیں باپ نہ لے جائے۔ انہیں تو دونوں کی ضرورت تھی۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح خود کو ماں اور باپ دونوں کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ دونوں انہیں ایک دوسرے کے سائے سے بھی بچانا چاہتے تھے۔

ماں نے چادر اتار کر ایک طرف رکھی اور ان کے لئے کھانا بنانے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ باپ کو بھی کوستی جا رہی تھی۔ کبھی وہ رونے لگتی، کبھی ہنستی اور کبھی غصے سے کھولنے لگتی۔ وہ

باپ کے بارے میں جو کچھ کہہ رہی تھی، اسے سن سن کر انہیں باپ سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ انہیں ایک درندہ اور وحشی معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ سہمے سہمے سے اس کے برابر بیٹھ گئے۔ ماں نے ان کے سامنے کھانا رکھا اور پیار دلار سے ان کے منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالنے لگی۔

خضرا کو ماں کا یہ قرب اور محبت بہت اچھی لگ رہی تھی لیکن کوئی اندر ہی اندر بار بار اسے کچوکے لگاتا تھا کہ یہ خوشی، یہ محبت، ماں کی یہ نرم گرم گود عارضی ہے۔ ابھی باپ کسی عفریت کی طرح انہیں ماں کی آغوش سے جھپٹ کر کہیں دور دراز لے جائے گا۔

خرم ہر بات سے بے پرواہ خوب چہک رہا تھا لیکن وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ ماں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''خضرا...... تُو چپ چپ کیوں ہے؟''

خضرا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے لیکن وہ انہیں پی گئی اور ماں کی بات کے جواب میں بس ہوں ہاں کر کے خاموش ہوگئی۔ ماں نے کھانا کھلا کر دونوں کو نہلایا اور صاف کپڑے پہنائے۔ وہ ساتھ ساتھ بڑبڑا رہی تھی کہ اتنے دنوں میں انہیں ٹھیک طرح سے نہلایا بھی نہیں گیا۔ خضرا کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے وہ بار بار شکایت کر رہی تھی کہ اسے جوئیں پڑ گئی ہیں۔

انہیں نہلانے سے فارغ ہوئی تو وہ کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔ خضرا اور خرم اپنے ہی گھر میں کچھ اجنبی اجنبی سا محسوس کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ بھی ان کا گھر نہیں ہے۔ خرم نے اپنا بستہ اٹھا لیا اور خضرا سارے گھر میں اپنائیت کے نشان تلاش کرنے لگی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں چونک گئے۔ خوفزدہ آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دونوں ماں کی طرف دوڑے۔

''امی...... امی...... کوئی آ گیا۔''

''امی کہیں ابو تو نہیں......'' خضرا کے دل کے اندیشے زبان پر آ گئے۔

''میں ابو کے ساتھ نہیں جاؤں گا......'' خرم نے ماں کی قمیض کا دامن تھامتے ہوئے کہا۔

''ہائے میرے بچوں کو اس ظالم نے کتنا ڈرا دیا ہے۔'' پھر خضرا سے بولی۔ ''خضرا جاؤ

دروازہ کھولو جا کر...... تمہارا باپ نہیں ہے...... وہ اتنی شرافت سے دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا۔"

"پھر کون ہے امی؟......" خضرا ہچکچائی۔

"تم دروازہ تو کھولو ناں جا کر، دیکھو کون ہے؟" ماں نے تاکیداً کہا۔

خضرا ایک ایک سیڑھی سوچ سوچ کر اترتی نیچے آئی اور اس نے ڈرتے ڈرتے زنجیر گرائی، دروازے کے کواڑ کھولے اور کسی نے پٹ کھول کر اندر قدم رکھا۔ خضرا نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ پہچان نہیں پائی۔ نہ جانے وہ کون تھا؟...... اونچا، لمبا اور قدرے بھرا۔ اس کے چہرے پر سیاہ مونچھیں نمایاں تھیں۔ خضرا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے تم خضرا ہو......؟" اس نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ "تمہارا بھائی بھی آیا ہے؟"

خضرا نے جواب نہیں دیا اور جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آ گئی۔ ماں نے کپڑے نچوڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے......" خضرا نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں جواب دیا۔

تب ایک آواز زینے کے اختتام پر سنائی دی۔ "زرینہ گھر پر ہی ہو؟"

ماں نے جلدی سے کرسی پر رکھا ہوا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر لے لیا اور نسبتاً بلند آواز میں بولی۔ "آ جائیں رؤف بھائی۔"

وہ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اوپر آیا اور خوش دلی سے بولا۔ "مبارک ہو زرینہ، بچے آ گئے۔"

"بس آپ کی دعائیں ہیں۔" ماں نے انکساری سے کہا اور ان دونوں سے بولی۔

"انکل کو سلام کرو۔"

خضرا اور خرم دونوں نے سلام کیا تو اس نے محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ بچے آ گئے ہیں ورنہ میں خالی ہاتھ نہ آتا۔"

"مہربانی ہے آپ کی رؤف بھائی!" ماں نے جواب دیا۔ وہ دونوں ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتے رہے۔

"بھئی داد دینی پڑتی ہے تمہاری ہمت کی۔ کیسے لے آئیں تم بچوں کو؟" وہ پوچھنے لگا۔

ماں نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تو وہ بولا۔ "تم لوگوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو

سکتا؟"

"اونہہ...... سمجھوتہ کیا ہونا ہے...... بڑی کوششیں کر کے دیکھ لیں۔ بس اب بچے میرے پاس رہیں گے۔ وہ جائے جہنم میں۔" ماں نے جل کر کہا۔

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "زرینہ بیگم! کیا کہہ رہی ہو اپنے مجازی خدا کو؟"

ماں بھی ہنسی۔ "اسی مجازی خدا کا تو رونا ہے...... خدا اس کو ہدایت دے۔"

رؤف نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ان کی طرف دیکھ کر جیسے بات بدل گیا۔

"یہ بچے بیچارے کتنے سہمے ہوئے ہیں...... بچو، جاؤ کھیلو کودو...... عیش کرو۔ فکر نہ کرو، تمہارا باپ تمہیں نہیں لے جا سکتا۔"

وہ کچھ متذبذب ہوئے تو ماں نے پکارا۔ "جاؤ خضرا، خرم! کھیلو جا کر...... اور ہاں اپنے سکول کی کتابیں ٹھیک ٹھاک کر کے رکھو، تمہارے سکول کا بھی پتہ کرنا ہے، کہیں انہوں نے نام تو نہیں کاٹ دیا۔"

ماں انکل رؤف کے لئے چائے بنانے لگی اور خضرا اور خرم دونوں دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں الماری میں ان کے بستے رکھے رہتے تھے۔

انکل رؤف نے انہیں ایک دوسرے سکول میں داخل کروا دیا۔ ماں انہیں خود سکول چھوڑنے جاتی اور لے کر بھی آتی۔ کبھی کبھی انکل رؤف بھی راستے میں مل جاتے تو وہ دونوں کو اپنے سکوٹر پر بٹھا لیتے۔ ایسے میں خضرا کو بہت ڈر لگتا لیکن خرم کے لئے سکوٹر کی سیر خوشی اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہ انکل رؤف سے مانوس بھی ہو گیا تھا اور کھل کر ہنس بول لیتا تھا لیکن خضرا کو ان سے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ان کے کسی سوال کا جواب بھی اعتماد سے نہیں دے سکتی تھی۔ ان کے روبرو گھبرائی ہوئی اور ڈری ڈری سی رہتی تھی۔

ماں انکل رؤف کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ برے وقت میں ان کا سہارا بہت غنیمت ہے۔ وہ ان کے سو کام کرتے ہیں اس لئے ان کا آنا جانا ضروری ہے۔ باپ کو غائب ہوئے ایک عرصہ ہو چلا تھا۔ ماں کے دل سے اس کا خوف زائل ہو گیا تھا۔ اب وہ ہر وقت انہیں ڈراتی اور ان کے لئے پریشان نہیں ہوتی تھی۔ خرم بازار سے سودا سلف خریدنے بھی چلا جاتا تھا۔ ماں نے قسطوں پر نٹنگ مشین خرید لی تھی اور آرڈر پر سویٹر تیار کرنے لگی تھی۔ اس نے گھر کا نچلا حصہ کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ سو گزر بسر کچھ سہولت سے ہونے لگی تھی۔

کرایہ دار ماں کی ایک سہیلی راشدہ تھی جس کا شوہر ابوظہبی میں مقیم تھا اس کا ایک ہی بچہ تھا جو ذہنی طور پر معذور تھا۔ وہ ہنس مکھ اور فیشن ایبل عورت تھی۔ اس نے نیچے کے دنوں کمروں میں دنیا کی ہر آسائش جمع کر رکھی تھی۔ وہ ہر وقت چمکیلے کپڑوں میں ملبوس رہتی۔ جن کے بارے میں وہ بڑے فخر سے بتاتی تھی کہ وہ باہر سے آئے ہیں اور ایسی کوالٹی کسی باڑہ مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔

ایک روز راشدہ سیڑھیوں پر اپنی اونچی ہیل بجاتی ہوئی اوپر آئی تو اس کے پیچھے سانولی رنگت اور بلی جیسی آنکھوں والا ایک شخص بھی تھا۔ راشدہ آخری سیڑھی طے کر کے اوپر آ گئی

لیکن وہ شخص زینے میں ہی کھڑا رہا۔

"زرینہ......زرینہ......!" وہ بلند آواز سے پکار رہی تھی۔

"آ جاؤ راشدہ...... یہ اتنا شور کیوں مچا رہی ہے؟" ماں نٹنگ مشین چھوڑ کر بولی۔

"بھئی میرے ساتھ بلا بھائی آئے ہیں۔ تم کہو تو وہ بھی آ جائیں؟" راشدہ نے جیسے اجازت لینے کو کہا...... ماں اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی اور آنچل سر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"آ جاؤ...... انہیں بھی لے آؤ۔"

بلا بھائی بھی مسکراتے ہوئے اوپر آ گئے۔ انہوں نے ایک جانب چپ کھڑی ہوئی خضرا کے بالوں کو چھوا اور ماں کی طرف دیکھ کر ہاتھ پیشانی تک لے جاتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم جی......"

"وعلیکم السلام...... آئیں بیٹھیں......" ماں نے ایک سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بھئی...... اس وقت بیٹھنے کا وقت ہی نہیں۔ میں تو بلا بھائی کو تم سے ملوانے آئی تھی۔ تم نے کہا تھا ناں کہ ان سے تمہارے لئے آرڈر لوں۔ سپر مارکیٹ میں ان کی دکان بہت چلتی ہے......" راشدہ نے اٹھلا کر کہا۔

"ماشاء اللہ بھی تو کہو راشدہ بھابی، کہ نظر لگاؤ گی؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ماں کی طرف دیکھا۔ "ایک سویٹر میرا بھی بنا دیں گی آپ؟ آرڈر تو بعد میں بنتے رہیں گے۔"

"آپ اپنا سائز بتا دیں، میں بنا دوں گی۔" ماں نے جواب دیا۔

"میں سائز کیسے بتاؤں...... آپ خود ہی دیکھ کر اندازہ لگا لیں۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

راشدہ نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں زرینہ...... بلا بھائی کا ماپ لے لو۔"

"کیسے......؟" ماں نے قدرے جھجک کر چوڑے شانوں والے بلا بھائی کی طرف دیکھا۔"

"اس طرح......" راشدہ نے ہنستے ہوئے بلا بھائی کا بازو پھیلا کر بالشتوں سے ناپ کر دکھایا۔

"تم ہی ناپ لے لو۔" ماں ہچکچائی۔

"لو، بھلا مجھے کیا پتہ...... سویٹر بنانے کی ماہر تو تم ہی ہو...... میں تو ان معاملوں میں

بالکل کوری ہوں۔'' راشدہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر آگے لاتے ہوئے بولی۔ ماں نے پھر قدرے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو بلاّ بھائی نے دھائی دی۔

''بھئی میں اسی طرح کھڑے کھڑے سوکھ جاؤں گا یا کوئی میرا ماپ بھی لے گا؟''

''اچھا ٹھہریں، میں فیتے سے پیمائش لے لیتی ہوں......'' ماں نے میز کی دراز سے پیمائش کا فیتہ نکالا، بلاّ بھائی نے بازو پھیلایا۔ ماں پیمائش لینے لگی کہ اچانک بلاّ بھائی نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہنستے ہوئے بولے۔

''ارے ارے...... آپ تو مجھے گدگدی کر رہی ہیں۔''

''ارے ہاں، بلاّ بھائی کو گدگدی بہت ہوتی ہے۔'' راشدہ بھی بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ ماں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پیمائش کا فیتہ لپیٹتے ہوئے بولی۔

''میں نے اندازہ کر لیا ہے۔''

''تو پھر میں کب تک آپ کے ہاتھ کا بنا سویٹر پہن سکوں گا؟'' بلاّ بھائی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''آپ کل لے لیں۔ میرا خیال ہے کہ میں رات کو اسے مکمل کر لوں گی۔'' ماں نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کل ویسے بھی ایک ولیمے پر جانا ہے...... نیا سویٹر پہن لوں گا......'' بلاّ بھائی نے شگفتگی سے کہا۔

راشدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا زرینہ! چلتے ہیں...... میں دیکھوں پپو کہیں اٹھ تو نہیں گیا۔''

وہ بھی راشدہ کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

ماں انہیں رخصت کر کے آئی تو خضرا سے بولی۔ ''خضرا چائے کا پانی چولہے سے اتار دے۔''

خضرا چپ چاپ کچن کی طرف چلی گئی۔ ابھی وہ چولہے سے پانی کی دیگچی اتار ہی رہی تھی کہ اسے کسی کے اونچی آواز میں بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سہم سی گئی۔ اٹھ کر باورچی خانے کے دروازے تک آئی۔ انکل رؤف بڑے غصے میں ماں سے پوچھ رہے تھے۔

''یہ کیوں آیا تھا......؟''

''آپ کو بتایا تو ہے...... پھر بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' ماں بھی جھنجلائی۔

''اس کا مطلب ہے کہ آرڈر دینے اور لینے کے بہانے یہ روز آیا کرے گا......'' انکل رؤف کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''اگر وہ نہیں آئے گا تو مجھے جانا پڑے گا۔ اب کام تو کرنا ہے ناں...... بچوں کا پیٹ جو بھرنا ہوا۔'' ماں نے جیسے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

''وہ مجھے کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔'' رؤف انکل نے ناپسندیدگی سے کہا۔

''ہمیں اپنے کام سے کام ہے...... اس سے غرض نہیں۔'' ماں کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

''ٹھیک ہے پھر...... تمہاری مرضی۔ ہم کچھ کہنے والے بیچ میں کون ہوتے ہیں......'' وہ کچھ ناراض ناراض سے لہجے میں کہنے لگے اور شاید چلنے کے لئے اٹھے۔

''چائے تو پی لیں...... خضرا ابھی بنا دیتی ہے۔ خضرا...... خضرا! چائے بن گئی ہے تو لے آ۔'' ماں نے بلند آواز سے وہیں بیٹھے بیٹھے پکارا۔ خضرا جلدی سے کچن میں گھس گئی اور چولہے سے اتارا ہوا پانی پھر چولہے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر اندر گئی تو رؤف انکل ماں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے غصے اور ناراضگی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ خضرا نے چائے کے مگ سٹول پر رکھے تو انہوں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ارے بھئی آؤ خضرا...... کیا حال ہے تمہارا...... پڑھائی کیسی چل رہی ہے......؟''

''میں ٹھیک ہوں جی۔'' خضرا جھکے ہوئے سر کے ساتھ منمنائی۔

''بیٹھو......'' انہوں نے اسے قریب ہی پلنگ پر بٹھا لیا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''تم نے چائے کیسی بنائی ہے؟...... رنگ تو کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔''

ان کے لہجے میں چھیڑ تھی۔ خضرا بے چینی سی محسوس کرنے لگی اور اس نے شانے جھکا کر کچھوے کی طرح گردن اندر گھسیڑ لی۔

''ارے زرینہ...... یہ تمہاری بیٹی تو کوئی بات ہی نہیں کرتی۔'' رؤف انکل نے ماں سے کہا۔

''ہاں...... یہ بہت شرمیلی ہے۔ بس یونہی چپ چپ سی رہتی ہے۔'' ماں نے بتایا۔

خضرا نے اور سر جھکا لیا اور جیسے ہی رؤف انکل کا ہاتھ اس کی پشت سے علیحدہ ہوا وہ جلدی

سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گھس گئی۔

اگلے دن وہ سکول سے واپس آئی تو بلاّ بھائی بیٹھے تھے۔ ماں نے رات جاگ کر ان کا سویٹر مکمل کیا تھا اور اس وقت وہ سویٹر سامنے رکھے توصیفی نگاہوں سے کبھی ماں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی سویٹر کی طرف...... خضرا چپ چاپ سر جھکائے ان کے قریب سے گزرنے لگی تو ان کی نگاہ اس پر پڑی۔

''یہ آپ کی بیٹی ہے......؟'' انہوں نے پوچھا۔

ماں نے اثبات میں سر کو جنبش دی تو انہوں نے دوسرا سوال پوچھا۔

''کون سی کلاس میں پڑھتی ہے؟''

''آٹھویں جماعت میں۔'' ماں نے بتایا۔

کمرے میں آ کر ابھی خضرا نے بیگ رکھا ہی تھا کہ اسے راشدہ کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بلاّ بھائی! سویٹر پہن کر دکھاؤ تو پتہ چلے صحیح بھی ہے یا نہیں۔''

خضرا کمرے کے دروازے تک آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ بلاّ بھائی نے اٹھ کر کوٹ اتارا اور سویٹر پہن لیا۔ راشدہ نے آگے بڑھ کر سویٹر کو ان کے جسم پر سیدھا اور ہموار کیا۔ بلاّ بھائی نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے۔

''ہاں بھئی، بتائیں کیسا لگ رہا ہے؟''

''کچھ زیادہ سجا نہیں......'' راشدہ نے ناک بھوں چڑھا کر انہیں چھیڑا۔

''میں آپ سے کب پوچھ رہا ہوں...... میں نے تو زرینہ بیگم سے پوچھا ہے۔'' انہوں نے راشدہ سے لاتعلقی کا مصنوعی اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''لو بھئی زرینہ! بتاؤ اسے......'' راشدہ اٹھلائی۔

ماں کچھ ہچکچائی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی مسکراہٹ کو ظاہر ہو جانے سے روکا اور سرسری سے لہجے میں بولی۔ ''ٹھیک ہے بالکل...... مجھے تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔''

بلاّ بھائی نے اپنی بلیوں ایسی آنکھیں ماں پر گاڑ کر پوچھا۔ ''بس ٹھیک ہے......؟''

''نہیں، اچھا ہے۔'' ماں کچھ گڑبڑائی۔

''اچھا تو ہے...... اس لئے کہ آپ نے بنایا ہے۔ لیکن مجھ پر کیسا لگتا ہے؟ میں تو یہ

پوچھ رہا ہوں۔'' اس نے جو کہا اس کی وضاحت اس کی بلی ایسی آنکھوں نے کر دی۔

''لو زرینہ، بتاؤ اس کو...... یہ پینڈو اس سویٹر میں کیسا لگتا ہے؟'' راشدہ نے شرارت آمیز مداخلت کی۔

ماں نے دھیرے سے کہا۔ ''بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''شکریہ...... شکریہ......'' اس نے ہلکا سا خم ہوتے ہوئے آداب کیا اور اس کی نگاہ دوسرے کمرے کی دہلیز پر کھڑی ہوئی خضرا پر پڑی۔ ''بے بی...... ادھر آؤ......'' اس نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ خضرا قدرے متذبذب ہوئی تو ماں نے پکارا۔

''آؤ خضرا...... انکل بلا رہے ہیں۔''

خضرا کچھ جھجکتی ہوئی پاس آئی۔ بلاّ بھائی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے کچھ کرنسی نوٹ نکال کر خضرا کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے...... خضرا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹی اور اس نے ماں کی طرف احتجاج کرتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا...... سو سو کے تین نوٹ فرش پر گر پڑے۔

''نہیں، نہیں بلاّ بھائی...... یہ بات تو ٹھیک نہیں......'' ماں نے بھی احتجاج کیا۔

''ٹھیک کیوں نہیں...... میں اپنی بچی کو دے رہا ہوں، آپ بیچ میں بولنے والی کون ہوتی ہیں......؟'' بلاّ بھائی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''اوہو...... بچی نے اتنے روپے کیا کرنے ہیں؟'' ماں نے ٹوکا۔ لیکن اس کے انداز میں کمزوری تھی۔ خضرا نے وہاں سے ٹل جانا چاہا لیکن بلاّ بھائی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہیں، نہیں بے بی...... تم یہ لے کر جاؤ گی۔ اس سے تمہارا جو دل چاہے خرید لینا اور اپنی ماں کو بالکل مت دینا۔''

خضرا نے بچوں کے سے اکھڑ پنے سے ہاتھ چھڑا لینا چاہا لیکن بلاّ بھائی کی گرفت مضبوط تھی۔ ماں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ راشدہ نے مداخلت کی۔

''زرینہ! لے لینے دو ناں بچی کو...... تم خواہ مخواہ ہی...... بلاّ بھائی اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔''

ماں یوں مجبور سی ہو گئی جیسے وہ ایسا ہی چاہتی تھی اور بلاّ بھائی نے وہ تینوں کرنسی نوٹ فرش سے اٹھا کر خضرا کی ہتھیلی پر رکھ کر اس کی مٹھی بند کر دی۔ خضرا کا شعور ابھی کچا پکا ہی تھا

لیکن اُسے بلاّ بھائی سے یہ روپے لینے کچھ اچھے معلوم نہیں ہوئے۔ بلاّ بھائی سے نہ کوئی رشتہ تھا نہ ہی قرابت کا کوئی تعلق۔ اور ان سے شناسائی کی مدت صرف دو ایک روز ہی تھی۔ اسی لئے ان کے دیئے ہوئے روپوں سے خضرا کی مٹھی جلنے لگی۔ اسے باپ کا خیال آیا۔ اگر وہ اس کے ہاتھ پر ایک معمولی سکہ بھی رکھ دیتا تو اسے ایک خزانے کے مل جانے جتنی خوشی ہوتی۔ لیکن بلاّ بھائی کے دیئے ہوئے ان روپوں نے اسے کمتری کے احساس میں شرابور کر دیا تھا۔

وہ پشیمان پشیمان سی، چپ چاپ قدم اٹھاتی دوسرے کمرے میں آ گئی۔ خرم اپنا ایک ٹوٹا ہوا کھلونا جوڑتے جوڑتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپی، آپی...... تمہیں بلاّ بھائی نے کیا دیا ہے؟ مجھے پتہ ہے سب کچھ۔" اس نے بے تابی سے اس کی بند مٹھی میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

خضرا نے نہ اس سے جھگڑا کیا نہ تکرار۔ اس نے کراہت اور ناپسندیدگی سے مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔

"ہائے سو سو کے نوٹ...... اتنے سارے؟" خرم خوشی سے چلایا۔ "آدھے میں لوں گا۔ میں نے ایئر گن لینی ہے۔" اس نے خضرا کے ہاتھ پر سے پیسے اٹھانے کے لئے جھپٹا مارنا چاہا لیکن اس سے پہلے ماں نے خضرا کے ہاتھ سے پیسے اٹھا لئے۔

"یہ روپے بیکار چیزوں کے خریدنے کے لئے نہیں ہیں۔" ماں کا لہجہ درشت تھا۔

"ہماری چیزیں تو آپ کو بیکار ہی لگتی ہیں۔" خرم نے منہ پھلایا۔

خضرا نے ماں کی طرف دیکھا۔ "امی! انہوں نے ہمیں اتنے سارے پیسے کیوں دیئے ہیں؟" اس کے انداز میں تشویش اور گلہ تھا۔

"مفت میں تھوڑی دے دیئے ہیں، سویٹر نہیں بنا کر دیا انہیں۔ ابھی تو ان کی دکان پر رکھنے کے لئے اور مال بھی دینا ہے، اس کے لئے اُون انہی پیسوں سے آئے گی نا۔" ماں نے وضاحت کی۔

خضرا کے دل کی گرہ کھل گئی۔ ماں جواب سے کچھ دیر پہلے ماں کی بجائے کوئی غیر عورت معلوم ہونے لگی تھی، پھر ماں نظر آنے لگی۔

خضرا اور خرم دونوں اگلی کلاسوں میں چلے گئے لیکن باپ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ماں اب اس کی طرف سے بالکل بے فکر ہو گئی تھی۔ وہ ملنے جلنے والوں سے بھی یہی کہتی تھی کہ اُس کی کام کرنے سے جان جاتی ہے، وہ بچوں کی ذمہ داری اٹھانے سے بھاگا ہے اور اس قابل نہیں کہ اسے اپنا منہ دکھا سکے۔ وہ دونوں جیسے باپ کی صورت اور اس کی یاد بھی بھول گئے تھے۔ اس کے ہونے سے ان کی زندگی میں کسی آسائش، سہولت یا محبت کا اضافہ نہیں ہو جاتا تھا۔ اس کے جانے سے کوئی کمی نہیں ہوتی تھی جو انہیں کھٹکتی بلکہ انہیں تو روز کی تو تکار سے نجات مل گئی تھی۔ حالات میں کچھ بہتری پیدا ہوئی تھی۔

ماں کو بلاّ بھائی کی دکان سے کافی آرڈر مل جاتے تھے۔ وہ تمام دن سویٹر بنانے میں لگی رہتی۔ خضرا ان سویٹروں کو سیتی، بٹن اور پھندنے ٹانکتی اور ڈوریاں ڈالتی۔ ماں سویٹروں سے بیگ بھر کر انہیں بلاّ بھائی کی دکان پر پہنچانے جاتی تو بلاّ بھائی بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ کسی ملازم کو چائے یا بوتلیں لانے کے لئے دوڑاتے اور بار بار کہتے کہ ماں نے دکان پر آنے کی تکلیف کیوں گوارا کی۔ وہ خود گھر آ کر مال لے جاتے۔ ماں انکساری کا مظاہرہ کرتی۔ کبھی کبھی چائے بھی پی لیتی۔ گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو بلاّ بھائی سے خرید لیتی مگر وہ اس کے پیسے کبھی نہ لیتے بلکہ بڑی بے نیازی سے فرماتے۔

"زرینہ بیگم! تم ابھی یہ چیز تو اٹھاؤ ناں...... حساب کتاب بعد میں ہو جائے گا۔"

بلاّ بھائی اجرت ہمیشہ گھر آ کر دیتے۔ وہ شام ہی کو مسکراتے، اپنی بلی جیسی آنکھوں میں ایک پراسراری چمک لئے ہوئے آتے اور آتے ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑی فراخ دلی سے کہتے۔

"لو بھئی زرینہ بیگم، اپنا محنتانہ لے لو...... بس مجھے تو نیند ہی نہیں آتی اگر کسی کی اجرت میرے ذمے ہو۔" وہ کچھ کرنسی نوٹ گن کر ماں کے ہاتھ پر رکھتے اور کچھ چھوٹے نوٹ لپیٹ کر خضرا کے قریب چلے جاتے۔ "یہ بچوں کا حصہ ہے۔" وہ ہنس کر کہتے اور اپنا بڑا سا ہاتھ پھیلا کر اس کے سر پر رکھتے۔ "شاباش بے بی! لے لو...... اس میں سے بھائی کو بھی حصہ دینا۔"

خضرا مستفسرانہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھتی تو ماں تکلفاً بھائی کو منع کرتے ہوئے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں لے لینے کا اشارہ کرتی اور خضرا نہ چاہتے ہوئے بھی روپوں

کی آنچ سے جلتی ہوئی مٹھی بند کر لیتی۔ بلا بھائی کے جاتے ہی ماں وہ روپے اس سے لے لیتی اور ان روپوں کے ملنے یا ان سے محروم ہو جانے پر کوئی احساس نہ ہوتا نہ خوشی کا نہ افسردگی کا۔ البتہ خرم ماں کے آنچل سے لپٹ جاتا اور کسی نہ کسی فرمائش پر اڑ جاتا۔ ماں ہنس کر اس کے رخسار پر چپت لگاتی۔

''کتنا بدمعاش ہے تُو...... کہہ تو دیا ہے ناں کہ بلا بھائی کو آرڈر دینے جائیں تو ان کی دکان سے لے دوں گی۔''

اگلی بار جب وہ بلا بھائی کی دُکان پر جاتے تو خرم اپنی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز لے کر لوٹتا۔

اس روز بھی بلا بھائی سویٹروں کی بنائی کی اجرت دینے گھر آئے ہوئے تھے۔ ماں نے چائے کا پانی رکھا اور خضرا سے بولی۔

''خضرا......! تم خرم کو ساتھ لے جاؤ اور بیکری سے کچھ پیسٹریاں اور ٹافیاں لے آؤ۔''

خضرا نے خرم کا ہاتھ تھاما اور دونوں سیڑھیاں اتر گئے۔ بیکری گھر سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ خضرا نے پیسٹری کا ڈبہ سنبھالا، خرم نے ضد کر کے ایک آئس کریم بھی خرید لی اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔ وہ اپنے دروازے پر پہنچے اور ابھی انہوں نے زینے پر قدم نہیں رکھا تھا کہ بلا بھائی آندھی کی طرح سیڑھیاں اترے اور بگولے کی طرح ان کے برابر سے گزر گئے۔

''آپی! ان کو کیا ہوا؟'' خرم نے ان کی افراتفری کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

دونوں نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے معمول کے راستے کی بجائے ایک اور ملحقہ گلی میں گھس گئے۔ وہ اتنے گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے کہ انہوں نے ان دونوں کے برابر سے گزرتے ہوئے انہیں خدا حافظ بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں کچھ پریشان سے ہوئے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور ٹھٹک گئے۔ تپتی ہوئی آوازوں کا لاوا بہتا چلا آ رہا تھا۔ باپ کی گالیوں کی بوچھاڑ نیچے تک آ رہی تھی۔ ماں کے چیخنے اور چیزوں کے لڑھکنے میں شور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ خضرا کے ہاتھوں سے پیسٹری کا ڈبہ چھوٹ گیا اور وہ دونوں سہمے سہمے سے سیڑھیوں کے بیچ کھڑے ہو گئے۔ آوازیں بلند ہوئیں اور شور میں اضافہ ہو گیا۔ برتن ٹوٹنے کے چھناکے بار بار سنائی دینے لگے۔ خرم نے خضرا کا

ہاتھ تھام لیا۔

''آؤ آپی! یہاں سے چلیں۔ اوپر گئے تو ہمیں بھی مار پڑے گی۔''

خضرا تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ وہ سہمی ہوئی آنکھیں کھولے اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اس وقت زینے کے آغاز پر باپ کی دھاڑ سنائی دی۔

''کہاں ہیں وہ دونوں...... کہاں بھیجا ہے تُو نے انہیں...... جلدی بتا، ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا حرافہ، کمینی، ذلیل عورت......'' اس کے ساتھ ہی اس نے زینے میں جھانکا اور اس کی غصے سے تپتی ہوئی نگاہ سیڑھیوں میں کھڑے ہوئے خضرا اور خرم پر پڑی۔ وہ لپک کر سیڑھیاں اترا اور اس نے عقاب کی طرح جھپٹ کر دونوں کے بازو پکڑ لئے۔ اس نے اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ کچھ سوچ سمجھ سکتے، سنبھل جاتے، کچھ مزاحمت کرتے یا منہ سے کچھ لفظ ہی بول سکتے۔ وہ بیچ زینے سے ہی انہیں اپنے ہمراہ گھسیٹ لے گیا جس طرح پانی کا زبردست ریلا راہ کے ہر خس و خاشاک کو اپنی لہروں میں بہا لے جاتا ہے۔

خضرا کی اوڑھنی بار بار پھسل رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اسے سنبھالتی، باپ کی طوفانی رفتار کا ساتھ دے رہی تھی۔ خرم کے لئے تو اس کی رفتار کا ساتھ دینا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کئی بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا لیکن باپ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی...... اس نے تو انہیں ماں کو ایک نظر دیکھنے بھی نہیں دیا تھا اور ہمیشہ کی طرح بغیر کچھ کہے سنے انہیں اپنے ہمراہ گھسیٹ رہا تھا۔

خرم گھبرا کر رونے لگا لیکن باپ کی ایک ہی گھرکی میں اس کی آواز ڈوب گئی۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر ایک رکشہ روکا اور ان دونوں کا بازو تھامے ہوئے اس میں سوار ہو گیا۔ خضرا کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ دوڑتا ہوا رکشہ، بھاگتے ہوئے لمحے اور آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مناظر انہیں پھر ایک بار ماں اور اپنے گھر سے بہت دور لے جا رہے ہیں...... نہ جانے کہاں اور کس طرف...... ان کے ذہن خالی تھے اور دل کسی امید یا توقع سے تہی تھا۔ بس ایک خوف تھا جو ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔

رکشہ اونچی نیچی، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر ہچکولے کھاتا رہا۔ اور جب باپ نے انہیں رکشے سے اتارا تو سامنے آنٹی مہرالنساء کا دروازہ تھا۔

باپ کی دستک زوردار تھی۔ شاید اسی لئے دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور نیم وا کواڑوں کی اوٹ سے آنٹی کا مہربان چہرہ دکھائی دیا۔

''ارے مختار تم...... یہ بچوں کو پھر لئے چلے آ رہے ہو...... کیسی بے چین روح ہے تمہاری...... اب تو تمہاری بیوی کو تمہارے اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہے۔''

''فکر نہ کرو...... میں اس مرتبہ تم پر بوجھ نہیں بنوں گا...... بس ایک رات کی ہی بات ہے، صبح کے پھیرے میں ان کو ساتھ لے جاؤں گا۔'' باپ نے آنٹی کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کہاں لے جاؤ گے تم ان معصوم پھولوں کو......؟'' آنٹی نے قدرے ناگواری سے کہا۔

''بس اس مرتبہ پکا انتظام کرتا ہے۔ مجال ہے اس کی کہ بچوں کی ہوا کو بھی پا سکے......'' باپ نے دانت بھینچ کر نفرت سے کہا۔

خضرا لرز گئی۔ اس کے دل میں جاگتی ہوئی موہوم سی امید بھی دم توڑ گئی۔ آنٹی کے گھر کا دروازہ دیکھ کر اسے تسکین سی ہو گئی تھی کہ یہ جگہ جانی پہچانی تھی۔ آنٹی بھی مہربان تھی اور اس کے رویے میں مانوسیت تھی۔ لیکن یہ مانوسیت صرف رات بھر کے لئے تھی۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کے ساتھ ایک انجان صبح ان کی منتظر تھی جو نہ جانے انہیں کہاں لے جانے والی تھی۔ خوف کی دبیز تہیں پھر ایک بار خضرا کے جسم و جان پر چھا گئیں وہ دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے چارپائی پر بیٹھ گئے۔

آنٹی نے ان کی طرف دیکھا اور ہمدردی کے لہجے میں بولی۔

''مختار! تم نے اپنے جھگڑے میں ان بچوں کی زندگی بھی اجیرن کر دی ہے۔''

باپ نے غصے سے کھول کر گالی بکی۔

''بس تم مجھے ہی الزام دینا...... میرا ہی قصور نکالنا۔ اس حرافہ ڈائن کو کچھ نہ کہنا۔ میں آج اسے یہ خوشی کی خبر سنانے گیا تھا کہ میں نے ویگن ڈرائیوری کر لی ہے مگر وہ اپنے یار کے ساتھ بیٹھی عیش کر رہی تھی رنڈی...... میں نے تو دونوں کا فیصلہ کر دینا تھا، پھر وہ لفنگا میرے ہاتھ سے نکل گیا اور اسی فاحشہ نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی نہیں تو آج میں نے اسے مزہ چکھا دینا تھا۔''

''ارے نہیں...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی...... وہ بیٹی کی ماں ہے۔''

''پھر وہی بات......'' باپ نے طیش میں آ کر اس کی بات کاٹی...... ''تم پتہ نہیں کیوں اس کی حمایت کرتی ہو...... کیا لگتی ہے وہ تمہاری؟''

''اچھا چھوڑو اب یہ غصہ گلہ۔ مفت میں بچے غلط سلط باتیں سنتے ہیں۔'' آنٹی نے دبی زبان میں کہا کہ وہ نہ سنیں۔ لیکن خضرا نے صاف طور پر سنا اور سوچنے لگی کہ اس نے تو جس روز سے سننا اور دیکھنا شروع کیا ہے اسی روز سے وہ ساری باتیں دیکھی اور سنی ہیں جو بچوں کو دیکھنی اور سنی نہیں چاہئیں۔ اب تو وہ ان کی عادی ہو گئی تھی۔ اب تو کوئی بات اسے حیرت میں نہیں ڈالتی تھی۔ اب تو وہ لاشعوری طور پر اسی انتظار میں رہتی تھی کہ آنے والا لمحہ اس کے لئے اپنے دامن میں کون سے دکھ اور کون سی اذیتیں لے کر آتا ہے۔

باپ ان سے بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔ آنٹی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی چلی گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور آنٹی تیلیوں کی چلمن اٹھا کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے اپنی دھاگوں والی ٹوکری اٹھائی اور اس میں رکھے ہوئے لفافے میں سے مکئی کے بھنے ہوئے دانے مٹھی بھر کر باری باری دونوں کی جھولی میں ڈالی اور محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

''گھبراؤ نہیں بچو...... آرام سے کھیلو کودو...... صبح تمہارا باپ آئے گا تو میں اس سے کہوں گی کہ تمہیں میرے پاس ہی چھوڑ دے۔ تمہاری وجہ سے میرا دل بھی لگا رہتا ہے۔''

خرم کا اترا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ پر اُمید آنکھوں سے آنٹی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''سچ آنٹی...... آپ سچ کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں ہاں بیٹے، میں اس سے کہوں گی وہ میری بات مان لے۔'' آنٹی محبت سے خرم کو یقین دلا رہی تھی لیکن خضرا اس کے اس یقین میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باپ کسی کی نہیں سنے گا۔ وہ صبح ہوتے ہی آن وارد ہو گا، ان کا بازو پکڑے گا اور انہیں گھسیٹتا ہوا نہ جانے کہاں لے جائے گا۔

بے چینی نے اس کا حصار کر لیا تھا، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ماں کا چہرہ بار بار نگاہوں میں پھرتا تھا، گھر اور اس کی یاد لمحہ لمحہ چھیڑتی تھی۔ اس نے اپنی جھولی میں پڑے ہوئے مکئی کے کھلے ہوئے سفید سفید دانے اٹھائے اور آنٹی کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"آنٹی یہ رکھ لیں...... میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

آنٹی نے اس کے افسردہ چہرے کی طرف دیکھا اور پیار سے بولیں۔ "بیٹی کھاؤ ناں...... اتنا پریشان کیوں ہوتی ہو؟ تمہارا باپ تو یونہی شور مچاتا رہتا ہے، کرتا کراتا کچھ نہیں۔"

خضرا نے سارے دانے آنٹی کے ہاتھوں پر گرا دیئے اور اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی اس لئے کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اسی لئے کوئی آس نہیں باندھ سکتی تھی۔

انہی اداس اور بے اعتبار، خوف سے لتھڑے ہوئے لمحوں میں رات آئی تو آنٹی نے انہیں کھانا کھلا کر بستر پر لٹا دیا۔ خرم تو جلدی سو گیا، تھوڑی دیر میں آنٹی کے خراٹوں کی آواز بھی آنے لگی۔ لیکن خضرا کی آنکھوں میں نیند نہیں اتری۔ وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتی اندھیرے کو گھورتی رہی اور آنے والے انجان وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر ڈرتی رہی۔

صبح آنٹی نے ہی انہیں جگایا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر ابھی ناشتہ کرنے بیٹھے ہی تھے کہ زوردار دستک نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے سہم کر دیکھا کہ باپ ان کے سر پر موجود تھا۔

"خدا کا خوف کرو مختار...... بچوں کو ناشتہ تو کر لینے دو۔" اس نے جلدی جلدی کا شور مچایا تو آنٹی نے غصے سے سرزنش کی۔

"ناشتہ کر لیں گے راستے میں۔ تمہیں پتہ ہے میں نے سوا آٹھ بجے والی ویگن لے کر جانی ہے اور ساڑھے سات ہو رہے ہیں۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی وقت ہے ناں...... یونہی شور مت مچاؤ۔" آنٹی نے اسے ٹوکا اور ان دونوں سے بولی۔ "چلو بچو! تم آرام سے ناشتہ کرو۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

باپ خلاف توقع ہنس پڑا۔ "بچوں کا تمہیں بڑا خیال ہے اور مجھے تو تم نے جھوٹے منہ بھی ناشتے کا نہیں پوچھا۔"

"تم جیسے مشٹنڈے کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" آنٹی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"کیوں...... کیا مشٹنڈے انسان نہیں ہوتے......؟" وہ بولا۔ پھر اس کی نگاہ خضرا اور خرم پر پڑی جو ناشتہ کرنے کی بجائے حیرت اور اچنبھے سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اوئے تم آگے دیکھ کر ناشتہ کرو۔ یہ کیا من من لگائی ہوئی ہے۔ موتی پرو رہے ہو یا ناشتہ کر رہے ہو؟" خضرا اور خرم سر جھکا کر فوراً ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"مختار! میری ایک بات سن......" آنٹی نے لفظ سنوار کر کہے۔

باپ اس کے لہجے پر حیران ہو کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"دیکھ مختار...... تو بچوں کو میرے پاس ہی رہنے دے۔" آنٹی کے لہجے میں منت تھی۔

"ہاں...... اور وہ حرافہ، ڈائن دن دیہاڑے انہیں اغواء کر کے چلتی بنے...... ہیں......" باپ نے یکدم بھڑک کر کہا۔

"نہیں...... اب میں خیال رکھوں گی......" وہ بولی۔

"نہیں مہر النساء! میں یہ روز روز کا کھیل تماشہ ختم ہی کر دوں گا۔ اس عورت کا سایہ اب ان پر نہیں پڑے گا۔"

اس نے قطعی لہجے میں کہا اور ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور ان کے گرد ہو گیا۔

"چلو بھئی اٹھو...... باقی کا ناشتہ پھر کر لینا۔"

خرم اور خضرا فوراً ہی ناشتہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے...... باپ نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا کہ آنٹی اس کے جواب میں کچھ کہہ سکے۔ اور شاید آنٹی نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا کچھ کہنا بیکار ہو گا اس لئے اس نے نہ روکا نہ کچھ کہا۔ بس چپ کھڑی دیکھتی رہی۔ باپ نے بلند آواز سے اسے خدا حافظ کہا اور ان دونوں کے بازو پکڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔

وہ سر جھکائے، ہزاروں خدشوں میں گھرے اس کے ساتھ قدم قدم چلتے رہے۔ وہ پُر پیچ گلیوں میں پیدل ہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ تیز چلنے کی کوشش میں خضرا اور خرم کا سانس پھولنے لگا۔ یونہی اذیت اور پریشانیوں کے فاصلے کاٹتے وہ ایک سڑک پر نکل آئے جہاں کچھ ذیلی سڑکیں آ کر ملتی تھیں۔ چاروں طرف ایک شور بپا تھا۔ تانگے، رکشے اور مختلف سواریاں جگہ جگہ کھڑی مختلف علاقوں کا نام لے لے کر مسافروں کو اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے آ جا رہے تھے۔ باپ اپنی دھن میں چلتا چلا گیا اور ایک جانب کھڑی ہوئی ویگنوں کے ہجوم میں گھس گیا۔

"بڑی دیر کر دی یار استاد...... ویگن بھری کھڑی ہے......" میلے کپڑوں اور گلے میں

رنگین ریشمی مفلر ڈالے ایک شخص نے قریب آ کر کہا۔

"کہاں دیر ہوئی ہے...... ابھی تو پورے دس منٹ پڑے ہیں۔" باپ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "نظام! تُو بچوں کو لے کر ویگن میں بٹھا، میں چائے پی کر آتا ہوں۔"

"یہ آج بچے کس طرح تیرے ساتھ آ گئے؟" اس نے آنکھ دبا کر پوچھا۔

باپ نے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک غلیظ سی گالی اس کی جانب اچھال دی اور خود ایک کھوکھا نما ہوٹل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نظام نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا، اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"گھبراؤ نہیں بچو...... میں تمہارا چاچا ہوں...... تم مکھو استاد کے بچے ہو تو ہمارے بھی جان جگر ہو۔"

اس نے دونوں کو ساتھ لیا اور ایک ٹھیلے کے پاس رک گیا۔ ان کے لئے تلی ہوئی دال اور میٹھی گولیوں کے پیکٹ خریدے اور انہیں ویگن میں سب سے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور پھر ایک بار اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے ان دونوں کے شانے تھپکتے ہوئے بولا۔

"پتر گھبرانا نہیں اچھا، ابھی تمہارا ابا آ جاتا ہے۔ وہی یہ ویگن چلائے گا۔ سبحان اللہ ویگن چلاتا ہے کہ پھول کترتا ہے۔ تم کھلے ڈلے ہو کر بیٹھو، یہاں سے اٹھنا نہیں۔ میں باہر ہی کھڑا ہوں۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔ شاواشے......"

وہ دونوں سہمے ہوئے سے چپ چاپ بیٹھ کر دائیں بائیں آتی جاتی، رکتی، اسٹارٹ ہوتی ویگنوں کا شور اور مسافروں کو گھیر گھیر کر لانے والوں کی آوازیں سننے لگے۔ سامنے لگے ہوئے آئینے میں سے انہیں ویگن میں بیٹھے ہوئے مسافر نظر آ رہے تھے جو اپنے اپنے مشاغل میں الجھے ہوئے تھے۔ مائیں بچوں کو بہلا رہی تھیں اور مرد کبھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتے۔ پھر ان میں سے کچھ نے آوازیں لگائیں۔

"چلو بھئی...... ویگن کب کی بھر چکی ہے...... چلو...... چلو......"

نظام نے دوسری طرف سے شیشے میں ہاتھ ڈال کر دو تین بار ہارن بجایا۔ تھوڑی ہی دیر میں باپ ڈرائیور کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر مڑ کر مسافروں کی طرف دیکھا، پھر ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"یا اللہ خیر۔"

ویگن اسٹارٹ ہوئی...... باہر کھڑے ہوئے نظام نے بلند آواز میں ویگن کو دوسری ویگنوں کے بیچ سے نکالنے کے لئے آوازیں لگانی شروع کر دیں۔

"آن دے...... آن دے......! روک کے...... روک کے...... بس...... بس......"

جب ویگن کا رخ شاہراہ کی جانب ہو گیا تو وہ لپک کر چلتی ویگن میں سوار ہو گیا۔

خضرا اور خرم کے لئے یہ بات عجیب اور تعجب خیز تھی کہ باپ ویگن چلا رہا تھا۔ ان کے لئے دور دراز کا یہ سفر ایک نیا تجربہ تھا۔ خرم جو کچھ دیر پہلے ڈرا ڈرا اور سہا ہوا تھا، اب اشتیاق سے شیشے سے باہر بھاگتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے تلی ہوئی دال کا پیکٹ کھول لیا اور مزے سے دال کھانے لگا۔

ویگن سڑک کو نگل رہی تھی اور فاصلہ گھٹتا چلا جاتا تھا۔ وہ اب بھی لاعلمی میں سفر کر رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ہاں خضرا کو ہر لمحے یہ احساس کھا رہا تھا کہ یہ طویل فاصلے ماں اور ان کے درمیان حائل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شاید وہ انہیں طے نہیں کر سکے گی۔ شاید وہ اتنی دور کا سراغ نہیں پا سکے گی...... نہ جانے پلٹ کر دیکھ سکے گی یا نہیں......!

راہ میں ایک ہوٹل آیا تو باپ نے ویگن روک لی۔ مسافر ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔ کوئی ریستوران میں گھس گیا، کسی نے سگریٹ سلگا لیا اور کوئی یونہی ٹہلنے لگا۔ باپ بھی ویگن سے اتر گیا اور وہ دونوں وہیں دبکے ہوئے بیٹھے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں نظام کا بڑی بڑی مونچھوں والا چہرہ ویگن میں دکھائی دیا۔ اس نے خرم کا ہاتھ پکڑا اور اسے نیچے اتارتے ہوئے بولا۔

"آ جا پتر...... آ جا نیچے ذرا...... ٹانگیں کھل جائیں گی۔" اس نے خضرا کو بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا تو وہ بھی جھجکتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

"اوئے انہیں کیوں نیچے اتار لیا ہے تُو نے......" باپ کی کرخت آواز سنائی دی۔

وہ دونوں سمٹ گئے۔ نظام نے جلدی سے ان کی طرفداری کی۔ "بچے ہیں مکھو استاد بیچارے بیٹھ بیٹھ کر جڑ گئے ہیں۔"

"اور جو کوئی ان کی ماں کا یار جڑ گیا تو...... کسی نے انہیں دیکھ کر اس سے جا لگائی تو...؟" باپ نے گالی دے کر کہا۔ "چل تُو انہیں اوپر ہی چڑھا دے۔" اس نے قدرے درشتی سے

کہا۔

نظام نے انہیں پھر ویگن میں ٹھونس دیا۔ باپ نے کھڑکی میں سے اخبار میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ خضرا کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو...... دونوں روٹی کھالو......" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"کھاؤ شاباش پتر...... میں تمہارے لئے پانی لے کر آتا ہوں۔" نظام نے محبت سے کہا اور ویگن سے نیچے اتر گیا۔

خرم کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ دن بھی تو خاصا نکل آیا تھا۔ اس نے بے صبری سے پیکٹ کھولا، نان میں رکھے ہوئے سیخ کباب اب تک بھاپ چھوڑ رہے تھے۔ خضرا پریشان تھی۔ بے چین تھی۔ لیکن بھوک اسے بھی لگی تھی۔ باپ نے ناشتہ بھی تو نہیں کرنے دیا تھا۔ اس نے نان میں کباب رکھ کر کریم رول سا بنایا اور خرم کو دیا۔ خود بھی بے دلی سے بھوک مٹانے کو کھانے لگی۔

مسافر بھی ایک ایک کر کے واپس آ گئے۔ باپ نے دو تین مرتبہ ہارن بجائے اور ویگن اسٹارٹ کر دی۔ سواریاں، مسافر، سڑک اور راہ کی ہر شے متحرک ہو گئی اور لمحے تیزی سے بھاگنے لگے۔ سورج بلند ہو گیا اور رش سے بھری ہوئی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی ویگن ایک اڈے پر رک گئی۔ مسافر اپنا اپنا سامان اٹھا کر جانے لگے۔ باپ نے انہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود ویگن سے باہر نکل گیا۔ ایک ایک کر کے تمام سیٹیں خالی ہو گئیں۔ نظام ویگن کی چھت پر سے مسافروں کو ان کا سامان اتار کر دیتے ہوئے چلا چلا کر بولتا رہا...... پھر وہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور ان کی سیٹ کا شیشہ کھٹکھٹایا۔

"آ جاؤ چن تاریو......شاباش......" اس نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے...... اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں دروازے میں سے نیچے اتارا۔ انہوں نے دیکھا کہ دور سے باپ ان ہی کی طرف چلا آتا ہے۔ وہ قریب آیا اور نظام سے بولا۔

"مالک پتہ نہیں کہاں مرا ہوا ہے...... اسے کہہ دینا کہ آج میں واپسی کا پھیرا نہیں کروں گا۔"

"اچھا استاد! تیری مرضی...... پر وہ بک بک کارا بہت کرے گا۔" نظام نے جواب دیا۔

"اس کو بکنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں عبدالرحمٰن کو بھیج دوں گا۔" باپ نے اکھڑ پن سے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" نظام کو جیسے اطمینان ہو گیا۔

"اچھا بھئی، اللہ بیلی......" باپ نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑ لئے اور ویگنوں اور مسافروں کے ہجوم سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ انہیں تانگہ مل گیا جس میں پہلے سے ہی دو سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں...... باپ نے اس کے ساتھ کچھ بھاؤ تاؤ کیا اور انہیں لے کر اس میں سوار ہو گیا اور تانگہ ٹخ ٹخ کرتا انجان راہوں کی طرف بڑھتا چلا گیا......!

✿......✿

وہ ایک پرانی طرز کے چھوٹی اینٹوں والے حویلی نما مکان کے سامنے رکے جس کا دروازہ اونچا اور رنگین تھا۔ باپ نے کوچوان کو کرایہ دیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی طے کر کے صحن کی دہلیز پر آئے جو بلند تھی اور دو سیڑھیوں کے ذریعے نیچے جاتی تھی۔ باپ ان کو لئے ہوئے آگے بڑھا۔ صحن میں کوئی ملازمہ چھاج میں آٹا پھٹک رہی تھی۔ اس کے قریب ہی رنگین پایوں کی بڑی سی چارپائی پر بڑھیا کپڑوں میں ایک عورت بڑے ٹھسے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ آہٹ پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیات جھلکیں۔ وہ لپک کر چارپائی سے اتری۔

"ہائے مکھو ویرا! تو کہاں سے بھول پڑا...... یہ چاند کہاں سے چڑھ آیا، ارے تجھے ہماری یاد کس طرح آئی...... تجھے اس موت جوگی نے آنے کی اجازت دے دی۔" وہ بے ربط جملے کہتی ہوئی آگے بڑھی اور باپ کے گلے لگ کر رو پڑی۔

پھر اس نے جھک کر خضرا اور خرم کو پیار کیا اور سر اٹھا کر باپ سے بولی۔ "مکھو! یہ تیرے بچے ہیں...... ہائے ہائے میں مر جاؤں...... اس نے ہمیں تیرے بچوں کی صورت بھی نہیں دیکھنے دی۔ دیکھ تو کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔"

باپ نے بتایا کہ وہ ان کی پھوپھی ہے۔ وہ انہیں اندر لے گئی۔ اونچی منقش چھتوں والا کمرہ قدیم انداز میں سجا ہوا تھا۔ ریشمی دیوان بروکیڈ کے گاؤ تکیے، مور کے پر، طاقوں میں گڑیا اور حنوط کئے ہوئے پرندے، بڑی بڑی تصویریں اور مینٹل دیوار پر بارہ سنگھے کا حنوط کیا ہوا سر نصب تھا۔ وہ دونوں سہج سہج کر قدم آگے رکھتے، آنکھ بچا کر چاروں طرف دیکھتے

اندر داخل ہوئے اور ریشمی دیوان کے ایک گوشے پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ پھر پھوپھی نے بلند آواز میں پکارا۔

”جیراں...... نی جیراں...... چھینا کو بلا۔“

چھن چھن کی آواز کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے پیچھے پیچھے ایک لمبے قد اور بھاری جسم کی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اس نے شوخ رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے پاؤں میں جھانجر تھی۔ اس نے دلہیز پہ رک کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ باپ پر پڑی۔

”السلام علیکم ماما جی!“ اس نے خوشی سے کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا اور باپ کے قریب جا کر سر جھکا دیا۔ باپ نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شگفتہ لہجے میں بولا۔

”واہ بھئی...... ہماری چھینا نے تو خوب قد نکالا ہے...... میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو بالڑی سی تھی۔

چھینا کچھ محجوب سی ہو گئی۔ پھوپھی نے اسے بتایا۔

”یہ دیکھ تیرے بہن بھائی آئے ہیں۔“

وہ ان کے قریب آ گئی اور الہڑ پنے سے بولی۔ ”اچھا تو یہ خضرا ہے...... اور یہ خرم۔“ اس نے دونوں کے بالوں کو باری باری چھوتے ہوئے کہا۔

خضرا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خوب گوری چٹی اور خوبصورت نین نقش والی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اور تھرتھراتے لبوں پر تازگی تھی۔ اس نے خضرا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے تکلفی سے بولی۔

”آؤ میں تمہیں گھر دکھاؤں...... اب تو تم یہاں کچھ دن رہو گی ناں ہمارے پاس۔“

”ہاں، جا بہن بھائی کا منہ ہاتھ دھلوا۔ اور ہاں، جیراں سے کہہ دینا کہ کوئی چائے پانی کا بندوبست کرے۔ بچے تھکے ہوئے ہیں۔“ پھوپھی نے ہدایت دی۔

”اچھا بے بے۔“ چھینا نے مستعدی سے کہا اور انہیں اپنے ہمراہ لے کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

خضرا کو کچھ اپنائیت کا احساس ہوا۔ اس نے رشتہ داری کے لفظ کی چاشنی کو محسوس کیا۔ ماں کا تو آگے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا اور باپ نے کبھی کسی رشتہ دار کا نام نہیں لیا تھا اسی لئے

وہ اپنے خون کی مہک سے نا آشنا تھی۔ چھینا کے ہمراہ چلتے ہوئے وہ ایک نئے تعلق سے روشناس ہو رہی تھی۔ اس کے وجود میں ابلتی ہوئی بے چینی میں کمی ہو گئی تھی۔ من ہی من میں اس کے ننھے سے دل نے چپکے سے کہہ دیا تھا کہ اگر باپ انہیں اس بھاری بھاری ستونوں اور منقش چھتوں والے حویلی نما گھر میں مہربان چہرے والی پھوپھی کے پاس چھوڑ گیا تو انہیں یہاں رہنے میں اتنی دقت نہیں ہو گی۔

چھینا سیماب صفت اور شوخی و شرارت سے معمور تھی۔ اس نے باورچی خانے میں جھانک کر چولہے کے قریب بیٹھی جیراں سے چائے پانی کا بندوبست کرنے کو کہا اور انہیں سارے گھر میں لئے لئے پھری۔ وہ گھر کی وسعت اور چمکیلی سجاوٹ سے بے حد مرعوب ہو رہے تھے۔ لیکن چھینا کی خوش مزاجی ان کے احساسِ کمتری کو ہر لحظہ کم کر رہی تھی۔ وہ بے حد باتونی تھی۔ اتنے سے وقت میں اس نے دنیا بھر کے سوالات خضرا سے پوچھ ڈالے اور اس کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر لیں اور خضرا کے گلے میں بازو ڈال کر بڑے لگاؤ سے بولی۔

”میں اکیلی ہوں خضرا۔ شروع سے اکیلی ہوں۔ نہ میری کوئی بہن ہے نہ سہیلی۔ ابا جی کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ تم مجھ سے چھوٹی ہو پر ہو تو میری بہن، میری سہیلی۔ میں تم سے باتیں کروں گی۔ بہت سی باتیں۔ دل کی باتیں۔ تم میری سہیلی بنو گی ناں؟“

خضرا کو اس کی یہ اپنائیت بے حد اچھی لگی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بمشکل اس کے کندھے تک پہنچتی تھی وہ اس کی بات کی گہرائی کو نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کے ساتھ ایک تعلق، ایک رشتے کو محسوس کر سکتی تھی جس میں گرمی، گداز، اپنائیت تھی۔ وہ اپنے جذبوں کو لفظوں میں تو نہیں پرو سکی لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چھینا بلا ضرورت ہی ہنس پڑی۔ پھر اس نے قریب ہی کھڑے ہوئے خرم کی طرف دیکھا جو حیرانی سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتی ہوئی چہکی۔

”ہائے میرا بھائی کتنا پیارا ہے۔ دیکھو کس طرح ہماری طرف دیکھ رہا ہے بٹ بٹ۔“

خرم اس کے غیر معمولی التفات پر کچھ شرمایا اور پھر ہنس پڑا۔

وہ صبح اٹھے تو باپ انہیں کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ اس گھر کی اپنائیت کے باوجود وہ ابھی

تک خود کو اجنبی اجنبی سا محسوس کر رہے تھے اسی لئے باپ کے متعلق استفسار بھی نہیں کر سکے۔ ان کے دل میں یہی خیال تھا کہ اتنے بڑے گھر میں وہ کسی نہ کسی کمرے میں ضرور ہوگا۔ یہی سوچ کر وہ خود کو تسلی دے رہے تھے کہ چھینا خوشی سے کھلکھلاتی ہوئی آئی۔ خضرا کو گلے سے لگا کر بولی۔

"آہا خضرا...... اب تم یہیں رہوگی۔ اللہ کی قسم ماما جی چھوڑ گئے ہیں۔ اب تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہے ناں۔"

لمحے بھر کو نا امیدی کی سرد کر دینے والی کیفیت نے خضرا کو سُن سا کر دیا تھا۔ چھینا نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کر لیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر بولی۔

"خضرا! تُو تو اُداس ہوگئی ہے۔"

خضرا اپنی آنکھوں میں چھلکتی ہوئی نمی کو اندر ہی اندر ضبط کر گئی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چھینا باجی! تمہارے ساتھ رہ کر میں اداس کیوں ہوں گی؟"

چھینا نے بے ساختہ اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور خوشی سے چھلکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"خضرا! میں بہت خوش ہوں...... بہت خوش۔"

اسی شام اچانک ساری حویلی میں افراتفری کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ نوکر چاکر دوڑ دوڑ کر بیٹھک کی طرف لپکنے لگے۔ پھوپھی راجاں اور جیراں پر چیخ چیخ کر زنان خانے کی ترتیب و آرائش درست کروانے لگی۔ چھینا جو کبھی باورچی خانے میں جھانکتی بھی نہیں تھی، باورچی خانے میں گھس کر سارے چولہے جلا کر بیک وقت نہ جانے کیا کچھ پکانے لگی۔

خضرا اور خرم کے لئے یہ سب کچھ بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ ان کے لئے پہلے ہی ماحول نیا اور اجنبی تھا اس پر اس غیر معمولی افراتفری نے انہیں کچھ اور چونکا دیا۔ خرم سے رہا نہ گیا تو وہ چھینا کے گرد ہو گیا۔

"چھینا باجی! باہر کون آیا ہے؟" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"ابا جی آئے ہیں۔ بڑے دنوں کے بعد۔" وہ ایک دبے دبے اشتیاق کے ساتھ بولی۔

"کون ابا جی؟" خرم نے معصومیت سے سوال کیا۔

"میرے ابا جی اور کون۔ تمہارے پھوپھا جی۔" اس نے سمجھایا۔

"باہر سے آئے ہیں؟" خرم کے استفسار میں اشتیاق تھا۔

"ہاں۔" چھینا نے خوشی سے بتایا۔

"دوبئی سے؟" خرم کی بے صبری قابل دید تھی۔

چھینا محظوظ ہو کر ہنس پڑی۔ "ارے خرم! دوبئی سے نہیں، زمینوں سے آئے ہیں۔ بہادر آباد میں ہمارے مربعے ہیں ناں، وہیں سے آئے ہیں بڑی دیر کے بعد۔"

"وہیں رہتے ہیں؟" خضرا نے بھی دخل اندازی کی۔

چھینا نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اتنی دھیمی آواز میں بولی کہ صرف خضرا ہی سن سکے۔

"وہاں بڑی امی کے پاس رہتے ہیں۔ بڑی امی کے دو بیٹے ہیں۔"

"بڑی امی؟" خضرا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں بڑی امی۔ وہ ابا جی کے خاندان کی ہیں اور ان سے بہت بڑی ہیں۔" چھینا نے بتایا۔ خضرا الجھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ چھینا چولہوں پر چڑھی ہوئی ہانڈیاں باری باری دیکھنے لگی۔ راجاں تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوئی اور ہکلاتی ہوئی بولی۔

"چھینا باجی، چھینا باجی! پانچ بندوں کی روٹی بیٹھک میں جائے گی۔ چودھری صاحب نے بڑی جلدی مچائی ہوئی ہے۔ جلدی کرو باجی۔"

"بس تُو برتن نکال اور لے جا...... اور ہاں، جا کے دیکھ جیراں نے تندوری میں سے روٹیاں نکالی ہیں کہ نہیں۔"

راجاں نے برتن نکال کر چھینا کو دیئے اور خود باہر بھاگی۔

ذرا دیر میں وہ چنگیر میں گرم گرم روٹیوں پر گھی لگانے لگی۔ سارا باورچی خانہ روٹیوں کی مہک اور گھی کی لذیذ خوشبو سے بھر گیا۔

"راجاں کی بچی، مرن جوگی...... تو کہاں مرگئی؟ اندر چودھری صاحب کھانا مانگ رہے ہیں۔ کچھ ہوش ہے تجھے؟" باورچی خانے کے دروازے پر آن کر پھوپھی نے راجاں کو کوسا۔ خضرا نے دیکھا کہ پھوپھی کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی لکھی ہوئی ہے اور وہ بے چینی سے کبھی اندر آتی ہے اور کبھی باہر چلی جاتی ہے۔

چھینا نے پیتل کی چمکتی ہوئی سینی میں کھانے کے برتن رکھے اور راجاں سے بولی۔

''چل راجاں اٹھ، فٹافٹ جا کر پہنچا یہ روٹی بیٹھک میں۔''

راجاں اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اٹھی اور سینی اٹھا کر گرتی پڑتی باورچی خانے سے باہر لپکی۔

جتنی دیر اندر کھانا کھایا جاتا رہا کسی کو بھی چین نہیں آیا۔ سب ہی مستعد، چاق و چوبند اور تعمیل کے لئے تیار کھڑے رہے۔ پھر اندر سے کھانے کے خالی برتن واپس آئے اور قہوہ طلب کیا گیا۔ بھاپ چھوڑتا ہوا سنہری قہوہ اندر بھیجا جا چکا تو حقہ تازہ ہوا۔ جب وہ بھی اندر بھیج دیا گیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ وہ بے چینی، بے کلی اور افراتفری تھوڑی دیر کے لئے ختم ہو گئی۔ چھینا نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

''چلو جان چھوٹی۔ اب تو ابا جی کہیں رات کو فارغ ہوں گے۔''

چھینا کا کہنا درست تھا۔ رات کا کھانا کھائے خاصی دیر ہو گئی تو ایک مرتبہ پھر گھر میں غیر معمولی چہل پہل، بدحواسی اور افراتفری کا سماں پیدا ہوا۔ خضرا اور خرم دم سادھے بیٹھے رہے۔ معلوم ہوا کہ چودھری صاحب زنان خانے میں آ رہے ہیں۔ چھینا دوپٹہ سر پر لپیٹے ہوئے آئی اور خضرا سے بولی۔

''آؤ، بے بے نے بلایا ہے۔ ابا جی کو سلام کر لو۔''

ابا جی کا نام سن کر خضرا کے دل پر ہیبت سی چھا گئی۔ ان سب کی افراتفری دیکھ کر وہ ایک خوف کی علامت سے معلوم ہونے لگے تھے۔ ان کے سامنے جانے سے اسے ایک جھجک سی ہونے لگی لیکن انکار کی مجال نہیں تھی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی اٹھی تو چھینا نے دبی زبان سے کہا۔

''دوپٹے سے سر ڈھک لو۔''

خضرا جلدی جلدی دوپٹہ درست کرتی خرم کے ساتھ پھوپھی کے بڑے کمرے میں پہنچی تو پھوپھی نے انہیں دروازے میں سے دیکھ کر کہا۔

''آؤ خضرا، آؤ بیٹا خرم! اپنے پھوپھا جی کو سلام کرو۔''

خضرا نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی۔ ریشمی دیوان پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شاندار حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے چودھری صاحب بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے۔ کھلی پیشانی،

نفیس مونچھیں اور بے حد تیکھے نقوش والے چودھری صاحب، چودھری سے زیادہ نواب معلوم ہوتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں چھینا سے ہوبہو ملتی تھیں۔ ان میں دیہاتیوں والی کوئی بات نہیں تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ خرم نے بھی اس کی آواز میں آواز ملائی۔

''وعلیکم السلام۔'' چودھری صاحب کی بھاری آواز کمرے میں اس کونے سے دوسرے کونے تک گونج گئی۔

''آ کر پھوپھا جی سے پیار لو ناں۔'' پھوپھی نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

وہ دونوں آگے بڑھے اور ان کی نشست کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دونوں کے سر پر ڈھیلا ڈھالا سا ہاتھ پھیرا اور پھوپھی سے بولے۔

''مختار انہیں یہیں چھوڑ گیا ہے؟''

''ہاں فی الحال تو اس نے یہی کہا ہے کہ وہ خرچہ......'' پھوپھی نے مدھم لہجے میں کہنا چاہا کہ چودھری صاحب نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

''یہ خرچے کا رعب کیا دیتا ہے؟ کہہ دینا اس سے کہ ہم پر یہ احسان نہ کرے۔ اسے پتہ نہیں یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے اور تم نے بھی بغیر سوچے اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا لی۔ لڑکی ذات کا معاملہ ہے کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو جواب بھی تم ہی دینا۔''

''خدا نہ کرے...... اللہ سے خیر مانگیں۔'' پھوپھی نے دہل کر کہا۔

چودھری صاحب پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی رعب اور لاتعلقی سے بولے۔

''بے خبری کے کام میں خیر کا کیا سوال۔ پرائی اولاد پالنا کوئی مخول نہیں ہے۔ ماں باپ بھلائی کریں، برائی کریں انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔''

''بھائی ہے میرا۔ بیچارا مصیبت میں ہے۔ کچھ دن بچوں کو یہاں چھوڑنا چاہتا تھا، میں انکار نہیں کر سکی۔ آخر کو تو خون ہے نا میرا۔'' پھوپھی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا لیکن چودھری صاحب کی بے اعتنائی میں فرق نہیں آیا۔ انہوں نے حقے کا ایک زوردار کش لے کر رعونت سے کہا۔

''ایک پہلے ہی اس نے ویگن ڈرائیوری کر کے اچھی عزت بنائی ہے، اس پر یہ...... خیر

تم جانو اور تمہارا کام۔"

خضرا ان کی باتیں سن اور سمجھ رہی تھی۔ چودھری صاحب کا پُرغرور لہجہ اسے اپنی ہی نگاہوں میں حقیر کر رہا تھا۔ ان کے سامنے پھوپھی اور چھینا بھی یوں خوفزدہ اور اکھڑی اکھڑی سی بیٹھی تھیں جیسے یہ ان کا اپنا گھر نہ ہو، جیسے چودھری صاحب سے ان کا کوئی قربت کا رشتہ نہ ہو۔ وہ ہر لمحہ کسی غلطی کے ہو جانے کے خوف کی اسیر ہوں۔ اور وہ دونوں تو تھے ہی اجنبی۔ گری پڑی شے کی طرح بے قیمت اور بے وقعت۔ وہ نگاہیں جھکائے یوں سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے مجرم ہوں۔ نہ وہاں بیٹھنے کی تاب تھی نہ اٹھنے کا حوصلہ۔

نہ جانے کتنے لمحے یونہی خوف سے پُر اور ذلت سے بھرے ہوئے گزرے پھر چھینا نے ہولے سے خضرا کی قمیض کا دامن چھوا۔ خضرا نے ایک نیچی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ چھینا نے آنکھ سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خضرا بھی سوچ رہی تھی کہ پھوپھی نے مدد کی۔

"جاؤ خضرا، خرم! تم بھی جا کر سو جاؤ۔"

پھوپھی کی بات سنتے ہی وہ دونوں تیزی سے اٹھے اور کمرے کے باہر کھڑی ہوئی چھینا سے جا ملے۔ اس نے خضرا کا ہاتھ تھام لیا اور گہرا سانس لے کر بولی۔

"ہائے اللہ...... ابا جی کے پاس بیٹھ کر تو میری سانس رک جاتی ہے۔ بہت ڈر لگتا ہے۔"

خضرا کو کچھ زیادہ عجیب محسوس نہیں ہوا۔ باپ کو دیکھ کر تو ان کی سانس بھی اٹک جاتی تھی۔ اس کی آواز سن کر تو وہ بھی لرز جاتے تھے۔ یہی سوچ کر وہ چپ رہی کہ شاید سارے ہی باپ ایسے ہوتے ہیں، غصے سے بھرے ہوئے، سخت گیر، رعب ڈالنے والے، محبت سے تہی۔

اس نے جواب نہیں دیا تو چھینا نے قدرے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

"خضرا! تم پریشان نہ ہونا۔ ابا جی کو تو ایسی باتیں کرنے کی عادت ہے۔ انہوں نے کون سا یہاں رہنا ہے۔ سارا سال تو زمینوں پر رہتے ہیں۔ سال چھ مہینے میں کہیں ہفتہ دو ہفتہ کے لئے آ جاتے ہیں۔ تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا، اچھا؟"

چھینا کے لہجے میں جو التفات اور لگاؤ تھا اس نے خضرا کے دکھے ہوئے دل کو آسرا

دے دیا۔ اسے بیگانگی سے بھری ہوئی فضا میں اپنائیت کا احساس ہوا۔ اس نے مدھم لہجے میں چھینا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ پریشان نہیں ہے لیکن یہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش کتنی اوپری اوپری اور ناکام ہے۔ اس کا دل ہزاروں وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور اس کے روئیں روئیں میں بے چینی اور خوف کھب گیا تھا۔ وہ جب اپنے پلنگ پر دراز ہوئی تو اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں نیند سے خالی تھیں۔

●❊●

صبح اپنے ساتھ بے چینی اور افراتفری لے کر طلوع ہوئی۔ چودھری صاحب گھر پر ہی تھے اور صبح صبح انہیں وقت پر ناشتہ پہنچانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ مکئی کی روٹی، مکھن، پراٹھے، کباب، حلوہ پوری، انڈوں کا حلوہ اور نہ معلوم کیا کچھ...... خود پھوپھی بھی باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی اور راجاں کو جھڑکنے اور کوسنے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ چھینا بھی نہ جانے کب اٹھ کر باورچی خانے میں پھوپھی کی مدد کرنے کے لئے چلی گئی تھی۔

خضرا اور خرم اٹھ تو گئے تھے لیکن منہ ہاتھ دھو کر ابھی اپنے کمرے میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی جانب سے ان کی گھبراہٹ میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چودھری صاحب کے رویئے نے اجنبیت کے احساس کو پھر ایک مرتبہ بڑھا دیا تھا اسی لئے ایک بار پھر انہیں ہر دوسرا قدم رکھنے سے پہلے سوچنا پڑتا تھا۔ وہ دونوں بہت دیر تک کمرے میں بیٹھے رہے۔ پھر راجاں کا سانولا چہرہ دروازے میں دکھائی دیا اور اس کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

''خضرا بی بی! آ جاؤ ناشتہ کر لو۔ اپنے ویر کو بھی لے آؤ۔''

خضرا اور خرم ہچکچاتے ہوئے باہر آئے تو دھوپ صحن میں اتر آئی تھی اور باورچی خانے میں داخل ہوئے تو پھوپھی ابھی تک وہاں موجود تھی۔ انہیں دیکھ کر اس نے پیار سے کہا۔

''آ جاؤ پتر! آج تو تمہارے پھوپھا اور ان کے مہمانوں کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی ناشتے میں...... بھوک تو نہیں لگی میرے بچوں کو؟''

چھینا نے بیٹھنے کے لئے پیڑھی آگے بڑھائی۔

''آؤ خضرا! یہاں بیٹھو۔ خرم! تم بھی آ جاؤ۔''

پھوپھی کی اس محبت اور چھینا کے تپاک نے ان کے احساسِ کمتری کو گھٹا دیا۔ انہیں

اندر جا کر بیٹھنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

وہ ابھی ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ باورچی خانے کے دروازے میں سے کسی نے جھانکا اور ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

''تائی السلام علیکم۔''

پھوپھی کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہا...... ہائے زمان...... تو اس وقت کہاں...... تجھے نہیں پتہ اندر تیرے تایا جی آئے ہوئے ہیں؟''

چھینا بھی کچھ پریشانی، کچھ گھبراہٹ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور فوراً ہی بیٹھ گئی۔ خضرا اور خرم بھی کچھ پریشان سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اونچا لمبا، گھنگھریالے بالوں والا خوش شکل نوجوان تھا۔ پھوپھی اور چھینا کی گھبراہٹ اس کے چہرے پر منتقل ہو گئی تھی۔ اس نے بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھا اور غفلت میں بولا۔

''کہاں ہیں تایا جی؟ میں تو ابھی آیا ہوں۔''

''اندر بیٹھک میں بیٹھے ہیں۔ تم اس وقت جاؤ زمان...... جلدی کرو۔'' پھوپھی نے سراسیمگی سے کہا۔

''اچھا اللہ بیلی۔'' اس نے عجلت میں کہا اور غائب ہو گیا۔

پھوپھی کی جیسے جان میں جان آئی۔ چھینا اپنی تھالی کی طرف متوجہ رہی لیکن وہ کھانا برائے نام ہی کھا رہی تھی۔ خضرا کو محسوس ہوا جیسے اس کا چہرہ کچھ بدل سا گیا ہے۔ اس کی شفاف سنہری رنگت میں ہلکا ہلکا گلابی پن جھلکنے لگا ہے۔ وہ بار بار گھنیری پلکوں کو جھپکتی معمول سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اسے حیرت تو ہوئی لیکن وہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔

''دیکھ تو سہی، زمان چلا گیا ہے ناں؟'' پھوپھی نے راجاں سے سرگوشی میں کہا۔ راجاں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

خرم نے بچوں کے سے متجسس لہجے میں پوچھا۔ ''پھوپھی! یہ کون تھا؟''

''شش......'' پھوپھی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے تنبیہ کی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''اپنے پھوپھا جی کے سامنے کہیں اس کا نام نہ لے دینا۔ وہ اسے گولی مار دیں

گے۔"

خضرا سراسیمہ سی ہو گئی۔ اس نے چھینا کی طرف دیکھا، وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھی اور نوالہ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

"کیوں پھوپھی؟" خرم نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

"بس بیٹا......" پھوپھی ایک ایک طویل سانس لیا۔ "تمہارے پھوپھا جی اس کا یہاں آنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے باپ کے ساتھ ان کی دشمنی ہے۔"

"اچھا......؟" خرم کو بڑی حیرت ہوئی۔ "تو پھر یہ یہاں کیوں آیا تھا؟"

"پتر! آپس کی دشمنی سے رشتے ٹوٹ تو نہیں جاتے ناں۔ بس بیچارا نیک ہے، اچھا ہے، ملنے آ جاتا ہے تو ہم اسے منع تو نہیں کر سکتے ناں۔" پھوپھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

بات شاید خرم کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ پھر ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ خضرا نے ایک چور نگاہ سے پھر چھینا کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے بظاہر ناشتہ کرنے میں مصروف تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بار بار بدل جاتے تھے۔ کبھی ایک تابناک مسکراہٹ اس کے چہرے کو جگمگا دیتی اور کبھی اس کی فراخ پیشانی پر تفکرات کی سلوٹیں ابھر آتیں۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی، کسی گہری سوچ میں غلطاں و پیچاں نظر آتی تھی۔

ناشتہ ختم ہو گیا تھا۔ برتن سمیٹ دیئے گئے۔ روزمرہ کے معمولات کا آغاز ہو گیا لیکن چھینا اسی طرح کھوئی کھوئی سی رہی۔ اس کے دلکش چہرے کے تاثرات کبھی خوشی اور کبھی تفکرات میں بدلتے رہے۔ روز کی طرح اس نے بے تحاشہ باتیں بھی نہیں کیں اور ایک بڑی سی چارپائی پر کڑھائی کرنے میں لگی رہی۔ خضرا چھینا کی اس غیر معمولی خاموشی اور تغافل سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بلا مقصد گھومتی رہی۔

دن کے کھانے کی تمام تیاری پھوپھی نے ملازماؤں کے ساتھ مل کر کی۔ چھینا نے باورچی خانے میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ چودھری صاحب کے فلک شگاف قہقہوں کی آواز بیٹھک سے آتی رہی۔ انہیں کھانا بھیجتے ہوئے وہی افراتفری برپا ہوئی اور اندر سے خالی برتن واپس آ گئے۔ جب قہوہ اور حقہ اندر بھیجا جا چکا تو کہیں باقی سب کھانے کے

لئے بیٹھے۔

وہ سارا ہی دن عجیب و غریب اور غیر مانوس تھا۔ گئی رات کو پھوپھا جی زنان خانے میں آئے لیکن خضرا اور خرم کی طلب نہیں ہوئی۔ چھینا بھی صرف سلام کر کے واپس آ گئی اور سب سونے کے لئے بستروں میں چلے گئے۔

خضرا کی ابھی پوری طرح سے آنکھ نہیں لگی تھی کہ کسی نے ہولے ہولے اس کا شانہ اس طرح تھپتھپایا جیسے اسے جگانا مقصود ہو۔ وہ کانپ گئی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ چھینا اپنی چارپائی پر بازو کے سہارے بلند ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"خضرا ادھر آ جا۔" اس نے سرگوشی کی۔

خضرا چند لمحے کچھ نہیں سمجھی۔ چھینا نے دوبارہ اشارے سے اسے اپنی چارپائی پر بلایا تو وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ چھینا نے اسے اپنے برابر لیٹنے کو کہا اور خود اس کے لئے جگہ بنانے کو ایک جانب ہو گئی۔ خضرا نے سوچا شاید اسے ڈر لگ رہا ہے اسی لئے چپ چاپ اس کے برابر لیٹ گئی۔

چھینا نے اس کی جانب کروٹ لی اور اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور بالکل اس کے کان میں بولی۔

"خضرا، خضرا! تُو میری بہن ہے ناں؟"

خضرا نے اس کی گرفت کی مضبوطی میں ایک نیا گداز، ایک اپنائیت محسوس کی اور ہولے سے بڑبڑائی۔

"ہاں باجی!"

چھینا اس کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے اپنے سر کو تکیے پر اس کے قریب لاتے ہوئے رازداری سے بولی۔

"خضرا! اب تو میں اکیلی نہیں ہوں نا۔ تُو میری بہن بھی ہے، میری سہیلی بھی ہے۔ میں تجھ سے اپنے دل کی بات کروں تو تُو کسی کو بتائے گی تو نہیں ...... ہیں، بول۔"

"نہیں باجی ...... بالکل نہیں۔" خضرا نے جلدی سے حامی بھر لی۔

چھینا نے ایک لمبا سانس لیا جس کی آنچ خضرا کو اپنے چہرے پر محسوس ہوئی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"پتہ نہیں تُو میری بات سمجھے گی کہ نہیں..... تُو ابھی چھوٹی ہے نا..... پر تیرے سوا کون ہے جس سے میں اپنے دل کی بات کہوں۔"

"بتاؤ چھینا باجی..... میں سب سمجھ لوں گی۔" خضرا نے ہنکارا بھرا۔

"خضرا! تُو نے زمان کو دیکھا تھا.....؟" اس کے لہجے میں ارمانوں کی کھنک تھی۔

"وہی جو آج صبح آیا تھا؟" خضرا نے پوچھا۔

"ہاں وہی..... ہمارے سوتیلے چاچے کا بیٹا ہے۔ ابا جی کی دشمنی ہے ان کے ساتھ۔ وہ اس کا یہاں آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ اگر ان کا نام بھی لے لو تو زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔" اس نے بتایا اور چند لمحے خاموش رہی۔

مدھم روشنی میں خضرا اس کا چہرہ صاف طور پر تو نہیں دیکھ سکتی تھی جو تکیے پر اس کے برابر تھا لیکن اس کے سانسوں کے زیروبم اور اس کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی مشکل سی بات کہنے والی ہے۔ خضرا سانس روکے اس کی اگلی بات سننے کے لئے متوجہ رہی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر خضرا کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔"

"پھر؟" خضرا نے ہونقوں کی طرح کہا۔

"خضرا..... تُو کسی کو بتائے گی تو نہیں؟" چھینا نے پھر جیسے اطمینان کرنے کے لئے سوال کیا۔

"نہیں چھینا باجی..... بالکل نہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاتی۔" خضرا نے زوردار لہجے میں یقین دلایا۔

چھینا نے سرگوشی کی۔ "وہ گودام میں مجھ سے ملتا ہے۔ آج رات بھی آئے گا۔ پورے ایک بجے۔"

"اچھا....." خضرا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

چھینا بتا رہی تھی۔ "یہ دادا جی کی حویلی ہے۔ پہلے سب اکٹھے رہتے تھے۔ پھر ابا جی کی لڑائی ہوگئی تو انہوں نے چاچا جی کو علیحدہ کر دیا۔ گودام کا دروازہ ان کی طرف کھلتا ہے۔ زمان نے چابی بنوائی ہوئی ہے۔ وہ چھٹی پر آتا ہے تو ہم وہیں ملتے ہیں۔"

"اگر کسی کو پتہ چل گیا تو؟" خضرا نے سراسیمگی سے کہا۔

"پتہ کس کو چلنا ہے..... سب تو سوئے ہوتے ہیں۔ اور ابا جی تو یہاں رہتے ہی نہیں۔" وہ بے خوفی سے کہنے لگی اور اس کا گال تھپتھپا کر بولی۔ "تو آج رات جاگتی رہنا۔ میں تجھے بھی زمان سے ملواؤں گی۔"

خضرا دھک سے رہ گئی۔ "نہیں چھینا باجی! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"لو بھلا..... ڈر کس بات کا؟" چھینا نے بے نیازی سے کہا۔

خضرا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پھوپھا جی کا پُر ہیبت چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اسے چھینا کی دیدہ دلیری پر حیرت ہو رہی تھی۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"خضرا....." چھینا نے خود ہی اسے مخاطب کیا۔ "اگر تُو میری بات نہیں سنے گی تو پھر میں زمان کی باتیں کس کو سناؤں گی؟ میرے اندر یہ سب کچھ کھولتا رہتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی سننے والا ہو تو میں اسے بتاؤں کہ زمان مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے..... وہ میری خاطر آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ وہ میرے لئے ساری دنیا سے ٹکر لے گا۔ وہ کہتا ہے اسے کسی لڑائی، کسی دشمنی کی پرواہ نہیں۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ سارے زمانے کے سامنے مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے..... سچی اور پاک محبت۔" وہ میٹھی میٹھی سرگوشیوں میں زمان کا تذکرہ کر رہی تھی۔

خضرا کے لئے یہ تعلق، یہ جذبہ بہت انوکھا، نیا اور اجنبی تھا۔ لیکن چھینا کے انداز کی گرمجوشی، اشتیاق اور تفاخر نے اسے اس کی گہرائی اور اہمیت سمجھا دی تھی۔ اس نے فلموں، قصے کہانیوں میں بارہا ایسے واقعات دیکھے اور پڑھے تھے۔ چھینا کے روپ میں ان کے کردار اسے جیتے جاگتے اور سانس لیتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ استعجاب آمیز پریشانی سے نیم تاریکی میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کی دبی دبی سرگوشیاں اس کی سماعت میں رس گھولتی رہیں۔

"خضرا! کچھ تو بول....." چھینا نے اس کا سکوت توڑنے کو اس کا شانہ ہلایا۔

"کیا بولوں چھینا باجی؟" خضرا نے سادگی سے پوچھا۔

"کچھ تو بول ناں..... کچھ تو بتا..... کوئی لفظ تو کہہ..... دیکھ خضرا! میں کسی کے ساتھ

اس کی باتیں کرنے کو ترس گئی ہوں۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''میں سن رہی ہوں چھینا باجی!'' خضرا نے مستعدی سے کہا۔

''خضرا! وہ بہت اچھا ہے...... اس جیسا دنیا میں کوئی ایک بھی نہیں ہے۔ میں آج تجھے اس سے ملواؤں گی تو تُو دیکھنا وہ کتنا اچھا ہے۔ اس روز تو تُو نے اچھی طرح نہیں دیکھا نا ناں اس کو۔'' وہ والہانہ لہجے میں اپنی سی کہے جاتی تھی۔

''ہائے باجی! اگر کسی نے دیکھ لیا تو......؟'' خضرا کو پھر گھبراہٹ ہونے لگی۔

''کوئی نہیں دیکھتا...... کسی کو الہام نہیں ہو جائے گا کہ ہم اس سے ملنے گئے ہیں۔'' وہ نڈر لہجے میں بولی اور اپنی رو میں زمان کی باتیں کرنے لگی۔

خضرا بس ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔ پھر چھینا نے اس کا ہاتھ دبایا اور اپنی کلائی کی گھڑی آنکھوں کے سامنے لا کر مدھم آواز میں بولی۔

''شکر ہے ایک بج گیا ہے...... وہ گودام میں آ گیا ہوگا۔''

''ہائے چھینا باجی......'' خضرا کی خوف سے جان نکل گئی۔

''ٹھہرو، پہلے میں اٹھ کی دیکھتی ہوں، کوئی ہے تو نہیں۔'' چھینا نے رازداری سے کہا اور اتنی آہستگی کے ساتھ چارپائی سے اٹھی کہ آہٹ تک نہیں ہوئی۔

خضرا وہیں دبکی رہی۔ چھینا نے پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑا اور احتیاط سے قدم رکھتی ہوئی دروازے تک گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ پھر پلٹی اور پلنگ کے قریب آ کر خضرا کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ خضرا لرز اٹھی۔ اس نے اشارے سے منع کرنے کی کوشش کی لیکن چھینا نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آ......'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

خضرا نہ انکار کر سکتی تھی نہ اقرار۔ چھینا اس کے سر پر کھڑی تھی اور اسے اٹھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے وہ اٹھی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چھینا کے ہمراہ محتاط قدموں سے چلتی گئی۔ کچھ کمرے، کچھ راہداریوں میں سے چوروں کی طرح چلتی وہ ایک دروازے کے سامنے رکی جو بند تھا۔ اس نے ہولے سے دروازہ کھولا اور اندر گھس گئی۔

کمرے میں چھائی ہوئی دبیز تاریکی کچھ بھی نہیں دیکھنے دے رہی تھی۔ گمبھیر خاموشی میں اپنی ہی دھڑکنوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ خضرا نے چھینا کا ہاتھ مضبوطی

سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ چھینا نے آہستگی سے کہا۔

''زمان...... زمان......''

خضرا نے سانس روک لیا۔ چند ہی لمحوں بعد گودام کے ایک دور دراز گوشے سے روشنی کی زردی ایک دائرے کی صورت میں طلوع ہوئی اور وہ دائرہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا ان تک آیا۔ جیسے ہی روشنی ان دونوں پر پڑی، فوراً ہی گل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

''چھینا! تیرے ساتھ کون ہے؟''

چھینا اندازے سے روشنی کی سمت بڑھتے ہوئے بولی۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنا ہی بندہ ہے۔''

روشنی کا دائرہ پھر مٹی کے بڑے سے مٹکے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کی مدھم زرد روشنی میں زمان کا اونچا لمبا سراپا نظر آیا اور اس نے ایک بار پھر پُرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

''چھینا! یہ کون ہے؟''

''یہ میرے مامے کی لڑکی ہے زمان! میری پکی سہیلی بن گئی ہے۔'' چھینا نے بتایا۔

زمان نے روشنی کا دائرہ خضرا کے چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تو چھوٹی ہے۔'' اس کی آواز میں اندیشے تھے۔ خضرا خود میں ہی سمٹ گئی۔

''نہیں نہیں...... یہ کسی کو نہیں بتائے گی۔ یہ میری پکی سہیلی ہے۔'' چھینا نے اس کے اندیشوں کو پہچان کر یقین دلایا۔

''کیوں بی بی...... تُو کسی کو بتائے گی تو نہیں؟'' زمان نے خضرا کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر شفقت سے کہا۔ خضرا کی خوف کے مارے جان نکل رہی تھی۔ کوئی لفظ بولنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے صرف نفی میں گردن ہلا دی۔

''شاباش...... شاباش......'' زمان نے اس کی پشت تھپتھپائی۔

چھینا اور زمان کچھ دیر باتیں کرتے رہے لیکن خضرا کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ وہ اندر ہی اندر اندیشوں سے لرز رہی تھی اور واپس جانے کے لئے بے چین تھی۔ خدا خدا کر کے ان کی گفتگو ختم ہوئی اور چھینا نے واپسی کا ارادہ کیا۔ ہوا میں قدم رکھتی، کوئی

آہٹ پیدا کیے بغیر وہ کمرے میں پہنچیں تو خضرا کی جان میں جان آئی۔ چھینا بے حد خوش تھی۔ وہ ہولے ہولے گنگنا رہی تھی اور شاید ساری رات جاگنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ خضرا کچھ دیر تو اس کی چہکار سنتی رہی۔ پھر اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں نیند سے بھر گئیں۔ چھینا نہ جانے اس کے کان میں کیا کچھ کہتی رہی مگر وہ بہت جلد سو گئی۔

خضرا اب چھینا کی رازدار بن گئی تھی جو ازل کی ترسی ہوئی اور تنہائی کی ماری تھی۔ اس کی پیاس بجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ زمان کی باتیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھیے ہوئے خواب سناتی رہتی تھی۔ وہ مستقبل کے سنہری تانے بانے اپنے روپہلے سپنوں سے بُنتی رہتی تھی۔ خضرا کو بھی رفتہ رفتہ اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے شعور میں وہ حس بڑے غیر محسوس انداز میں بیدار ہو رہی تھی جو چاہنے اور چاہے جانے کی لذت کی خواہاں ہوتی ہے۔ چاہت کے یہ انداز، پیار کی گھاتیں اور عشق کی دیوانگی سبھی کچھ اسے ایک نئی اور نرالی دنیا سے روشناس کرانے لگا۔

اب چھینا زمان سے ملنے جاتی تو خضرا اس کے انتظار میں جاگتی رہتی۔ وہ واپس آتی تو وہ بڑے اشتیاق سے اس کی ساری کہانی سنتی۔ اس کے اپنے اندر بھی کلیاں سی چٹکنے کی صدائیں آتیں۔ کچھ نئے رنگ، کچھ نئے جذبے اور انجانی شبیہیں اس کے من میں بھی سنورنے لگتیں۔ وہ خود سے آگاہ ہوئی اور اپنے آپ کو ایک نئے انداز سے دیکھنے لگی۔ خود کو آئینے میں دیکھنے کا اشتیاق اس کے دل میں بھی چٹکیاں لینے لگا۔ زندگی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ چھینا سے دوستی گہری ہونے لگی۔ اب اسے ماں کی یاد بہت کم آتی۔ باپ تو پہلے بھی کبھی اس کے لیے اتنا اہم نہیں رہا تھا اور اب اسے یاد کرنے کا نہ کوئی جواز تھا نہ موقع۔

ایک روز چھینا اس کے لمبے سیاہ بالوں کو ایک نئے انداز میں گوندھ رہی تھی کہ خرم تیزی سے لڑھکتا ہوا اندر آیا۔

"آپی آپی! ابو آئے ہیں۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔

خضرا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے دل میں اندیشوں نے ہلچل سی مچا دی تھی۔ باپ کی ذات کے ساتھ وابستہ خوف نے اسے سہما دیا، پہلا خیال جو اس کے اندر بگولے کی طرح اٹھا وہ یہی تھا کہ ابھی باپ اسے اس ہنستی بستی رنگین زندگی سے نوچ کر کسی

انجانی سمت چل پڑے گا اور وہ سر جھکائے اس کے ساتھ گھسٹنے پر مجبور ہو گی۔ اس نے اپنے بال چھینا کے ہاتھوں سے چھڑا لیے اور متغیر چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"چھینا باجی! کہیں ابو ہمیں اپنے ساتھ ہی نہ لے جائیں۔"

"لو بھلا، میں تمہیں جانے دوں گی؟" چھینا نے اس کی گردن میں بازو ڈال دیے۔

"نہیں آپی! ہمارا دل یہاں لگ گیا ہے۔ ہم ابو کے ساتھ نہیں جائیں گے۔" خرم نے بھی دخل دیا۔

"چمل شیطان......" چھینا نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "گنگا نہ ہو کہیں کا...... تم لوگ بالکل چپ رہنا، میں سارا معاملہ آپ سنبھال لوں گی۔"

خضرا کو کچھ حوصلہ ہوا لیکن جب وہ بیٹھک میں باپ کے روبرو آئی تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے منمنائی ہوئی آواز میں سلام کیا اور سر جھکائے ہوئے ایک نشست کی طرف بڑھ گئی۔ باپ نے نہ اٹھ کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا نہ حال چال پوچھا۔ اس کی کچھ حیرت تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز خضرا کی سماعت میں گونجی۔

"کڑی تو سیانی ہو گئی ہے۔"

"ماشاءاللہ اچھا قد نکالا ہے۔" پھوپھی کی آواز میں لگاؤ تھا۔

خضرا چور سی بن گئی۔ اس نے نگاہیں فرش پر گاڑ دیں اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ تب تک چھینا بھی اٹھلاتی ہوئی چلی آئی اور اس نے باپ کو ماما کہہ کر سلام کیا۔ باپ نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن وہ کچھ الجھا الجھا اور کھویا کھویا ہوا سا تھا۔ چھینا نے اسے مخاطب کیا۔

"ماما جی! خضرا کے ساتھ میرا بہت دل لگ گیا ہے۔ میں اسے جانے نہیں دوں گی۔"

"ٹھیک ہے دھیئے! یہ تیرے پاس ہی رہے گی۔" باپ نے فوراً ہی آمادگی کا اظہار کر دیا۔

خضرا کا اٹکا ہوا سانس بحال ہوا۔ چھینا نے مسرت سے اس کے گلے میں بازو ڈال دیا اور کھلکھلائی۔ "ماما جی! خضرا کو میں نے پکی سہیلی بنا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے کاکی...... یہ تیری بہن ہے۔ اس کو کھانا پکانا، سینا پرونا بھی تو

سکھا۔ یہ سیانی ہوگئی ہے۔" باپ نے اپنے اکھڑ لہجے سے ہٹ کر بہت مختلف لہجے میں بات کی۔

"چھینا جا! جیراں سے کہہ کوئی روٹی پانی کا بندوبست کرے۔" پھوپھی نے چھینا سے کہا۔ خضرا بھی موقع دیکھ کر چھینا کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ خرم ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ وہ کچھ اداس تھا اور نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ چھینا نے ان دونوں کے گرد بازو حمائل کر کے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔"

ان دونوں کو بھی لمحے بھر کے لئے رہائی کا احساس ہوا۔ چھینا کی ہنسی میں وہ بھی شریک ہو گئے۔ چھینا انہیں چھوڑ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ خرم بھی کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ خضرا چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ نہ جانے کیوں اس کے اندر ایک دل دکھا دینے والا احساسِ محرومی جاگ اٹھا۔ باپ کے ساتھ ہی ماں کی یاد نہ جانے کہاں سے امنڈ آئی تھی۔ اس کا ننھا سا دل اپنے آنگن اپنے گھر کی تڑپ سے بھر گیا۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کی طلب نے اس کی پیاس بڑھا دی۔ وہ یکدم اداسی کی گہری کیفیت میں ڈوبتی چلی گئی۔

"لڑکی سیانی ہوگئی ہے آپا! میں تو اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" اسے باپ کی آواز نے چونکایا۔

غیر ارادی طور پر وہ محتاط قدم رکھتی کھڑکی کے قریب آ گئی۔ جہاں سے اندر ہونے والی گفتگو صاف سنائی دیتی تھی۔

"بالڑی ہے ابھی مختارا! یوں ہی جلدی قد نکال لیا ہے اس نے۔" پھوپھی نے کہا۔

"پھر بھی آپا! اس کی کپی ماں کی وجہ سے ڈرتا ہوں۔ جب تک یہ اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی، میں سکھ کا سانس نہیں لے سکتا۔" باپ نے تشویش سے کہا۔

"خضرا بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی لیکن پہلے تُو اپنی تو کچھ فکر کر۔ اس کلموہی کو لکھت دے اور اپنا گھر آباد کر۔ لڑکی تیرے اپنے گھر سے بیاہی جائے تو اسی میں عزت ہے۔ لوگ یونہی تو انگ ساکھ نہیں دیتے ناں۔ گھر بار، ماں باپ سب کے بارے میں پوچھتے ہیں۔" پھوپھی نے جہاں دیدہ لہجے میں کہا۔

"آپا تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو۔ جوان لڑکی کے ہوتے ہوئے میں بیاہ رچاتا اچھا لگتا ہوں؟" باپ نے تلخی سے کہا۔

"تو کیا تُو ساری عمر یونہی لنڈورا پھرتا رہے گا؟ وہ حرافہ تو عیش کرے اور تُو بسوں کے اڈے پر سوئے اور ہوٹلوں کے کھانے کھائے۔ نہیں مکھو میں تجھے اس طرح برباد نہیں دیکھ سکتی۔ تیرا کوئی گھر ٹھکانہ بنے تو بچے بھی سکھ کا سانس لیں۔ تُو بس اب تیاری کر۔ اللہ کوئی نہ کوئی سر بند کر دے گا، کسی نیک کو متھے لگائے گا۔"

پھوپھی نے جتنے لفظ کہے وہ آوازوں کا ایک شور سا بن کر خضرا کے سارے وجود پر چھا گئے۔ اسے پھوپھی کے لفظوں کے لاوے میں اپنا کھویا ہوا گھر، اپنے سارے خواب، ماں کی محبت اور اس سے ملنے کی آس سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہتا ہوا نظر آیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خم آنے لگا۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ اسے شدید گھٹن اور حبس کا احساس ہوا۔ اس نے خوفزدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ خضرا نے سر جھٹکا اور خود کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے بولی۔

"نہیں، کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔"

باپ اسی شام واپس چلا گیا لیکن خضرا کو ایک نئی الجھن کے سپرد کر گیا۔ اس کی رگ رگ میں ایک انجانا سا خوف بس گیا۔ ماں سے ملنے کی جو ایک آس تھی وہ بھی اندیشوں کی نظر ہو گئی۔ ماں اور باپ کے درمیان بندھی ہوئی کچی ڈوری کے چٹ سے ٹوٹ جانے کی تلوار ہر وقت اس کے سر پر لٹکتی رہتی۔ اس کا جی چاہتا کہ ماں کو خط ہی لکھ دے۔ اسے بتائے تو سہی کہ زندگی میں کیسا طوفان آنے والا ہے۔ گھروندے کی جو دیواریں سلامت ہیں وہ بھی ڈھے جانے والی ہیں۔ لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اسے ماں کے رویے کی بھی خبر تھی۔ اسے کوئی لمحہ بھی تو ایسا یاد نہیں تھا جب اس نے ہنستے چہرے کے ساتھ کبھی باپ کا استقبال کیا ہو یا کبھی نرمی اور خوشی کی ساعت دونوں کی موجودگی میں برقرار رہی ہو۔ دونوں کے درمیان وقت ہمیشہ تنی ہوئی ڈور ہی بنا رہتا تھا۔ لمحے انگاروں کی طرح سلگتے تھے۔ اسے اس کا اندازہ تھا کہ ماں کے لئے یہ خبر نجات کی نوید ہو گی۔ وہ نہ اس کو روکے گی نہ بچاؤ کی تدبیر کرے گی۔ وہ نہ ان کے جذبوں سے سوچے گی نہ اسے ان کی محرومیوں کی کوئی پرواہ ہو گی۔ ماں اور باپ دونوں یہ ننھا سا گھروندا توڑتے ہوئے

ایک چھوٹے سے لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچیں گے کہ اس میں کوئی اور بھی رہتا ہے۔

✿......✿

خضرا چند روز بہت پریشان رہی۔ اس کا دل اچاٹ اور من اکتایا ہوا سا رہا۔ وہ اندر ہی اندر کسی رلا دینے والی خبر کا انتظار کرتی رہی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ باپ لوٹ کر نہیں آیا اور ماں کی جانب سے تو پہلے ہی نہ کوئی اطلاع تھی نہ خبر۔ رفتہ رفتہ اس کی بے چینی اور تشویش کم ہو گئی۔ وہ روزمرہ معمول میں پھر مکمل مل گئی۔ چھینا کی میٹھی باتوں نے اسے پھر خود میں جذب کر لیا۔ شب و روز میں وہی شیریں نغمے اور محبت کے زمزمے گونجنے لگے۔ زمان سے چھپ چھپ کر ملنے کی لذت میں وہ بھی شریک ہو گئی اور چھینا کی رازداں بن کر اس پر بیتنے والی پیار کی نرم گرم شیریں وارداتوں کو خود پر بیتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس کا شعور وقت سے پہلے پختگی کی منزل طے کر گیا اور اس کے دل میں آرزوؤں کی منہ بند کلیاں چٹکنے لگیں۔ ننھی منی تمنائیں پھلنے پھولنے لگیں۔ اسے بھی زمان جیسے کسی چاہنے والے کی طلب ہونے لگی جس سے وہ چھینا کی طرح چھپ چھپ کر مل سکے، اس کے لئے ساری دنیا سے ٹکر لے اور اس کی خاطر آسمان سے تارے توڑ کر لے آئے۔

ایک رات وہ بستر پر آنکھیں کھولے لیٹی تھی، چھینا تھوڑی دیر بعد اس کے برابر سے اٹھ کر زمان سے ملنے گودام کی طرف گئی تھی اور وہ تصور ہی تصور میں چاہت کے اس لمحے کو مجسم دیکھ رہی تھی جس میں چھینا اور زمان سانس لے رہے تھے۔ اچانک دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ خضرا کے خیالات کے سنہری تانے بانے بکھر کر رہ گئے۔ وہ چونک کر بستر میں اٹھ بیٹھی۔ یہ سوچ کر ہی وہ ہول گئی کہ اس دستک نے سارے گھر کو جگا دیا ہے اور چھینا اپنے بستر پر نہیں تھی۔ اسے چاروں طرف قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

ڈیوڑھی اور مردان خانہ فاصلے فاصلے پر تھے لیکن رات کی خاموشی میں خضرا کو دروازہ کھلنے کی آواز صاف سنائی دی۔ اس کی ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ اس نے اسی جانب کان لگا دیئے اور اس کی سماعت میں جو آواز اتری اس نے اس کی جان ہی نکال دی۔ چودھری صاحب آدھی رات کو نہ جانے کہاں سے آن ٹپکے تھے۔ خوف کے مارے خضرا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ اس طرف چلے آئے تو وہ انہیں کیا جواب دے گی۔

چھینا کے بارے میں کیا بتائے گی کہ وہ کہاں ہے...... یہ سوچ کر ہی اسے ٹھنڈے پسینے آ گئے کہ وہ کون سا بہانہ بنائے گی؟ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

چودھری صاحب کے باتیں کرنے کی آواز لحظہ لحظہ قریب ہونے لگی۔ ان کی دیسی جوتی کی مخصوص آہٹ اسی جانب بڑھتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وہ تو زنان خانے کی طرف بہت کم آتے تھے۔ آج وہ رات کے پچھلے پہر اس طرف کیوں چلے آئے تھے؟ خضرا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس میں اتنا دم بھی نہیں تھا کہ دوڑ کر چھینا کو گودام میں خبر ہی کر دیتی۔ اس کے حواس مختل ہو چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا، اس نے جلدی سے خود کو سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹ لیا اور سوتی ہوئی بن گئی۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے اس نے خود کو سارے ماحول سے علیحدہ کر لینا چاہا لیکن اس کی ساری حسیں بیدار ہو گئیں اور اس کے ذہن کی ڈوری ان آہٹوں سے بندھ گئی جو اسی کمرے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ پھر دروازہ کھلا۔

"چھینا کہاں ہے؟" چودھری صاحب کی گمبھیر آواز نے پوچھا۔

خضرا کے تن بدن میں کپکپی چھوٹ گئی۔ وہ ساری کی ساری پسینے میں نہا گئی۔ اس نے سانس روک لیا اور اسی طرح یوں بے حس و حرکت پڑی رہی جیسے کوئی لاش ہو۔

"ہا...... ہائے ابا جی آپ...... السلام علیکم......" چھینا کی آواز سنائی دی۔

"تُو کہاں تھی؟" سوال کا انداز چبھتا ہوا تھا۔

"ابا جی غسل خانے میں تھی۔" چھینا نے عجلت میں جواب دیا۔

چودھری صاحب کی سن کر دینے والی "ہوں" سنائی دی پھر خوف سے لبریز سناٹے میں ان کے قدموں کی دھمک دور چلی گئی۔ لیکن خضرا کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ چند ہی لمحوں بعد کسی نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

پھر چھینا اس کے برابر پلنگ پر دراز ہوئی، لرزتی ہوئی آواز میں اس کے کان میں بولی۔

"ہائے خضرا! ابا جی آ گئے تھے۔"

خضرا نے ڈرتے ڈرتے چادر سے چہرہ باہر نکالا جو تمام کا تمام پسینے سے بھیگ رہا تھا اور گہرا سانس لے کر بولی۔ "ہائے چھینا باجی! میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔"

"اللہ کا شکر ہے خبر ہو گئی۔" چھینا نے اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی

ابا جی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زمان دوڑ کر واپس چلا گیا اور میں فا فٹ غسل خانے میں گھس گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں دوڑ کر کمرے میں آئی تو ابا جی کو پتہ چل جائے گا۔''

''چھینا باجی! اب جتنے دن پھوپھا جی یہاں ہیں، زمان بھائی سے ملنے نہ جانا۔'' خضرا نے گزرے ہوئے ہولناک وقت کے تصور سے لرزتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... کچھ احتیاط کرنی پڑے گی۔'' چھینا کسی گہری سوچ میں کھوئی کھوئی سی بولی۔ چند لمحے یونہی کچھ سوچتی رہی پھر اس کو اپنے ساتھ لگا کر ارمان بھرے لہجے میں بولی۔

''لیکن اس کے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا۔''

صبح گھر میں پھر وہی افراتفری اور بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ نوکر بھاگتے دوڑتے پھرتے تھے اور باورچی خانے میں ایسی ریل پیل تھی جیسے کسی بڑی دعوت کا اہتمام ہو۔ چھینا بھی صبح سویرے ہی اٹھ کر پھوپھی کا ہاتھ بٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ خضرا اور خرم اپنے کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ جس وقت پھوپھی نے انہیں ناشتے کے لئے بلایا تو دھوپ سے سارا آنگن بھرا ہوا تھا۔ وہ اوپرے اوپرے قدموں سے باورچی خانے میں پہنچے تو بکھرے ہوئے برتنوں سے راستہ تلاش کرنا دشوار تھا۔ پھوپھی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''آؤ پتر..... آج تو ناشتے میں بہت دیر ہوگئی۔ میرے بچوں کو بھوک لگی ہوگی۔''

پھوپھی کی محبت کی حدت نے انہیں تھام لیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔

''تمہارے پھوپھا جی رات کو آگئے تھے۔ تم دونوں سو رہے تھے۔ اب انہیں جا کر سلام کرنا۔ کہیں وہ یہ نہ کہیں کہ بچوں کو بڑوں کے ادب کا لحاظ ہی نہیں۔ خضرا اور خرم! سنا تم نے؟'' پھوپھی نے تاکیداً کہا۔

خضرا کا نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ اس نے چھینا کی طرف دیکھا۔

''باجی! تم بھی چلنا۔''

''ہاں چھینا..... تُو بھی جانا۔ تیرے ابا جی کو گلہ ہی رہتا ہے کہ تُو کبھی ان کے پاس نہیں بیٹھتی۔'' چھینا کو پھوپھی نے بھی تاکید کی۔

''بس بے بے..... ابا جی سے ڈر لگتا ہے۔'' چھینا نے نوالہ نگلتے ہوئے کہا۔

''جھلی نہ ہو تو کہیں کی۔ وہ تجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور تجھے ڈر لگتا ہے۔ رات بھی آتے ہی سب سے پہلے تیرے کمرے میں جا کر تجھے دیکھا۔'' پھوپھی نے محبت آمیز

خفگی سے کہا۔

خضرا کی آنکھوں میں رات کا منظر پھر گیا۔ چھینا کا رنگ بھی بدل گیا۔ وہ اپنی تھالی پر جھک گئی۔ پھوپھی اسے سمجھانے لگی کہ چودھری صاحب کتنے غصے والے ہیں، بڑے بڑے ان سے کانپتے ہیں لیکن وہ اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ ناشتہ ختم ہوا تو پھوپھی نے ایک مرتبہ پھر انہیں تاکید کی کہ وہ سب سے پہلے چودھری صاحب کو سلام کرنے جائیں۔''

وہ ڈرتے، جھجکتے، مؤدب انداز میں چودھری صاحب کی بیٹھک کی طرف چلے۔ وہ ابھی راہداری میں ہی تھے کہ برابر کی بیٹھک سے ایک گٹھے ہوئے جسم والا پختہ عمر شخص باہر آیا۔

''سلام چاچا جی! آپ کب آئے؟'' چھینا نے رک کر اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام..... کیا حال ہے کاکی؟'' اس نے چھینا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کی نگاہیں خضرا پر مرکوز ہوئیں۔ ''یہ کون ہے؟''

''میرے مامے کی لڑکی ہے چاچا جی..... چھٹیاں گزارنے یہاں آئی ہے۔ یہ اس کا بھائی خرم ہے۔'' چھینا نے بتایا۔

''اچھا اچھا.....'' انہوں نے دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا پھر خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور خضرا کے سر پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر بھوری مونچھوں میں سے مسکرائے۔

''کیا نام ہے تیرا کاکی؟''

''اس کا نام خضرا ہے چاچا جی.....'' چھینا نے فوراً جواب دیا۔

''اچھا اچھا..... شاباش!'' ان کا بھاری ہاتھ اس کے سر سے اس کی پشت پر اتر آیا۔ خضرا سمٹ سی گئی۔

''چل چھینا، اچھا ہے تجھے سہیلی مل گئی۔'' ان کا ہاتھ اس کی پشت پر بوجھ سا بن گیا۔

''ہاں چاچا جی..... یہ میری بہن بھی ہے اور سہیلی بھی۔'' چھینا نے گرمجوشی سے کہا۔

''اچھا اچھا..... شاباش شاباش.....'' انہوں نے گمبھیر آواز میں انہی الفاظ کو بار بار دہرایا۔

''ابا جی بیٹھک میں ہی ہیں؟'' چھینا نے پوچھا۔

"ہاں بیٹھے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا تو وہ تینوں آگے بڑھ آئے۔

چودھری صاحب حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے کاغذات کے ایک پلندے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ان تینوں نے ایک ہی سُر میں ڈرتے ڈرتے سلام کیا تو انہوں نے آنکھ اٹھا کر ترچھی نگاہ سے ان کی طرف دیکھا۔

"وعلیکم السلام......" انہوں نے بھاری آواز میں جواب دیا اور پھر کاغذات کے مطالعے میں محو ہو گئے۔

خضرا اور خرم تو پہلے ہی کچھ سہمے ہوئے تھے، چھینا کو بھی کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ کافی دیر بعد چودھری صاحب کو احساس ہوا کہ وہ تینوں ابھی تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا جس سے ان کا گھنا ابرو ان کی فراخ پیشانی اچک کر دور تک چلا گیا۔

"کیا بات ہے...... کوئی کام ہے؟" انہوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ابا جی! ہم تو بس آپ کو سلام کرنے آئے تھے۔" چھینا نے جلدی سے کہا۔

"اچھا......" انہوں نے سر ہلایا۔ "کیا حال ہے تم دونوں کا؟" انہوں نے خضرا اور خرم سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے جی۔" انہوں نے مستعدی سے جواب دیا۔

"خوش ہو یہاں پر؟" انہوں نے سوال کیا۔

"جی......" دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا

"تم نے کبھی گاؤں دیکھا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں......" وہ میکانکی انداز میں پھر ایک ساتھ بولے۔

"میں لے چلوں گا تمہیں گاؤں اچھا۔ تیار رہنا۔" انہوں نے اپنے مخصوص دبنگ لہجے میں کہا۔

ان تینوں کو بھی خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ چھینا چپ نہ رہ سکی۔ "سچی ابا جی؟"

"ہاں......" وہ بولے۔ "اچھا اب جاؤ میں ذرا یہ کام نمٹا لوں۔"

وہ تینوں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک تحیر کے عالم میں کمرے سے باہر نکل آئے۔

رات کو چھینا خضرا کے ساتھ بستر پر دراز ہوئی تو چھینا نے سر کے نیچے دونوں ہتھیلیاں رکھتے ہوئے کہا۔ "نیند نہیں آ رہی۔"

"کیوں چھینا باجی؟" خضرا نے بھولپن سے پوچھا۔

"خضرا تجھے کیا پتہ کہ نیند کیوں نہیں آتی۔" وہ دور خلاؤں میں تکتے ہوئے بولی۔

"کیا......؟" اس نے ہونقوں کی طرح کہا۔

"ابا جی یہاں ہیں...... ڈر لگتا ہے، زمان سے کس طرح ملنے جاؤں؟" چھینا نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"ہائے چھینا باجی...... ناں......" خضرا نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "پھوپھا جی کو پتہ چل جائے گا۔"

"ہاں...... آج تو نہیں لیکن گاؤں جانے سے پہلے اس سے ملنا ہے ناں...... پھر تو اس کی چھٹیاں ختم ہو جائیں گی۔" چھینا نے قطعی انداز میں کہا۔

"مگر کیسے چھینا باجی......؟" خضرا نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو کوئی داؤ تو لگانا پڑے گا......" وہ پُر خیال لہجے میں بولی۔

مگر دو دن گزر گئے اور چھینا کا داؤ نہیں لگ سکا۔ گاؤں جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھوپھی نوکروں کو ہدایات دینے لگیں اور چھینا کی بے کلی میں لحہ لحہ اضافہ ہونے لگا۔ وہ پریشانی میں کبھی کوئی کام بگاڑتی، کبھی کچھ بھول جاتی اور کبھی کسی سے لڑ پڑتی۔ یہاں تک کہ جانے کا وقت ہو چلا تو چھینا نے خضرا کو گودام کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ خضرا یہ سوچ کر لرز گئی کہ چھینا زمان سے ملنے کے لئے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں بڑا واضح انکار، بڑی نمایاں دھمکی اور گہری خفگی کا اظہار ہونے لگا۔ خضرا کو چھینا بہنوں کی طرح سے عزیز ہو گئی تھی۔ وہ اسے خفا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ اس کے قریب چلی آئی۔ چھینا بے حد پریشان سی ہو رہی تھی۔

"خضرا پتہ نہیں گاؤں سے کب واپس آنا ہو۔ میں زمان سے ایک بار تو مل لوں۔"

"ہائے چھینا باجی ایسے نہ کرنا۔" خضرا کا رنگ فق ہو گیا۔

"تُو میری بہن ہے ناں...... ذرا دھیان رکھنا، بس میں دو منٹ میں گئی اور آئی۔"

چھینا نے تیزی سے کہا۔

"نہیں چھینا باجی، نہ...... کسی نے پوچھ لیا تو میں کیا کہوں گی؟" خضرا نے گھبرا کر کہا۔

"کہہ دینا میں غسل خانے میں ہوں۔" وہ بے نیازی سے کہنے لگی۔ خضرا اسے روکتی ہی رہ گئی لیکن وہ یوں دلیری سے آگے بڑھ گئی جیسے کسی کشش کی اسیر ہو، جیسے کسی سحر میں گرفتار ہو۔ خضرا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

خوف سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... وہ اتنی ہوشیار نہیں تھی کہ اس قسم کی صورتحال کا مقابلہ کر سکتی۔ اس کا جی چاہا کہ کہیں جا کر چھپ رہے جہاں کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔ کوئی اس سے چھینا کے بارے میں سوال نہ کرے۔ ایک ایک لمحہ گزارنا قیامت ہو گیا...... ایک ایک گھڑی امتحان کی گھڑی بن گئی۔ وہ اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ لرزتی کانپتی کبھی ایک طرف جاتی تو کبھی دوسری طرف۔

اچانک راہداری کی جانب سے چودھری صاحب کی آواز سنائی دی۔

"راجاں...... راجاں کہے کہے چلو۔ گاڑی میں چل کر سامان رکھو۔ جلدی کرو۔"

خضرا کی جان نکل گئی۔ پھوپھی بھی دوڑی ہوئی آئی۔ "چھینا، چھینا...... او خضرا، چلو تیاری کرو۔ یہ چھینا کدھر ہے؟ کیا کر رہی ہے؟"

خضرا کا حلق خشک ہو گیا۔ "چھینا باجی غسل خانے میں ہے۔" اس نے بمشکل یہ چند الفاظ اگلے۔

"اچھا...... اس سے کہہ کہ جلدی تیار ہو جائے۔ تُو بھی چادر لے لے میں گودام میں تالے ڈال کر آتی ہوں۔" پھوپھی نے افراتفری میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

خضرا کی جان پہ بن گئی۔ غیر ارادی طور پر وہ پھوپھی کے پیچھے لپکی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی۔

"پھوپھی جی...... پھوپھی جی...... چھینا باجی نے گودام سے کچھ نکالنا ہے۔ ابھی اس کو تالا نہ لگائیں۔"

پھوپھی نے عجلت میں اس کی بات پر غور نہیں کیا اور ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "یہ چھینا بھی بہت تلی ہے عین وقت پر اسے چیزیں رکھنی یاد آتی ہیں۔ ادھر تیرے پھوپھا جی

نے جلدی مچائی ہوئی ہے۔ کھڑکا جا کر غسل خانے کا دروازہ...... اسے کہہ کہ جلدی نکلے۔"

پھوپھی کے آگے بڑھتے ہی خضرا گرتی پڑتی گودام کی طرف دوڑی۔ اس کا رواں رواں خوف میں ڈوبا جاتا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔

"چھینا باجی...... چھینا باجی......" وہ دبی آواز میں پکارتی نیم تاریک گودام میں گھس گئی۔

چھینا اناج کے ایک بڑے مٹکے کے پیچھے سے اس کی طرف لپکی۔

"کیا بات ہے......؟"

"چھینا باجی! پھوپھا جی چل رہے ہیں...... جلدی کرو۔" اس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا اور تقریباً رو پڑی۔

"اچھا بس ایک منٹ۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر جلدی سے پھر اسی مٹکے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ زمان کے ساتھ کچھ دیر اس کی کھسر پھسر سنائی دیتی رہی پھر وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی خضرا کے ساتھ گودام سے باہر آ گئی۔

خضرا کے لئے بند پردوں والی کار کا سفر ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ خود چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور چودھری صاحب کی اگلی سیٹ پر موجودگی نے ساری گاڑی میں ایک گہرا اور گمبھیر سناٹا طاری کر دیا تھا۔ خرم بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ چھینا کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی ان میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگتی۔ پھوپھی بھی کبھی ان سے پوچھ لیتی کہ وہ گھبرائے گی تو نہیں؟ جس کا جواب وہ سر کی خفیف سی جنبش سے دے دیتی۔

انہیں سفر کرتے خاصی دیر ہو گئی تو پھوپھی نے کھانے کی ٹوکری نکالی اور انہیں انڈا پراٹھا اور باجرے کی میٹھی روٹیاں کھانے کے لئے دیں۔ چھینا نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تو پھوپھی کو تشویش ہوئی۔

"کیوں چھینا...... تیرا جی تو اچھا ہے؟"

"ہاں بے بے...... میں ٹھیک ہوں...... بس دل کچھ کچا کچا سا ہو رہا ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا

"اچھا تو یہ گولی منہ میں رکھ لے...... طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" پھوپھی نے اسے ایک کھٹی میٹھی ٹکیہ اپنے پرس میں سے نکال کر دی۔

خرم انڈا اور پراٹھا کھانے لگا خضرا باجرے کی میٹھی روٹی کا ایک ٹکڑا بسکٹ کی طرح کھانے لگی۔ بند کار میں یہ طویل سفر اکتا دینے والا تھا۔ چودھری صاحب کی موجودگی کچھ کہنے بھی نہیں دیتی تھی۔ خاموشی اور چپ بیزار کرنے لگی۔

ونڈ اسکرین میں سے سامنے کے منظر ان کی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ ناہموار کچے راستوں پر دوڑتی بھاگتی گاڑیاں دھول اُڑا رہی تھیں۔ کہیں کہیں منظر بدل بھی جاتا تھا لیکن بہت تھوڑے سے عرصے کے لئے۔ کہیں خانہ بدوشوں کی بستی نظر آتی، کہیں بھیڑوں اور مویشیوں کے ریوڑ اور گلے، چھوٹی چھوٹی بستیوں کے کچے مکان، بکھری ہوئی قبریں اور رنگ برنگے جھنڈوں سے سجی ہوئی خانقاہیں۔

اچانک ایک موڑ پر شادیانے بجاتی ہوئی بارات ایک تنگ سی بل کھاتی پگڈنڈی پر سے اوپر سڑک پر چڑھ آئی۔ انہیں شاید یہ سڑک پار کر کے دور کھیتوں کے درمیان نظر آنے والی چھوٹی سی پگڈنڈی پر جانا تھا۔ سجی سجائی گھوڑی پر سوار سہرا باندھے دولہا، اُجلے لباسوں اور اونچے شملوں والے باراتی، رنگ برنگ چمکیلے کپڑوں میں بنی سنوری عورتیں اور خوش و خرم بچے، ڈھول، شہنائیاں اور تاشے۔ ساری فضا میں ایک گدگدا دینے والی چہل پہل اور نغمگی بکھر گئی۔ ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے گاڑی بالآخر روک دینی پڑی۔

نوجوانوں کی ٹولیاں دولہا کی گھوڑی کو گھیرے مسرت و شادمانی سے بھنگڑا ناچ رہی تھیں جس سے خوشی کی ایک لہر اس کے ساتھ ساتھ رقص کر رہی تھی۔

چھینا نے خضرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بارات کو اشتیاق سے دیکھتی ہوئی خضرا نے چھینا کی طرف دیکھا۔ اس کی دلربا آنکھوں میں ایک انوکھی چمک ناچ رہی تھی۔ خضرا نے اس کی بولتی ہوئی آنکھوں کا مفہوم سمجھ لیا۔ اسے اونچا لمبا خوبرو زمان دولہا بنا زیورات سے لدی ہوئی گھوڑی پر بیٹھا نظر آنے لگا۔ اسے چھینا کی فراخ پیشانی جھومر ٹیکے سے سجی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ چھینا کی آنکھوں میں چمکتا ہوا یہ خواب حقیقت بن جائے۔ وہ سب کے سب اشتیاق سے بارات کو دیکھ رہے تھے۔

"اوئے ہارن بجا کہ یہ جلدی پار ہوں اُلّو کے پٹھے۔ ساری سڑک روک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔"

چودھری صاحب کی غصے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

سارا طلسم بکھر گیا۔ ڈرائیور مسلسل ہارن بجانے لگا۔ باراتیوں نے مڑ مڑ کر دیکھا اور اپنے قدموں کو تیز کرتے ہوئے سڑک پار کر گئے۔ گاڑی اس رونق میلے کو پیچھے چھوڑتی دھول اڑاتی سڑکوں پر فراٹے بھرنے لگی۔

ایک بار پھر بیزار کر دینے والا سناٹا گاڑی کے اندر بھر گیا۔ خضرا کا دم الجھنے لگا۔ خاموش نہ رہ سکی اور مدھم لہجے میں پھوپھی سے پوچھنے لگی۔

"پھوپھی جی! گاؤں کب آئے گا؟"

"بس دھیئے...... تھوڑا ہی فاصلہ ہے۔" پھوپھی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

یہ تھوڑا فاصلہ بھی طے ہوتے ہوتے گھنٹہ بھر ہو گیا۔ اکتاہٹ، سناٹے اور گرد سفر انہیں تھکاوٹ سے چور کر دیا۔ گاڑی کچے راستے کو چھوڑتی ایک پکے راستے پر چڑھی پر بجری بچھا دی گئی تھی اور ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گئی جو ایک قلعہ نما حو احاطہ تھا۔

"شکر ہے حویلی آ گئی۔" چھینا نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

خضرا اور خرم کو بھی اطمینان ہوا۔ لمبا اور اکتا دینے والا سفر تمام ہو گیا تھا۔ گاڑی احاطہ طے کرتی حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے رک گئی۔ ایک ملازم نے دو دروازہ کھولا۔ خضرا ان سب کے ساتھ گاڑی سے اتری اور کھلے کھلے آنکھوں اور او اونچے دالانوں والی حویلی میں داخل ہو گئی۔

ملازمائیں دوڑ دوڑ کر ان کی پذیرائی کرنے لگیں۔ کسی نے منہ دھلوایا، کوئی کپڑ نکالنے لگی اور کچھ نے دستر خوان بچھا دیا۔ دیسی گھی میں پکے ہوئے کھانے اور موٹی تندور کی روٹیاں کھانی بہت مشکل معلوم ہونے لگیں۔ پھوپھی بار بار انہیں پیٹ بھ کھانے کی تلقین کرنے لگیں۔

حویلی کی زندگی بہت مختلف اور اجنبی تھی۔ اونچی اونچی دیواروں کے درمیان معلوم ہوتا تھا جیسے سارے جہان سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ جیسے باہر کی دنیا سے کوئی ہی نہیں رہا۔ شروع شروع میں خضرا کا دل بالکل نہیں لگا۔ تمام دن نہ کوئی کام

مصروفیت۔ تمام دن بیکاری کی نذر ہو جاتا۔ گاؤں کی عورتیں پھوپھی سے ملنے آ جاتیں تو ان کی رنگ رنگ کی بولیوں میں کچھ وقت سہولت سے گزر جاتا۔ زنان خانے کے پچھواڑے باغ میں پڑے ہوئے جھولے جھولنے اور جھولانے والیوں کے گیت سننے اور ان کے ہنسی مذاق میں کچھ ہلچل کا احساس ہوتا مگر دل پھر بھی نہیں لگتا تھا۔

وہ کئی بار چھینا سے پوچھتی کہ وہ کب واپس جائیں گے۔ لیکن چھینا کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھوپھی کہتی تھی کہ جب چودھری صاحب کا جی چاہے گا تو وہ واپسی کا ارادہ کر لیں گے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کب کریں گے۔ نہ ان سے کوئی استفسار کر سکتا تھا نہ کوئی سوال۔ خود پھوپھی ان سے دبی ہوئی سی رہتی تھی۔ اس لئے کوئی بھی صحیح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

چھینا کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ سوز فراق نے اس کے اندر جو دھیمی دھیمی سی آنچ سلگا دی تھی اس نے اسے دنوں میں مرجھا دیا تھا۔ وہ خضرا سے زمان کی باتیں کرتی نہیں تھکتی تھی لیکن اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بیتابیوں کو قرار نہیں آتا تھا۔ خضرا کی بیزاریوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ چھینا کی طبیعت کی پژمردگی اس پر بھی چھانے لگی تھی۔

وہ صبح اٹھتی تو دن اسے ذرا بھی اچھا نہ لگتا۔ حویلی کی نامانوس فضا بھاری بوجھ کی طرح ہر وقت ذہن پر سوار رہتی۔ وہ خود کو بہلانے، اپنا دل لگانے کے سوجتن کرتی لیکن حویلی کے اندر وقت اتنی سست روی سے چلتا تھا کہ دن کے آخر ہوتے ہوتے جیسے صدیاں بیت جاتی تھیں۔

ایک صبح وہ حویلی کے باغ میں موتیے کے پھول چن رہی تھی کہ اچانک کسی جانب سے گھوڑے کی خوفناک ہنہناہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی چمن کی اونچی باڑ پھلانگتا ہوا ایک گھڑ سوار باغ میں داخل ہوا۔ خضرا کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی چنگیر جس میں وہ پھول جمع کر رہی تھی اس کی گرفت سے نکل گئی اور سارے پھول زمین پر بکھر گئے۔ گھڑ سوار گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے قریب آیا اور بہت غور سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"کون ہو تم؟"

خضرا کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ بس سہمی ہوئی نگاہوں سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی۔ وہ گھوڑے سے اترا اور اس کی باگ پکڑے ہوئے چند قدم اور قریب آیا۔

''ڈرو نہیں...... بتاؤ تم کون ہو؟''

خضرا نے گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ زمان کی طرح اونچا لمبا وجیہہ مرد تھا جس کے کاندھے پر بندوق تھی۔ اس کے ترشے ہوئے نقوش اور بے حد صاف رنگت پر چھوٹی سی نفیس سیاہ داڑھی اس پر بہت جچ رہی تھی۔ وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوا اور شاید اسے خوفزدہ کرنے کو ڈپٹ کر بولا۔

''بتاتی کیوں نہیں ہو کہ کون ہو تم؟''

صبح کے نکھرے اجالے میں خضرا کے سہمے ہوئے چہرے پر آغازِ شباب کی تازگی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں اس کی دلربائی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ لفظ اس کے حلق سے اٹک سے گئے۔ اس نے گلابی لبوں کو زبان سے تر کیا اور تھوک نگل کر بولی۔

''میں...... میں خضرا ہوں۔''

''خضرا......؟'' اس کی بھاری آواز نے سوالیہ لہجے میں دہرایا۔ ''کون خضرا؟ پہلے تو تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آئی ہو تم؟'' وہ اس کے گداز رخساروں پر سایہ ڈالتی ہوئی دراز پلکوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

خضرا کو اس کی نگاہوں نے پریشان کر دیا۔ اسے کچھ نہیں سوجھا کہ اسے اپنے بارے میں کیا بتائے۔

''تم کہیں گونگی تو نہیں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتی میری بات کا؟'' وہ دبنگ لہجے میں بولا۔

''میں...... میں چھینا کے ماموں کی بیٹی ہوں۔'' خضرا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اچھا اچھا......'' اس نے سر ہلایا۔ ''تم تو بہت خوبصورت ہو۔''

خضرا کے رخسار تپ گئے۔ اس کی دھڑکنیں بڑھیں۔ حجاب کی ایک شرمگیں کیفیت میں وہ گم سی ہو کر رہ گئی۔ اس کا انجان ناپختہ ذہن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اسے اس بات کا

کیا جواب دینا چاہئے۔ وہ سر جھکائے کھڑی زمین پر بکھرے ہوئے پھولوں کی طرف تکتی رہی۔

''یہ پھول تم نے گرائے ہیں؟'' اس نے استفسار کیا۔

خضرا یوں گھبرا گئی جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ اس نے پشیمانی سے اس کی طرف دیکھا اور سادگی سے بولی۔

''میں ڈر گئی تھی...... میرے ہاتھ سے چنگیر گر گئی تھی۔''

''ڈر گئیں تھیں......؟ کس سے......؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

خضرا نے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبایا اور چپ سی ہو گئی۔

''کس سے ڈر گئی تھیں تم...... بتاؤ؟'' اس نے پھر بڑے رعب سے استفسار کیا۔

''گھوڑے سے۔'' خضرا نے مختصر سا جواب دیا۔

''اوئے تم گھوڑے سے ڈرتی ہو؟'' وہ بے حد محظوظ ہوا۔

''نہیں...... میں نے سوچا باغ میں پتہ نہیں کون آ گیا ہے۔'' خضرا نے بھولپن سے کہا۔

''اور اب...... اب تم کیا سوچ رہی ہو کہ کون آیا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''پتہ نہیں۔'' خضرا نے اس کی مسلسل نگاہوں سے گھبرا کر کہا۔

''پوچھو گی بھی نہیں کہ میں کون ہوں؟'' وہ خوش دلی سے بولا۔

خضرا نے سر جھکا لیا اور گھاس پر بکھرے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ شاید اس کے جواب کے انتظار میں ہی تھا۔ اس کی مسلسل خاموشی کو توڑنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے اس کے شانے کو چھوا۔

''اے...... جواب دو ناں میری بات کا۔''

خضرا گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ہراساں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسا۔

''چلو تمہاری مرضی۔ تم نہیں پوچھنا چاہتی تو میں نہیں بتاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور خضرا وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

وہ کھوئی کھوئی سی بہت دیر تک وہیں کھڑی نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ حیران اسے

ناشتے کے لئے بلانے آئی تو وہ الجھی ہوئی سی اندر کمرے میں آئی جہاں عموماً ناشتہ کیا جاتا تھا لیکن دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ وہی شخص پھوپھی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گھڑ سواری کے لباس کی بجائے شوخ کناری کا لاچہ اور ریشمی کُرتا پہن رکھا تھا۔

"خضرا دھیئے آ جا......" پھوپھی نے اسے ہچکچاتے دیکھا تو اسے پکارا۔ "دیکھ تیرا بھائی آیا ہے۔"

وہ نپے تلے قدم رکھتی اندر آئی تو وہ بالکل انجانے پن سے بولا

"چھوٹی بے بے! یہ کون ہے؟"

خضرا کو حیرت ہوئی لیکن اس نے اس کی چمکیلی آنکھوں کے خوف سے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے پتر ونجل۔" پھوپھی نے محبت سے کہا۔

خضرا کو محسوس ہوا کہ وہ اسی کی جانب دیکھ رہا ہے لیکن وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھوپھی اسے بتانے لگی۔

"چھینا کا بھی دل اس کے ساتھ لگ گیا ہے۔ بیچاری اکیلی تو ہے۔"

ونجل شرارت سے مسکرایا۔ "یہ گونگی ہے چھوٹی بے بے؟"

"ہائے ہائے نہیں تو۔" چھینا نے جلدی سے تردید کی۔

اس کی شریر نگاہوں کو اپنے چہرے سے چھوتے ہوئے محسوس کر کے خضرا کے رخسار شہابی ہو گئے۔

"پتر شرماتی ہے...... بچی ہے ناں......" پھوپھی نے محبت سے کہا۔

"کس سے شرماتی ہے؟" وہ ہنسا۔

"چل...... شیطان نہ ہو تو کہیں کا۔" پھوپھی نے اس کے لہجے کی شرارت بھانپ کر اسے پیار سے ڈانٹا۔

چیراں ناشتہ لے کر آئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ناشتہ ابا جی کے ساتھ بیٹھک میں کروں گا۔ کچھ مہمان بھی آئے ہوئے ہیں۔"

وہ کمرے سے نکل گیا تو خضرا کی جان میں جان آئی۔ اس کی موجودگی میں وہ بے حد جھجک محسوس کر رہی تھی۔ اپنے چہرے کو چھوتی ہوئی اس کی نگاہوں نے اسے پریشان

کر دیا تھا۔ اس کے لفظ ابھی تک اس کی سماعت میں گونج رہے تھے۔ اس نے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ پھوپھی کی کچھ ملنے والی آ گئیں۔ چھینا نہانے چلی گئی۔ وہ بال بنانے کے لئے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو کسی نے اس کے کان میں گمبھیر سرگوشی کی۔

"تم تو بہت خوبصورت ہو۔"

بالوں میں کنگھی کرتا ہوا اس کا ہاتھ تھم گیا اور اس نے ٹھٹک کر خود کو دیکھا۔ اس نے ہزاروں بار آئینہ دیکھا تھا لیکن ان چند لفظوں میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ اب خود کو بھی نہیں پہچان پا رہی تھی۔ اس کا نوخیز چہرہ حجاب کے گلابی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی بے حد سیاہ آنکھوں کے بیچ ستارے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے لبوں پر ایک تر و تازہ مسکراہٹ کا گلاب کھلا ہوا تھا۔

اسے سب کچھ نیا نیا اور انوکھا محسوس ہو رہا تھا۔ اس ایک جملے نے اس کے شعور کو جگا دیا تھا۔ وہ پہلی بات تھی جس نے اسے اس کے وجود کا احساس دلایا تھا۔ اس کے ننھے سے انجان دل میں نرم و نازک، نوزائیدہ جذبے ہولے ہولے پھوٹنے لگے تھے۔ اسے یقین آنے لگا کہ وہ کیوں کہتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے۔ اگر وہ خوبصورت نہ ہوتی تو وہ اونچا لمبا، اتنا بڑا مرد کیوں کہتا کہ وہ خوبصورت ہے۔ وہ اسے اچھی لگی تھی تو اس نے کہا تھا۔ یہ خیال ہی ایسا طرب انگیز تھا کہ اس کا انگ انگ گنگنا اٹھا۔ اس نے کمر سے چھوتے ہوئے بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھتے ہوئے نہ جانے کتنے ہی سپنے دیکھ ڈالے۔

شام کے سرمئی دھندلکے چاروں اور پھیل رہے تھے۔ وہ کمرے میں تنہا تھی کہ چیراں اِدھر اُدھر چور نظروں سے دیکھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور مدھم سی آواز میں بولی۔

"خضرا بی بی! ذرا بات سنو۔"

"کیا بات ہے چیراں؟" خضرا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ذرا میرے ساتھ آ بی بی۔" اس نے آنکھ سے رازدارانہ اشارہ کیا۔

"کہاں......؟" خضرا نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کچھ پتہ تو بتاؤ کہاں؟" خضرا نے کسلمندی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

"تم آؤ ناں بی بی! ابھی بتا دیتی ہوں۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

خضرا کچھ نہیں سمجھی اور الجھی ہوئی سی اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ حویلی کی بھول بھلیوں جیسی راہداری میں سے ہوتی ہوئی ایک نئے اور انجان راستے سے چمن میں پہنچی۔ باغ کا یہ حصہ زنان خانے سے علیحدہ تھا اسی لئے عموماً اس طرف نہیں آتی تھیں۔ خضرا نے کچھ الجھ کر اس سے کہا۔

"جیراں! یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟ بتاتی کیوں نہیں ہو.....؟"

جیراں کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آئی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو اور میچ لیا اور رازداری سے بولی۔ "بی بی! ونجل چودھری نے کہا تھا تمہیں بلا لاؤں۔"

"کیا.....؟" خضرا بھونچکی سی ہو کر وہیں رک گئی۔

"اپنا ونجل چودھری۔" جیراں نے بڑے دلار سے پھر کہا۔

خضرا ہکا بکا رہ گئی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس پر کوئی ایسا لمحہ بھی آ سکتا ہے۔ وہ بے حد گھبرا گئی اور ناراضگی سے بولی۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں ابھی پھوپھی سے جا کر تمہاری شکایت لگاتی ہوں..... میں جا رہی ہوں۔"

"تم ابھی نہیں جاؤ گی۔" بھاری مردانہ آواز نے اسے ٹوک دیا۔

خضرا سراسیمہ سی ہو گئی۔ ونجل نہ جانے کہاں سے اچانک نمودار ہو گیا تھا۔

"نہیں..... میں جا رہی ہوں۔" وہ لرز کر بولی۔

"میری بات سن لو..... پھر چلی جانا۔" ونجل نے بڑے اطمینان سے کہا اور جیراں سے بولا۔ "جیراں! تُو چل..... شکل گما۔ اگر کوئی اس کا پوچھے تو کہہ دینا باغ میں راستہ بھول گئی تھی۔"

جیراں نے مسکرا کر خضرا کی طرف دیکھا۔

"خضرا بی بی! چودھرانی سے شکیت نہ لگانا۔"

"تُو جاتی ہے کہ نہیں؟" ونجل نے دانت پیسے تو وہ دوڑتی ہوئی درختوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"میں بھی جاتی ہوں۔" خضرا نے جیسے اسے اطلاع دی اور خود بھی جیراں کے پیچھے لپکی۔

"ٹھہر جاؤ ناں۔" ونجل نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

"ہائے اللہ....." خضرا نے ہراساں ہو کر اپنا بازو چھڑایا۔

"جھلی..... گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ مسکرایا اور اس کا بازو پکڑے پکڑے اسے سبز بیلوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی بارہ دری نما نشست گاہ میں لے آیا۔

"نہیں نہیں..... مجھے جانے دیں..... میرا بازو چھوڑ دیں۔" خضرا روہانسی ہو گئی۔

"ارے ارے..... رونا مت۔ لو میں تمہارا بازو چھوڑ دیتا ہوں۔ بس؟" ونجل نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

خضرا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چمن کا تنہا گوشہ، ونجل کی موجودگی اور اس کی نگاہوں کے والہانہ زاویے سب کچھ اس کے لئے حیرت انگیز اور خوف زدہ کر دینے والا تھا۔ اسے کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی صورتحال کا مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ ان لمحوں سے کترانے کے لئے اسے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھا کہ پھر ونجل سے کہے کہ وہ اسے جانے دے۔

بے بسی اور خوف نے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔

"اوئے ہوئے، بھئی تم رو کیوں رہی ہو؟" ونجل نے اس کے آنسو پونچھے۔

وہ ہراساں سی ہو کر پیچھے ہٹی۔ "دیکھو خضرا! گھبراؤ نہیں..... میری بات آرام سے سنو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بس مجھ سے وعدہ کرو کہ تم روز اسی جگہ مجھ سے ملنے آؤ گی۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو..... بہت اچھی۔" وہ مسحور کن لہجے میں کہنے لگا۔

خضرا گم سم سی ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ اسے یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح سے معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دل سہم سہم کر دھڑک رہا تھا۔ وہ اس مقام سے، ان طلسمی لمحوں سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن ونجل راستے میں کھڑا تھا۔

"مجھے جانے دیں، پلیز....." اس نے التجا کی۔

"اچھا اچھا چلی جانا..... لیکن پہلے وعدہ تو کرو کہ کل ملنے آؤ گی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں..... نہیں، میں نہیں آ سکتی۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں جلدی سے بولی۔

"اگر تم نہیں آؤ گی تو میں خود تمہیں ڈھونڈ لوں گا اور جہاں بھی نظر آئیں اس طرح پکڑ لوں گا۔" اس نے اپنے لمبے مضبوط بازوؤں سے اس کے نازک وجود کے گرد اس طرح حلقہ سا باندھ دیا کہ اس کے بازو اس سے چھو نہیں رہے تھے۔

"پلیز......" خضرا اپنے آپ میں ہی سمٹ گئی کہ کہیں اس کے بازو اس کے جسم سے چھو نہ جائیں۔

"وعدہ کرو جلدی سے۔" وہ اسے بازوؤں کے حصار میں قید کیئے ہوئے بولا۔

"مجھے نہیں پتہ۔" خضرا نے زچ ہو کر کہا اور اپنی ہمتوں کو مجتمع کر کے تیزی سے جھکی اور بجلی کی سی سرعت سے اس کے بازوؤں کے نیچے سے نکلتی ایک جانب سرپٹ بھاگ اٹھی۔ ونجل کی ہنسی اس کے تعاقب میں تھی۔

وہ بہت دیر تک غسل خانے میں گھسی ہوئی خود کو سنبھالتی رہی، اپنے حواس بحال کرتی رہی۔ خود کو یقین دلاتی رہی کہ وہ اس صورت حال سے نکل آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سے آنسو تیزی کے ساتھ بہتے رہے۔ وہ انہیں ٹھنڈے پانی کے چھپاکوں میں مدغم کرتی رہی۔ اس کے دل میں ہول سے اٹھ رہے تھے۔ اس کے روئیں روئیں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی بات اس کے ننھے سے دل میں سما نہیں رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس سے کہے، کیا کہے اور کس طرح کہے؟ کس کو بتائے، کس سے پوچھے؟ کس سے مشورہ مانگے کس سے صلاح کرے؟

چھینا اور زمان کی ملاقاتوں کے رنگین فسانے چھینا کی زبانی سن سن کر اس کے دل میں بھی زمان جیسے کسی چاہنے والے کی تمنا جاگنے لگی تھی لیکن اس تمنا کو اس نے ہمیشہ ایک گہرے راز کی طرح دل کے نہاں گوشوں میں ہی قید رکھا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ معصوم سی تمنا اونچے لمبے شاندار ونجل کی صورت میں مجسم ہو جائے گی۔ اسے یہ بات سہارنی دشوار ہو رہی تھی۔ وہ ڈرتی ڈرتی غسل خانے سے نکلی تو اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ساری بدل گئی ہے۔ اس کے چہرے کا، اس کی آنکھوں کا رنگ اور ہو گیا ہے۔ سب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور پل بھر میں سب کچھ جان جائیں گے۔ اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آنے والے لمحے کیسے ہوں گے...... اس میں کیا ہو جائے گا۔

وہ سارا وقت سہمی سہمی سی رہی۔ کھانا کھا کر فوراً ہی بستر میں گھس گئی۔ چھینا نے اسے ایک دو بار پکارا لیکن وہ سوتی بن گئی۔ پھوپھی اسے خلاف معمول اتنی جلدی سوئے ہوئے دیکھ کر قدرے حیران ہوئی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی کہ کہیں اسے بخار تو نہیں۔ وہ دبکی پڑی رہی اور اس کا دل دھک دھک کرتا رہا۔

اس کا ذہن ہزاروں خیالوں کی آماجگاہ بنا رہا اور اس کے دماغ میں لاکھوں وسوسے سرسراتے رہے۔ وہ آنے والے دن، طلوع ہونے والی صبح سے ڈرتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ ماں کا سایہ کبھی اس کے لئے گھنیرا نہیں ہوا تھا۔ ماں نے کبھی اسے زمانے کی اونچ نیچ نہیں سمجھائی تھی۔ اس نے اپنی چھت تلے نہیں دوسروں کی دہلیز پر ہوش سنبھالا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کون سی بات کیسے بتانی چاہئے۔ کسی کے ساتھ بھی اتنی قربت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اتنا بڑا راز اس کے حوالے کر دیتی۔ چھینا اس کے ساتھ کھلی ملی تھی۔ ہر وقت اس کے ساتھ زمان کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ لیکن خود کو اسے بھی اس راز میں شریک کر لینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند نے لمبی رات کے پچھلے پہر آن کر اس کی پلکوں کو موند دیا تو بھی عجیب سہا دینے والے خوابوں سے اس کی نیند بار بار ٹوٹتی رہی۔ عجیب سہا دینے والے خوابوں سے اس کی نیند بار بار ٹوٹتی رہی۔

اگلے روز وہ دن بھر کھوئی کھوئی سی رہی۔ اس کے کچے پکے ناپختہ جذبوں میں کھدبد سی ہوتی رہی۔ اس کے احساسات ہر آن رنگ بدلتے رہے۔ ونجل کی مسحور کر دینے والی آنکھیں ہر لمحے اسے جھانکتی رہیں۔ اس کی باتیں، اس کی دھمکیاں، اس کے لفظ کبھی اسے سہا دیتے اور کبھی گدگدانے لگتے۔

"تم مجھے اچھی لگتی ہو...... بہت اچھی۔"

یہ سیدھے سادھے لفظ کبھی آئینہ بن جاتے جن میں رہ رہ کر اس کا روپ جھلکتا اور کبھی ایک نغمہ سا بن کر اس کی سماعت میں رس گھولنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بار بار اس نغمے کو سنتی رہے۔ وہ سراسیمہ سی ہو جاتی۔ خود کو کوستی اور اس خواہش پر بڑی ندامت سی محسوس کرتی۔

دوپہر ڈھلی اور شام کی دلکشی نے شفق کے متوالے ارغوانی رنگ اوڑھ لئے۔ خضرا کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ اسے چمن کے اس تنہا گوشے کی جانب ایک کشش سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے کانوں میں ونجل کی گنبھیر آواز مدھم مدھم سرگوشیاں کرنے لگی۔

''تم مجھے اچھی لگتی ہو...... تم مجھے اچھی لگتی ہو...... بہت اچھی......!!''

اس کا جی مچلا کہ آواز کے اس جادو کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلتی چلی جائے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ ونجل کی بانہیں اس کے گرد حصار سا باندھنے لگیں۔ اس کے دل میں اس حصار کے کبھی نہ ٹوٹنے کی تمنا پھول کی طرح کھلنے لگی۔ وہ اپنی انجان سوچوں سے گھبر گئی۔ وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگی۔ اسے اپنے ہی احساسات سے خوف آنے لگا۔ خود کو ملامت کرتی ہوئی وہ اٹھ کر پھوپھی کے کمرے میں آ گئی۔ اسے خوف تھا کہ اسے تنہا دیکھ کر اس کی دیوانی سوچیں اسے کہیں پاگل نہ بنا دیں۔

پھوپھی نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا......

''کیوں دھیئے! تیرا دل لگ گیا ہے ناں؟''

''بے بے میرا دل ذرا نہیں لگتا...... بے بے تُو ابے سے کہہ ناں کہ واپس چلیں۔'' چھینا نے بیزاری سے کہا۔

''چلے چلیں گے واپس...... تُو نے وہاں جا کر کون سی فصل بونی ہے...... ویسے میں نے بات کی تھی چودھری صاحب سے۔ کہہ رہے تھے کہ دس پندرہ دن تک چلے چلیں گے۔'' پھوپھی نے بتایا۔

''ہائے...... دس پندرہ دن......؟'' چھینا نے برا سا منہ بنایا۔

پھوپھی اس کی بات کا جواب دینے ہی والی تھی کہ جیراں کمرے میں داخل ہوئی۔ خضرا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اپنے آپ میں ہی مجرم بن گئی۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ براہ راست اس سے ہی مخاطب ہو گئی۔

''خضرا بی بی...... آؤ تمہیں دکھاؤں۔ گوری گاں نے وچھی دی ہے۔ رب جھوٹ نہ بلوائے اتنی سوہنی اور سجری ہے کہ دیکھنے سے میلی ہوتی ہے۔''

خضرا نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے بولی۔

''نہیں...... میں نے دیکھ کر کیا کرنا ہے۔''

''نہیں دھیئے...... جا کر دیکھ آ...... تُو نے بھلا شہر میں گائے کی بچھیری کہاں دیکھی ہو گی۔ جا چھینا تو بھی ساتھ۔'' پھوپھی نے پیار سے کہا۔

''نہیں بے بے...... میرا دل نہیں کرتا۔'' چھینا نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے اضمحلال سے کہا۔

''پھر میں بھی نہیں جاتی۔'' خضرا نے جلدی سے انکار کیا۔

''آ ناں کاکی...... آ میری سوہنی دھی......'' جیراں نے قریب آ کر بڑے دلار سے کہا...... پھوپھی نے بھی چمکارا...... جیراں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ خضرا مجبور سی ہو گئی۔

اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ جیراں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور رازداری سے بولی۔

''خضرا بی بی...... ونجل چودھری بڑا ڈاڈا ہے...... کہہ رہا تھا اگر خضرا بی بی کو نہ لے کر آئی تو تیری خیر نہیں...... بی بی ہم تو نوکر ہیں، مالکوں کی بات نہ مانیں تو کدھر جائیں؟ ہمارا تو ان پانی سارا کچھ یہیں لکھا ہے۔ بڑی مشکل سے بات بنائی ہے۔ پر شکر ہے کہ چودھرانی کو شک نہیں ہوا۔ خضرا بی بی آپ خود ہی چھوٹے چودھری سے بات کر لیں ناں...... میں غریبنی مفت ہی نہ ماری جاؤں۔'' اس کا لہجہ التجا آمیز تھا۔

خضرا جیسے کسی ننھی سی چڑیا کی طرح جال میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ ونجل سے ملنے کے لئے نہیں جانا چاہتی تھی لیکن انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ نہ شور مچا سکتی تھی نہ کسی کو بتا سکتی تھی۔ اس کے چھوٹے سے ذہن میں اس مشکل کا کوئی حل نہیں آتا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ ہوش ربا حادثہ اس کے لئے بہت بڑا تھا۔ وہ جیراں کے ساتھ مجبوراً چلی جاتی تھی۔ خوفزدہ، سہمی ہوئی، ہراساں اور سراسیمہ۔ اور جیراں بار بار اس سے کہہ رہی تھی کہ اسے ونجل چودھری کے ساتھ پکی بات کر لینی چاہئے تاکہ وہ خود اس کے عتاب کا نشانہ نہ بنے۔

ونجل کا اونچا لمبا سراپا دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ اس نے شوخ رنگوں کا ریشمی لاچہ اور کرتا پہن رکھا تھا۔ جیراں نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا۔

''خضرا بی بی...... جاؤ...... اپنے رانجھے کے پاس۔''

خضرا کے رخسار تپ گئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر خود کو اس صورت حال سے

نکال لے۔ لیکن وجل نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتا ہوا بولا۔

"شکر ہے تم آ گئی ہو...... ورنہ میں نے تو تمہیں پکڑ کر لے آنا تھا۔"

خضرا اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی اور شانے سکیڑ کر منمنائی۔

"یہ بہت بری بات ہے۔ آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ میں کل سے نہیں آؤں گی۔"

"چھوڑو بھی...... اب آ گئی ہو تو کوئی اچھی بات کرو...... کل کی کل دیکھی جائے گی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر دبنگ لہجے میں بولا اور اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو لپیٹ کر اسے بارہ دری میں لے آیا۔ "تم تو بالکل جھلی ہو...... بھلا اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے...... میں کوئی غیر تھوڑا ہوں...... تمہارا رشتہ دار ہوں۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں...... نہیں...... بس میں نہیں......" وہ اس کی گرفت سے نکل گئی اور دور ہٹتے ہوئے اٹک اٹک کر بولی۔ "کسی کو پتہ چل جائے گا...... کوئی دیکھ لے گا...... یہ تو بہت بری بات ہے۔"

"سچ......" وجل نے ہنس کر سر جھٹکا۔ "عجیب لڑکی ہو بھئی تم بھی...... اچھا مجھے بتاؤ بھلا اس میں بری بات کون سی ہے؟" وہ مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

خضرا بے خیالی میں اپنی انگلیاں مسلنے لگی۔ اس کی نگاہیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

"ہاں بھئی بتاؤ ناں...... چپ کیوں ہو...... بتاؤ اس میں کون سی بری بات ہے؟" وجل بار بار پوچھنے لگا۔

خضرا الجھ سی گئی...... اس چھوٹی سی عمر میں اس نے اتنا کچھ نہیں سیکھا تھا کہ اسے کسی بات کا جواب دے سکتی۔ اس کی فطرت نے، اس کے مشاہدے نے اور سنی سنائی باتوں نے اسے اپنے آپ احساس دلا دیا تھا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن وہ اسے ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ وجل کو بتا نہیں سکتی تھی۔ اس نے پریشانی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور جھلا کر بولی۔

"مجھے نہیں پتہ کہ کون سی بات بری ہے۔ لیکن یہ اچھی بات بھی نہیں ہے...... نہیں ہے یہ اچھی بات۔"

"آہا!!......" وہ محظوظ ہوا...... "چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ کون سی بات بری ہے۔" وہ ہنسا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سفید پتھر کی نشست پر بٹھاتا ہوا بولا۔ "دیکھو...... میں صبح سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ کب شام ہو اور کب میں تمہیں دیکھوں، تم سے باتیں کروں اور ایک تم ہو کہ سارا وقت یہی سوچنے میں برباد کر رہی ہو کہ کون سی بات اچھی ہے اور کون سی بری۔ یہاں آرام سے کچھ دیر میرے پاس تو بیٹھو...... میں تمہیں بتاؤں کہ تم کتنی پیاری، کتنی خوبصورت ہو...... مجھے تم کتنی اچھی لگتی ہو...... تم......"

"نہیں، میں نہیں بیٹھوں گی...... میں جاؤں گی۔" خضرا گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اُوں...... اب بیٹھ بھی جاؤ ناں...... کیا تم نے جانے جانے کی رٹ لگائی ہوئی ہے......" وجل نے ایک جھٹکے سے اسے واپس بٹھا دیا اور ڈپٹ کر بولا۔ "اگر تم اب اٹھیں یا تم نے جانے کا نام لیا تو یاد رکھنا میں تمہیں پکڑ کر یہیں بٹھا لوں گا اور ساری رات بٹھائے رکھوں گا سمجھیں...... جانے نہیں دوں گا۔"

خضرا سہم کر رہ گئی۔ اس نے اونچے لمبے وجل کی طرف دیکھا جو کسی ستون کی طرح تنا کھڑا تھا۔ وہ نازک اندام سی لڑکی اس کے سامنے بالکل بے بس تھی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا، کسی کو خبر ہو گئی تو وہ کیا کرے گی؟...... سو طرح کے اندیشوں نے اسے لرزا دیا۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔ اس نے سر جھکا دیا اور زار و قطار روتی چلی گئی۔

"اوہو...... ہو ہو...... یہ کیا کرتی ہو بھئی......" وجل اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "رونے کے سوا تمہیں کچھ اور بھی آتا ہے...... پگلی نہ ہو تو کہیں کی۔" اس نے پیار سے کہا اور خضرا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اور شدت سے رونے لگی۔ وجل نے تسلی کے لئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"ہے کہ نہیں پگلی...... روتے روتے سارا وقت ضائع کر دے گی۔" اس نے خضرا کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہاتھ اس کے چہرے سے علیحدہ کئے، اس کے آنسو صاف کئے اور اسے ڈراتے ہوئے بولا۔

"اے خضرا...... بس بند کرو رونا دھونا...... اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو تمہاری ہرنیوں ایسی آنکھیں سوج جائیں گی۔ بے بے پوچھے گی تو اسے کیا جواب دو گی بتاؤ، مجھے تو بتاؤ۔" ونجل نے اس کی ٹھوڑی چھو کر شرارت سے کہا۔

خضرا پھر گھبرا گئی...... نشست پر اس سے دور ہٹتے ہوئے وہ اپنے دوپٹے سے آ پونچھنے لگی۔

"بس بس...... اب اور پیچھے نہ ہٹنا...... گر جاؤ گی۔" ونجل نے ہنستے ہوئے ا چھیڑا۔

"مجھے جانے دو......" خضرا ڈرتے ڈرتے بولی۔

"خدا کی بندی تم اس کے سوا کوئی اور بات نہیں کر سکتیں؟" ونجل اپنی پیشانی پر ہا مار کر بولا۔

خضرا نے اپنے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبا لیا۔ آنسو پھر اس کی آنکھو میں مچلنے لگے۔

"اچھا بھئی...... چلی جانا...... چلی جانا...... لیکن پہلے وعدہ کرو کہ کل آؤ گی۔" ا نے وعدہ لینے کے لئے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلائی۔ خضرا نے بے بسی سے اس کی طر دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھنے کے لئے آگے نہیں بڑھایا۔

"تم خود تو وعدہ کرو گی نہیں۔ تم سے تو زبردستی وعدہ کروانا پڑے گا......" اس نے ہا بڑھا کر اس کا چھوٹا سا ملائم ہاتھ اپنے دونوں بھاری ہاتھوں میں دبا لیا۔

وہ زبردستی وعدے لیتا رہا اور کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اسے باغ میں آنے پر مج کرتا رہا۔ خضرا ڈرتی، گھبراتی، پریشان ہوتی اور وہ اس کے روبرو بیٹھا اپنی سی جاتا...... وہ نئے جذبوں سے آشنا ہوئی۔ اس کے سامنے نئی دنیائیں آشکار ہوئیں۔ ایک انجانے جہان میں آ گئی۔ اس نے محبت کو کبھی اتنے قریب سے، اتنی فراوانی سے دیکھا تھا۔ اس نے اتنی توجہ، اتنا التفات اور اتنی چاہت کبھی نہیں پائی تھی۔ وہ انو جذبوں کے ان گنگناتے ریلوں میں بہنے سے خود کو نہیں روک سکی۔ اس کا ناپختہ ذہن کچی عمر کے سجیلے ارمان ونجل کی محبتوں میں آسودہ ہو گئے۔ ونجل کی بیتابیوں میں اس بیقراریاں بھی گھل مل گئیں۔ اس کے ساتھ ایک نیا اور حسین رابطہ آپ سے آپ اس

ہو گیا۔ ایک خوبصورت تعلق جیسے زندگی بھر کا حاصل بن گیا۔ وہ بھی چھینا کی طرح ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی۔ اس کا کچا ذہن اسی دھن میں مگن ہو گیا جو ونجل نے سازِ محبت پر چھیڑ رہی تھی۔

اب اس کی ساری دلچسپیاں اونچی دیواروں والی وسیع حویلی میں سمٹ آئی تھیں۔ شام کے شفق آلود لمحے دل کی آرزو بن گئے تھے اور چمن کا مہکتا ہوا گوشہ جنت معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کی دلکش سیاہ آنکھوں میں ہیرے سے چمکنے لگے۔ اس کے نوخیز خوبصورت چہرے پر ونجل کی محبتوں کا عکس لہرانے لگا۔ لمحے ایک رسیلی گنگناہٹ میں ڈھل گئے۔ وہ بمشکل پندرہ سولہ برس کی معصوم سی لڑکی تھی۔ وہ محبت کے اس انمول خزانے کو پا کر سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔ اسے نہ انجام کی کوئی فکر تھی نہ راہوں کے پیچ و خم کا خوف...... وہ انوکھے جذبے سے آشنا ہوئی تھی وہ ہر لمحے اس کی تسکین کے ذرائع تلاش کرتی رہتی تھی۔

چھینا سوزِ فراق میں سلگتی تھی تو خضرا لذتِ وصال میں سرشار تھی۔ چھینا کو ہر آنے والا دن حویلی اور اس کی فضا سے بیزار کرتا تھا اور خضرا کے لئے حویلی محبوب سے محبوب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چھینا کو بھی اس راز میں شریک کرے لیکن ونجل نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک وہ چودھری صاحب سے خود بات نہیں کر لیتا اسے راز ہی رہنا چاہئے۔

اب چھینا اس سے زمان کی باتیں کرتی تو وہ ونجل کے تصور میں کھو جاتی اور چھینا کی والہانہ تڑپ سے اپنے من کی تصویر میں رنگ بھرتی رہتی۔ زندگی پہلی بار اسے بے حد عزیز ہو گئی تھی۔ اب وہ ونجل سے ملنے کے لئے جیراں کی محتاج نہیں رہی تھی۔ اب ونجل کی کشش اسے مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔

ایک شام وہ ونجل سے رخصت ہو کر محتاط قدم اٹھاتی رہائش کی طرف آ رہی تھی کہ چودھری صاحب کی دوسری بیٹھک میں سے پھوپھی کی آواز سنائی دی۔ چھینا کا نام سن کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ پہلے بھی دل سے چاہتی تھی کہ چھینا کو زمان مل جائے۔ لیکن جب سے ونجل اس کی زندگی میں آیا تھا وہ چھینا کے جذبات کو بہت قریب سے سمجھنے لگی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں چودھری صاحب چھینا کی زندگی کا کوئی فیصلہ تو نہیں کر رہے وہ کھڑکی کے نزدیک رک گئی اور اندر سے آنے والی آوازیں غور سے سننے لگی۔

"یہاں آئے تو کافی دن ہو گئے ہیں۔ واپس جانے کا ارادہ کب ہے؟" پھوپھی نے پوچھا۔

"کیوں......؟ واپس جانے کی کس کو جلدی پڑی ہے؟" چودھری صاحب نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں...... جلدی تو نہیں......" پھوپھی دبے ہوئے انداز میں بولی۔ "میری تو خیر ہے...... میں چھینا کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔"

"کیوں چھینا کو یہاں کیا تکلیف ہے؟" انہوں نے ناپسندیدگی سے پوچھا۔

"نہیں تکلیف کیا ہونی ہے۔" پھوپھی نے جیسے صفائی پیش کی۔ "بچی ہے ناں...... اس کا یہاں دل نہیں لگتا طبیعت بھی کچھ گری گری سی رہنے لگی ہے اس کی۔"

"ہوں......" چودھری صاحب نے لمبی ہوں کی اور طنزیہ لہجے میں دوہرایا۔ "طبیعت گری گری رہتی ہے چھینا کی۔ کیا وجہ ہے، طبیعت کیوں خراب رہتی ہے اس کی؟"

پھوپھی نے سادگی سے کہا۔ "وجہ کیا ہونی ہے...... آپ تو یونہی۔"

"عجیب جاہل عورت ہو تم...... ماں ہو اس کی...... تمہیں نہیں پتہ کہ جوان بیٹی کی طبیعت کیوں خراب رہتی ہے؟" چودھری صاحب نے چبا چبا کر لفظوں کی ادائیگی کی۔

"آپ نے تو ایک ہی بات پکڑ لی ہے۔ بھلا طبیعت خراب ہونے کی کیا وجہ ہو ہے؟" پھوپھی نے زچ ہو کر کہا۔

"یہی تو تم عورتوں کی جہالتیں ہیں......" چودھری صاحب چڑچڑے پن سے بولے۔ "تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے۔ انتظام کرتے ہیں کچھ نہ کچھ۔"

پھوپھی نے جواب نہیں دیا اور چودھری صاحب حقہ گڑگڑانے لگے۔ خضرا کچھ اور سننے کی آس میں چپ کھڑی حقے کی گڑگڑ سنتی رہی۔ اندھیرا اور جھک آیا تو وہاں سے ہٹ گئی۔

چودھری صاحب کی باتوں نے اس کے سہانے سپنوں کے روپہلے تار الجھا دیئے تھے۔ حویلی سے جانے کا تذکرہ سن کر اس کا ننھا سا دل ڈوب گیا تھا۔ ونجل سے جدائی کے خیال نے اس کے من میں آنچ سی سلگا دی۔

اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر ونجل کو بتائے کہ چودھری صاحب انہیں واپس بھیجنے کا انتظا

کرنے والے ہیں، اگر وہ کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔ اس نے مڑ کر باغ کی طرف دیکھا جہاں وہ اب سے کچھ دیر پہلے ونجل کی قربت میں سرشار تھی۔ اس کا دل کانپ گیا۔ سیاہ اندھیرے نے گھنے درختوں، پھولوں کے تختوں اور گھاس کے قطعات کو ڈھانپ لیا تھا۔ خاموشی اور تاریکی ایک ہیبت سی بن کر سارے باغ پر چھائی ہوئی تھی۔ نہ معلوم وہاں ونجل تھا بھی یا نہیں۔ اس کے بغیر اس وسیع باغ میں جانے کا تصور بڑا ہولناک تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی اور سوچنے لگی کہ وہ کل ونجل کو سب کچھ بتائے گی۔ اس کی محبت، اس کی چاہت اور اس کے قول پر اسے اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بات سنتے ہی ونجل، چودھری صاحب سے بات کر لے گا اور پھر...... اس سے آگے سہانی سوچوں کی بارات تھی جو اسے تصور ہی تصور میں دلہن بنا کر ڈولی میں بٹھا دیتی تھی اور ونجل کے چہرے پر سونے کی تاروں کا سہرا سجا دیتی تھی۔

انہی سوچوں میں الجھی الجھی سی وہ اندر آئی تو چھینا کھڑکی کے پاس اداس بیٹھی تھی۔ اس کی آہٹ سن کر وہ چونکی اور شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"خضرا...... تم کہاں چلی جاتی ہو...... میں تمہیں ڈھونڈتی رہ جاتی ہوں۔"

"کہیں نہیں چھینا باجی...... میں ذرا باغ کی طرف نکل گئی تھی۔" خضرا نے جلدی سے بات بنائی۔

"مجھے بھی لے جانا تھا۔" اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "خضرا...... میری دل کی لگی کا کوئی علاج تیرے پاس ہے؟ میری بے چینی نہیں جاتی...... مجھے قرار نہیں آتا۔"

اس کی مرجھائی ہوئی خوشیوں اور تڑپتی ہوئی بے قراریوں کو تسکین دینے کی خضرا نے اسے خوشخبری سنا دی جس نے اس کے اپنے دل میں بیقراریوں کے بیج بو دیئے تھے۔

"چھینا باجی! بس اب تمہاری خوشیوں کے دن آنے والے ہیں۔ میں ابھی سن کر آئی ہوں، پھوپھا کہہ رہے تھے کہ وہ واپس جانے کا انتظام کر دیں گے۔"

"سچ......؟" چھینا بے تاب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اس کے دونوں شانے تھام کر بولی۔ "سچ کہہ خضرا! تُو نے اپنے کانوں سے سنا ہے؟"

"بالکل اپنے کانوں سے سنا ہے...... پھوپھا جی کہہ رہے تھے بس تھوڑے دنوں کی

بات ہے،ہم انتظام کرتے ہیں کچھ نہ کچھ۔'' خضرا نے چودھری صاحب کا فقرہ دہرایا۔

''ہائے...... شکر ہے۔'' چھینا نے گہرا سانس لے کر آنکھیں خوشی سے میچیں اور خضرا کے رخسار پر چھوٹا سا پیار کرلیا۔

چھینا کے چہرے کی رونق لوٹ آگئی۔ اس کی آنکھوں کی جوت جگنے لگی۔ اس کے لہجے میں نغمگی سی جاگی اور وہ پہلے جیسی نٹ کھٹ کھلنڈری اور چونچال چھینا بن گئی۔ بستر پر لیٹتے لیٹتے اس نے خضرا سے کتنی ہی باتیں کرڈالیں۔ جیراں ان دونوں کے لئے دودھ کے پیالے لے کر آئی تو روز کی طرح اس نے انکار نہیں کیا نہ ہی برا سا منہ بنایا بلکہ خضرا کے ساتھ ہنستے مسکراتے اس نے پیالہ خالی کردیا۔

بہت دنوں بعد اس نے بڑے چاؤ سے زمان کے بارے میں بہت ساری باتیں کیں۔ اپنے ساتھ اس نے خضرا کو بھی جگائے رکھا اور مستقبل کے حسین تانے بانے بُنتی رہی۔ خضرا اس کے خوابوں میں اپنے خوابوں کی جھلک دیکھتی رہی۔ زمان کے شیریں تذکروں میں اسے ونجل کی شبیہہ نظر آتی رہی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ چھینا کو ونجل کے بارے میں سب کچھ بتادے لیکن ونجل کی ناراضگی کے خیال سے اس نے یہ بات اپنے ذہن پر ہی روک لی اور دل ہی دل میں یہ طے کرلیا کہ وہ کل ونجل سے پوچھ کر چھینا کو اپنے میٹھے رازوں میں شریک کرے گی۔

چھینا کی متوالی باتیں سنتے اور اپنی نویلی سوچوں میں کھوئے کھوئے وہ نہ جانے کب سو گئی کہ گہری رات میں اسے چھینا کی آواز سنائی دی۔

''خضرا...... خضرا......!!''

اسے اپنے شانے، اپنی گردن اور اپنے رخساروں پر چھینا کے ہاتھوں کا ڈھیلا ڈھالا سالمس محسوس ہوا۔ وہ نیند سے چونکی اور اس نے نندا سی آنکھیں کھول کر اپنے برابر لیٹی ہوئی چھینا کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ رکھا تھا۔

''کیا ہوا چھینا باجی......؟'' خضرا نے تکیے سے سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔

''خضرا!...... خضرا!!...... پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے...... پتہ نہیں۔'' اس نے دوپٹے سے خود کو ہوا دیتے ہوئے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

''طبیعت خراب ہے؟'' خضرا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''پتہ نہیں...... کچھ نہیں پتہ۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔''

خضرا کی اونگھتی ہوئی آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں۔ اس نے مدھم روشنی میں چھینا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپید تھا اور آنکھیں یوں باہر ابل رہی تھیں جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہوا۔ خضرا بے حد گھبرا گئی۔

''چھینا باجی...... میں پانی لاتی ہوں......'' وہ تیزی سے بستر پر سے اتری۔

''نہیں...... نہیں......'' چھینا گھٹی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ''مجھے چھوڑ کر نہ جانا...... مجھے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے...... ہائے میرا دل...... ہائے میں مرگئی۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا اور اس کی خوبصورت آنکھیں پھرسی گئیں...... اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹنے لگا۔

''پھوپھی جی...... پھوپھی جی......'' خضرا دہائی دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ ''چھینا باجی کو کیا ہو گیا ہے...... ہائے اللہ...... چھینا باجی کو کیا ہو گیا ہے؟......'' اس نے دھڑ سے دروازہ کھول کر تقریباً چیختے ہوئے پھوپھی کو پکارا۔

سوئی ہوئی حویلی میں اس کی صدا دور تک بکھرتی چلی گئی۔ پھوپھی دل تھام کر اٹھی اور ننگے پاؤں چھینا کے کمرے کی طرف دوڑی۔ خضرا بھی ساتھ ساتھ تھی۔ نوکرانیاں بیدار ہو گئیں۔ سوئے ہوئے ملازم بندوقیں سنبھالتے ہوئے لپکے اور چودھری صاحب بھی اپنی بیٹھک سے آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے۔ ان کے ساتھ ونجل بھی تھا۔

چھینا بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی اور سارا فرش قے سے بھرا ہوا تھا۔ پھوپھی سر اور سینہ پیٹتی چھینا پر گر سی پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھ میں سنبھال کر اسے اٹھایا۔ اس کی گردن جھول رہی تھی اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جیراں اور زیتون اس کے تلوے سہلانے لگیں۔ پھوپھی اس کے چہرے سے قے کی آلودگی صاف کرتے ہوئے دیوانگی سے کہنے لگی۔

''چھینا...... چھینا......! دھیئے ہوش کر...... ہوش کر میری دھی...... ہوش کر سوہنی دھی!''

لیکن چھینا اسی طرح بے سدھ پڑی رہی...... نہ اس نے ہوں ہاں کی...... نہ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں کوئی پہچان ہی اتری۔ اس کے نیلے ہونٹوں سے جھاگ سی بہنے

لگی۔

چودھری صاحب ملازماؤں کو پیچھے ہٹاتے فرش پر پھیلی ہوئی قے سے بچتے بچاتے پلنگ کے قریب آئے۔ انہوں نے چھینا کی نبض پر ہاتھ رکھا، ایک مرتبہ تاسف سے سر جھٹکا اور چھینا کی کھلی ہوئی آنکھوں کو بند کر دیا۔ اس کے بے ترتیب پڑے ہوئے بازوؤں کو اس کے پہلوؤں میں سیدھا کرتے ہوئے آہ سی بھر کر بولے۔

''اللہ کی مرضی......''

پھوپھی چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پاگل پن سے چھینا کے بے جان جسم کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چلائی۔

''نہیں، نہیں...... میری چھینا بچ جائے گی...... میری چھینا بچ جائے گی۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ کسی ڈاکٹر کو بلا لو۔ اسے ہسپتال لے چلو۔ چلو اسے ہسپتال لے جاؤ۔ کوئی آؤ...... جلدی کرو...... اسے لے چلو۔''

چودھری صاحب نے پھوپھی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''حوصلہ کر چھینا کی ماں...... حوصلہ کر...... اللہ کو یہی منظور تھا...... صبر کر...... حوصلے سے کام لے۔''

''نہ...... نہ...... ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ میری چھینا بچ جائے گی۔ اللہ کرے گا، میری دھی بچ جائے گی۔ چودھری صاحب اللہ کے واسطے کچھ کرو...... اسے ہسپتال لے جاؤ...... یہ بچ جائے گی۔'' پھوپھی ہسٹیریائی انداز میں چیخنے لگی۔

''جیراں...... زیتون...... صحباں...... چودھرانی کو سنبھالو۔ شریکوں کے اکٹھے ہونے تک یہ قے وغیرہ صاف کرو۔ بستر اور چھینا کے کپڑے بھی بدلو۔ جلدی کرو۔''

چودھری صاحب اتنا کہہ کر ونجل کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ پھوپھی رو رو کر پچھاڑیں کھانے لگی۔ خضرا حیرت اور صدمے سے ساکت ہو کر خرم کے ساتھ ایک کونے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

چھینا کی اچانک موت کی خبر چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پل بھر میں حویلی نت نئے چہروں سے بھر گئی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ اچھی بھلی جوان جہان لڑکی کو کیا ہوا تھا کہ وہ رات بھر میں ہی چٹ پٹ ہو گئی۔ پھوپھی کو بھی ہوش نہیں تھا۔

وہ کسی کی بات کا کیا جواب دیتی۔ گھر کی نوکرانیاں ہی بڑھا چڑھا کر واقعات بیان کر رہی تھیں۔ لوگ حیرت اور افسوس سے قصہ سنتے۔ حیراں کانوں کو ہاتھ لگا کر قسمیں کھاتی پھر منہ پر اوڑھنی رکھ کر بلند آواز میں بین کرنے لگتی۔ لوگ ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کرتے اور ان کے چہرے پر بے یقینی کی تحریر لکھی ہوئی نظر آتی۔

چودھری صاحب نے چھینا کی آخری رسومات بڑی دھوم دھام سے ادا کی تھیں۔ لوگ عش عش کرتے تھے۔ ہر روز دیگیں چڑھتیں اور لوگ باگ کھانا کھاتے۔ حویلی کی بیٹھک میں ہر وقت قاری بیٹھے قرآن خوانی کرتے رہتے اور چالیسویں پر چودھری صاحب نے غریبوں میں اتنا کچھ تقسیم کیا کہ دیکھنے والے ششدر رہ گئے۔ ہنگامے، مہمان داری اور لوگوں کے آنے جانے میں دن اس طرح گزرے کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ جب برادری والے واپس چلے گئے تو خالی ڈھنڈار حویلی میں چھینا کی یادیں باقی رہ گئیں۔ جس طرف نگاہ اٹھتی تھی، اسی کا چہرہ نظر آتا تھا۔

ہنستی کھیلتی چھینا کو قبر کے حوالے کر کے پھوپھی لٹی ہوئی سی گھر آ گئی تھی۔ اس حادثے نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بالکل ہی گم صم سی ہو گئی تھی۔ نہ ٹھیک طرح سے کھاتی پیتی نہ بات کرتی۔ نہ کسی کی بات کا جواب دیتی۔ اس کی خشک آنکھوں میں جیسے ہر وقت آنسو گرتے رہتے تھے اور اس کے بے کل چہرے پر ویرانی برستی تھی۔ خضرا ہر وقت پھوپھی کے قریب رہتی۔ اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتی۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی۔ خود اسے بھی چھینا کی موت نے چور چور کر دیا تھا۔ چھینا کی باتیں، اس کی ہنسی، اس کی محبتیں اب بھی اسے اپنے اردگرد پھیلتی اور سمٹتی معلوم ہوتی تھیں۔ اسے اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ ہنستی کھیلتی، جیتی جاگتی چھینا نے ہمیشہ کے لئے موت کی ٹھنڈک اوڑھ لی ہے۔

دل پژمردہ سا ہو گیا تھا۔ روح میں گہری اداسی کے الاؤ روشن تھے۔ ہر وقت من اس کی یادوں سے سلگتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں پہلی بار موت کو زندگی کے حسن اور سنگھار کو لوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ س کے روئیں روئیں میں موت کی ہیبت اتر گئی تھی۔ اس حادثے نے ہر شے فراموش کر دی تھی۔

انہیں گھر آئے بمشکل دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ خضرا کسی کام سے مویشیوں کے باڑے کی طرف گئی۔ دالان کے چوڑے ستون کے پیچھے سے کسی نے اچانک نکل کر اس کا بازو تھام

لیا۔ خضرا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا منہ بند کر کے اسے اتنا بلند نہیں ہونے دیا کہ وہ دوسروں کی سماعت میں اترتی۔ خضرا خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگی۔ کسی نے اسے نیم تاریک گودام میں گھسیٹ لیا اور ایک آواز نے بالکل اس کے کان میں کہا۔

''شور مت مچانا...... میں زمان ہوں۔''

خضرا کی جان میں جان آئی۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ نیم تاریکی میں بھی اسے اندازہ ہو گیا کہ زمان کتنا بدل گیا ہے۔ اس کی رنگت جل گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ پریشان حال اور لٹا لٹا سا نظر آتا تھا۔

''خضرا...... میری بہن! مجھے بتا چھینا کو کیا ہوا تھا؟'' اس نے بے تابی سے استفسار کیا۔

خضرا نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''پا زمان! کوئی آ جائے گا۔''

''نہیں...... کوئی نہیں آتا۔'' وہ اس کا بازو تھام کر اسے گودام کے آخری حصے میں لے گیا۔ ''ہاں اب بتا...... کیا ہوا تھا چھینا کو...... کیا ہوا تھا اسے؟ تایا جی سے کوئی بات، کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟'' اس کی آواز میں ضبط کئے ہوئے آنسوؤں کا کرب تھا۔

''نہیں...... کوئی بات نہیں تھی پا زمان! کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس دن تو چھینا باجی بہت خوش تھی۔ وہ بڑی دیر تک آپ کے بارے میں باتیں کرتی رہی اور پھر......'' وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔

''پھر...... پھر کیا ہوا......؟'' زمان نے بیقراری سے پوچھا۔

''پھر...... پھر ہم سو گئے۔ رات کو اس نے مجھے جگایا تو اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔'' خضرا جلدی جلدی بتانے لگی۔

''آرام سے بتاؤ...... کیسی طبیعت خراب تھی اس کی؟ کیا ہوا تھا اسے؟ کیا بتاتی تھی؟''

اس کی بات کاٹ کر وہ ایک ہی سانس میں کتنے سوال پوچھ گیا۔

''بس کہتی تھی کہ پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔ بس یہی کہہ رہی تھی۔ میں پھوپھی کو بلانے دوڑی۔ ہم آئے تو سارا کمرہ اس کی قے سے بھرا ہوا تھا اور چھینا باجی ختم ہو گئی

تھی۔'' خضرا اتنا کہتے کہتے رو پڑی۔

''اچھا......!'' زمان نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا اور ہونٹوں میں جیسے اپنے آپ سے بولا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا۔'' پھر خضرا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اچھا تم جاؤ۔ کہیں کوئی اس طرف نہ آجائے۔''

خضرا تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہی تھی کہ زمان کو کس بات کا شک ہے...... وہ کس انداز میں سوچ رہا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اور پھر اب کہنے، سننے، سوچنے یا شک کرنے سے کیا حاصل تھا۔ چھینا تو منوں مٹی کے نیچے گم ہو گئی تھی۔ کوئی بات، کوئی آواز اسے جگا نہیں سکتی تھی۔ حویلی اس کے بغیر خالی اور ویران تھی۔ تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ دل کہیں نہیں لگتا تھا۔ ایسے میں اسے ونجل کا خیال آیا۔ ہوش بھلا دینے والے اس واقعے نے ونجل کو جیسے احساسات کی دنیا سے دور کر دیا تھا۔ اس ہنگامے اور افراتفری میں وہ بھی کبھی نظر تو آتا تھا لیکن اسی طرح انجانا اور نا آشنا جیسے برادری کے اور بہت سے لوگ حویلی میں یہاں وہاں دکھائی دیتے تھے۔ اس سے کوئی بات ہوئی نہ ملاقات۔ وہ گاؤں سے چلنے لگے تو وہ کہیں نہیں تھا۔ گاؤں پیچھے رہ گیا تو جیسے اس کا تصور بھی پیچھے رہ گیا اور وہ اس کی پہنچ سے بہت دور ہو گیا۔ لیکن اب جبکہ وہ بالکل تنہا تھی، اس کا خیال دل کے نہاں خانوں میں پھر اپنی چھب دکھلانے لگا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے پھر اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اس کے خیالوں میں پھر ونجل رنگ بھرنے لگا تھا لیکن اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہوتا ہے، کیا کرتا ہے؟ اس سے کس طرح ملا جا سکتا ہے؟ اس کا چھوٹا سا نا پختہ ذہن محبت کی بھول بھلیوں اور ونجل کی یادوں کے میلے میں کھو کر رہ گیا اور اندر ہی اندر وہ اس کے تصورات میں ڈوبی ہوئی انہونی باتیں سوچتی رہی۔

باپ کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ انہیں پھوپھی کے حوالے کر کے جیسے پھر ایک مرتبہ ان کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ چھینا کے انتقال کی خبر بھی شاید اسے نہیں ہوئی تھی اسی لئے نہ تو خود ہی آیا تھا نہ اس کا کوئی پیغام ملا تھا۔ خرم دن بھر محلے کے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا۔ خضرا اسے منع کرتی لیکن وہ ایک نہیں سنتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب کسی کی نگرانی، کسی کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کو کوئی کہنے سننے والا نہیں تھا

ایک صبح وہ سو کر اٹھی تو پتہ چلا کہ چودھری صاحب آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑے کروفر اور لاؤ لشکر کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے وہی مطالبے اور وہی رعب و داب تھا۔ ملازم ایک ٹانگ پر کھڑے تھے۔ باورچی خانے کے سارے چولہے جلتے تھے اور ان پر دن بھر کچھ نہ کچھ پکتا ہی رہتا تھا۔ پھوپھی جو گھریلو کاموں سے تقریباً لاتعلق ہو چکی تھی چودھری صاحب کی وجہ سے پھر باورچی خانے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی تھی اور ان کے وقت بے وقت مطالبے پورے کر رہی تھی۔

خضرا اور خرم پھر اس کے گھر میں اجنبی سے ہو گئے۔ چودھری صاحب کی وجہ سے فضا میں ایک تناؤ اور غیریت سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس مرتبہ پھوپھی نے انہیں تاکید نہیں کی کہ وہ چودھری صاحب کو سلام کرنے ان کی بیٹھک میں جائیں۔ وہ خود بھی دن بھر چودھری صاحب کی بیٹھک کی طرف جانے والی راہداریوں سے دور ہی رہتے کہ کہیں ان سے سامنا نہ ہو جائے۔

شام اب خضرا کو اداس اور بے چین کر دیتی تھی۔ چھوٹے سے دل میں یادوں کا ایک البم سا امنڈ آتا تھا جو کسی کل قرار نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ اکثر کچے صحن کے آخری حصے کی طرف جاتی اور ڈوبتے ہوئے سورج کو اداس آنکھوں سے دیکھتی رہتی۔ ایک روز وہ یونہی رنجور سی کھڑی تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے نزدیک آن کھڑا ہوا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا، بھوری گھنی مونچھیں، گھٹا ہوا جسم اور چھوٹا قد، تیز چمکتی ہوئی آنکھیں وجود میں اترتی ہوئیں۔ خضرا نے جلدی سے آنچل سے سر ڈھکا۔

''سلام چا چاجی......'' اس کے ہونٹوں سے خود بخود نکل گیا۔ چھینا نے انہیں اسی رشتے سے مخاطب کیا تھا۔

''وعلیکم السلام......'' گھنی مونچھیں مسکرائیں۔ ''کیا حال ہے کڑیئے؟'' انہوں نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

''ٹھیک ہوں جی......'' خضرا زمین میں گڑی نگاہوں کے ساتھ منمنائی۔

ان کا ہاتھ اس کی پشت پر اترا۔ ''کیا نام بتایا تھا تو نے؟'' انہوں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''خضرا۔'' بے اندازہ جھجک نے اس کی آواز کو بہت مدہم کر دیا۔

''کیا......؟'' انہوں نے اس کی جانب جھک کر یوں کہا جیسے اس کی آواز نہ سن پائے ہوں۔

''خضرا......!'' خضرا نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے زور دے کر کہا۔

''اچھا، خضرا...... بڑا مشکل سا نام ہے تمہارا۔'' وہ پھر قریب آ گئے اور انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ان کی نگاہیں اس کے چہرے کو چھونے لگیں۔ خضرا کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور ہنس کر بولے۔ ''تم مجھے چاچا کیوں کہتی ہو...... میں کوئی تمہارا چاچا لگتا ہوں؟''

خضرا جھجک کر پیچھے ہٹ گئی اور اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

''چھینا جو آپ کو چاچا جی کہتی تھی۔ اس لئے میں بھی یہی کہتی ہوں۔''

''چھینا کی بات اور تھی اور تمہاری اور ہے۔'' انہوں نے ایک خاص لہجے میں کہا جو ان کی عمر سے میل نہیں کھاتا تھا۔

''کیا مطلب؟'' خضرا الجھ گئی۔

''جھلی نہ ہو تو کہیں کی...... چھینا چاچا کہتی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بھی چاچا کہنے لگو۔'' انہوں نے ہنستے ہنستے کہا۔

خضرا کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشانی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کے الجھ جانے سے محظوظ ہوئے۔

''کڑیے...... تُو مجھے ملک جی کہہ لیا کر۔'' انہوں نے اپنے بھاری ہاتھ سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''ہاں بول...... کیا کہے گی آئندہ؟''

خضرا نے اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائے۔

''بول ناں ملک جی...... چل کہہ...... ہاں بول...... ملک جی!''

خضرا پریشان سی ہو کر کبھی ان کی طرف دیکھتی، کبھی نگاہیں چرا لیتی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ اس کی سراسیمگی پر ہنستے چلے گئے۔

''میں تو تجھے خود کہہ رہا ہوں کہ آئندہ مجھے ملک جی کہا کر...... پھر بھلا تُو کیوں جھجکتی ہے؟''

خضرا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا، اپنی ہمتوں کو مجتمع کیا اور انہیں وہیں کھڑا چھوڑ

کر تیزی سے آگے نکل آئی۔

ان کے ناقابل فہم رویے نے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس سے اس قسم کی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ اس بے تکلفی سے ان کا کیا مقصد تھا؟ وہ الجھ سی گئی اور ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ زنان خانے کی طرف زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ شام کو وہ آنگن میں چہل قدمی کرتے رہتے یا کسی گھنے درخت کے نیچے کرسی ڈلوا کر بیٹھ جاتے اور حقہ پیتے رہتے۔ خضرا کمرے میں دبکی ہوئی انہیں دزدیدہ نگاہوں سے تکتی رہتی۔ اسے ان کی سرخ ڈوروں والی آنکھوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے بار بار وہم ہوتا تھا کہ وہ بڑی بڑی سرخ آنکھیں اسے ہی تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اسے جھرجھری سی آ جاتی۔ وہ ان کی چبھتی ہوئی نگاہوں کے خوف سے کانپ اٹھتی اور کمرے میں یوں دبک کر بیٹھ رہتی کہ باہر جانے کا نام نہ لیتی۔

ایک شام وہ صحن میں حقہ لے کر بیٹھنے کی بجائے رہائش کی طرف چلے آئے اور بلند آواز میں بولے۔ ''کہاں ہے وہ کڑی...... بلاؤ اسے؟''

خضرا نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھوپھی اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ خرم کہیں آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا اور ارد گرد راجاں یا کوئی دوسری ملازمہ بھی نہیں تھی۔ ان کی ایسی جوتیوں کی چرمراہٹ اسی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ خضرا بے طرح گھبرائی۔ اس دروازے کے سوا باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا جس طرف سے وہ چلے آتے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ تب تک وہ دروازے پر آن رکے۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''کہاں رہتی ہو تم...... ؟ نظر ہی نہیں آتی؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

خضرا نے آنچل کا ایک کونہ ہونٹوں میں دبا لیا۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے کمرے کے اندر آ گئے

''میں نے سمجھا کہیں چلی گئی ہو۔ تمہاری تو آواز تک سنائی نہیں دیتی۔'' وہ کہنے لگے۔

خضرا شانے سکیڑے سر جھکائے چپ کھڑی رہی۔

''تم بولتی کیوں نہیں؟ کوئی بات کرو ناں...... میری بات کا جواب ہی دے دو۔'' وہ چند قدم آگے بڑھے۔

خضرا گھوم کر پلنگ کے دوسری طرف چلی گئی۔

وہ ہنسے۔ ''ڈرتی ہو مجھ سے...... بھلا کیوں......؟''

خضرا نے ان کی بات ان سنی کر کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اسی وقت پھوپھی کمرے میں داخل ہوئی۔ ملک جی کو دیکھ کر وہ قدرے ٹھٹکی اور اپنی چادر کو ماتھے تک کھینچ لیا۔ خضرا نے اطمینان کا سانس لیا۔ ملک نہ گھبرائے نہ پریشان ہوئے۔ بڑے ا
کے ساتھ بظاہر سرسری سے لہجے میں پھوپھی سے مخاطب ہوئے۔

''بھرجائی...... ٹیکسوں کے سلسلے میں ایک عرضی لکھانی تھی۔ یہ لکھ لے گی عرضی انگریزی میں؟'' انہوں نے خضرا کی طرف اشارہ کیا۔

خضرا نے غیر ارادی طور پر زور زور سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''دھیئے اگر تجھے آتی ہے انگریزی لکھنی تو لکھ دے۔'' پھوپھی نے اسے مخاطب کیا۔

''نہیں پھوپھی جی...... مجھے نہیں آتی۔'' اس نے زوردار لہجے میں انکار کیا۔

''شرماتی ہے...... بالڑی ہے ناں۔'' ملک جی نے سر ہلایا۔

خضرا نے سراسیمگی سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔

''پھوپھی جی...... مجھے نہیں آتی...... واقعی نہیں آتی۔''

''اچھا بھئی...... نہیں آتی تو نہ لکھو۔ کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔'' ملک جی نے نرمی سے کہا۔

''ہاں بھائی جان...... یہ زیادہ بڑی جماعت میں نہیں تھی۔ اور کہیں کچھ غلط ہی نہ دے تو بعد میں خوانخواہ کی مصیبت بنے۔'' پھوپھی نے جیسے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''نہیں، نہیں...... کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ چلو کام گھر میں ہی ہو جائے۔ اگر یہ نہیں لکھ سکتی تو ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ اتنا کہتے ہوئے بڑے اطمینان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔ خضرا اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

☸......☸

رات کا کھانا کھائے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ راجاں بستر لگا رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید کسی ملازم نے دروازہ کھولا۔ ڈیوڑھی اور برآمدے کی جانب

سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پھر کسی نے تیز قدموں سے صحن پار کیا اور کمرے کے باہر کوئی پکارا۔

''آپا کہاں ہے......؟''

خرم اور خضرا ٹھٹک گئے۔ انہیں پہچاننے میں دیر نہیں تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خضرا سراسیمہ سی ہو گئی۔ باپ کی آواز نے اس کے دل میں خوف جگا دیا۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی یہ وسوسہ دل میں جاگ اٹھا کہ کہیں وہ انہیں اس گھر سے بھی محروم نہ کر دے جہاں پھوپھی کی شفقت تھی اور ونجل سے ملنے کی موہوم امید۔

ونجل کے تصور کے ساتھ ہی اس کے ارمانوں بھرے دل میں اس کی میٹھی باتیں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پھوپھی سے کہے گا کہ وہ باپ سے بات کرے۔ خضرا کو اس کے لئے مانگ لے...... لیکن اس وقت...... رات کے اندھیرے میں بھلا اسے کیسے خبر ہو گی کہ باپ گھر پر آیا ہوا ہے؟ اسے کون بتائے گا کہ باپ گھر آ گیا ہے...... ونجل کا تو خود پتہ نہیں تھا کہ وہ کدھر ہے؟

بلند آواز میں رونے اور بین کرنے کی آواز نے اسے ان تلخ و شیریں سوچوں سے چونکا دیا۔ وہ اٹھ کر کمرے کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ خرم بھی اس کے ساتھ تھا۔ برآمدے میں باپ اور پھوپھی ایک دوسرے کے گلے سے لگے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے...... خضرا کا دل ڈوبنے لگا...... رونے اور بین کرنے کی آوازوں میں اسے چھینا کی سسکیاں اور کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کا اذیت سے تپتا ہوا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو امنڈ آئے۔ وہ چپ چاپ کھڑی انسوؤں سے اپنے رخسار بھگوتی رہی۔

راجاں نے آگے بڑھ کر غم سے نڈھال پھوپھی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ باپ نے پھوپھی کو خود سے علیحدہ کیا اور اسے بازو میں تھامے ہوئے آنسو پونچھتا اسی کمرے کی طرف بڑھا جہاں خضرا اور خرم کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں جلدی سے دروازے میں سے ہٹ گئے کہ انہیں راستہ دیں۔

''پانی لاؤ ذرا......'' باپ نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

خضرا دروازے کی طرف لپکی تو دیکھا راجاں خود ہی پانی کا گلاس لئے چلی آئی ہے۔

خضرا نے اس کے ہاتھ سے پانی لے لیا اور گلاس باپ کی طرف بڑھایا۔ باپ پھوپھی تسلیاں دیتے ہوئے اسے پانی کے ایک دو گھونٹ پی لینے پر مجبور کرنے لگا۔ خضرا اور خ حیرت سے باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا یہ روپ ان کے لئے نیا اور حیران دینے والا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ باپ کو غصے میں جلتے بھنتے، شور مچاتے، گالیاں بکتے ا چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹختے ہی دیکھا تھا لیکن آج اس کی آنکھوں میں آنسو تھے...... اس کا ل نرم تھا اور وہ پھوپھی کے قریب بیٹھا دکھ اور افسوس میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس ہونٹوں پر محبت کے لفظ تھے۔ خضرا کو باپ کا یہ روپ بے حد اچھا اور اپنا اپنا سا لگا۔ اس پہلی بار اس کے لئے دل میں ایک قربت سی محسوس کی۔

پھوپھی کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس نے آنسو پونچھ دیئے اور باپ کھانے کے بارے میں پوچھنے لگی لیکن اس نے کچھ بھی کھانے یا پینے سے انکار کر دیا۔ ا کا کہنا تھا کہ وہ ویگن کے اڈے سے ہی کھانا وغیرہ کھا کر آیا ہے۔ خضرا اور خرم چپ چا بیٹھے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ باپ نے نہ انہیں مخاطب کیا نہ ان کی طرف غور دیکھا۔ وہ پھوپھی سے چھینا کے آخری لمحوں کے بارے میں پوچھتا رہا، بار بار اظہار افس کرتا رہا۔ اٹھنے لگا تو اس نے ایک بھرپور نگاہ دونوں پر ڈالی اور پھوپھی کی طرف پلٹ بولا۔

''یہ دونوں ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں نا تمہارے ساتھ...... اڑی تو نہیں کرتے؟''

''نہیں نہیں...... دونوں بہت بیبے ہیں۔'' پھوپھی نے محبت سے کہا۔ ''اور خضرا تو میرے لئے چھینا کا بدل ہے...... میرا بہت خیال رکھتی ہے۔''

خضرا نے محسوس کیا کہ باپ کی نگاہ پھر اس کے سراپے پر ہے۔ اس نے شانے سکو نگاہ جھکا لی۔ باپ نے پھوپھی سے دبے لہجے میں کہا۔ ''آپا! یہ تو سیانی ہو گئی ہے۔ چھینا طرح ہی لگتی ہے۔'' پھر ایک نگاہ دونوں پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھوپھی سونے کے لئے لیٹ گئی۔ خضرا غسل خانے میں جانے کی غرض سے کم سے نکلی جو کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ راہداری میں کم روشنی کا نیلا بلب روشن تھا۔ وہ اپنی ہی میں کھوئی ہوئی، اپنے خیال میں قدم اٹھا رہی تھی کہ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اچا ٹھٹھک کر اس نے دیکھا، ہاتھ میں جلتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ ملک جی عین اس کے سا

رک گئے تھے۔

''کہاں جا رہی ہو خضرا......؟'' انہوں نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔

خضرا ٹھٹک گئی...... اس نے بغیر کچھ کہے پلٹ جانا چاہا۔ انہوں نے فوراً ہی اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ذرا ٹھہرو تو سہی......'' وہ بولے۔

''نہیں نہیں......'' خضرا نے گھبرا کر کہا اور اپنا بازو چھڑانے کی سعی کی۔

''کبھی کوئی بات ہی کر لیا کرو......'' انہوں نے گھنی مونچھوں والا چہرہ بہت قریب لا کر کہا۔

''ہائے اللہ......'' خضرا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور اس نے پورا زور لگا کر اپنا بازو چھڑایا اور اندھا دھند اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ پھوپھی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا خضرا؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''کچھ نہیں پھوپھی جی...... میں اندھیرے میں ڈر گئی تھی۔'' خضرا نے خشک حلق کے ساتھ بمشکل چند لفظ اگلے۔

''نہ دھیئے...... ڈر کس بات کا...... اپنے گھر میں نہیں ڈرتے...... چل شاباش، آیت الکرسی پڑھ کر سو جا۔'' پھوپھی نے تسلی دی۔

خضرا جلدی سے بستر میں دبک گئی۔ تھوڑی دیر پہلے بیتے ہوئے لمحے پھر اس کے گرد آن کھڑے ہوئے۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے سر سے پاؤں تک چادر لپیٹ لی اور تکیے میں منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگی۔

اگلی صبح باپ یہیں پر تھا۔ پھوپھی نے بتایا کہ چودھری صاحب نے اسے روک لیا ہے۔ انہیں اس کے ساتھ کوئی ضروری کام تھا۔ خضرا اور خرم کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ باپ کبھی گھر پر نہیں ٹکتا تھا اور نہ ہی انہیں کوئی ایسا دن یاد تھا جو باپ نے ان کے ساتھ گھر میں گزارا ہو۔ آج بھی وہ زنان خانے کی طرف نہیں آیا اور دن بھر بیٹھک میں چودھری صاحب اور ملک جی کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ کھانا اور چائے اسی طرح بھجوائی جاتی رہی۔ وقفے وقفے سے حقہ تازہ کیا جاتا رہا۔

خضرا کے من میں ننھی منی معصوم تمنائیں جگمگانے لگیں۔ وہ آرزوئیں جو دُجل نے اس

کے دل کی زمین میں بو دی تھیں، وہ انجانے پن میں پھلنے پھولنے لگیں۔ ونجل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چودھری صاحب کو اس کے بارے میں بتائے گا، وہ اس کی بات نہیں ٹالیں گے اور اسے اس کے باپ سے ہمیشہ کے لئے مانگ لیں گے۔ اسی لئے چودھری صاحب کا ضروری کام اس کے سارے وجود میں کلیوں کی طرح چٹک رہا تھا۔ اس کی معصوم خواہشوں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ چودھری صاحب کو باپ کے ساتھ یہی ضروری کام ہے...... اس کے اندر نغمے نے انگڑائی لی اور وہ اپنے اور ونجل کے بارے میں بڑی خوبصورت، خوبصورت باتیں سوچنے لگی۔

دوسرا دن چڑھا۔ باپ ابھی تک وہیں تھا اور چودھری صاحب کے ساتھ اس کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ خضرا کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس کا رواں رواں کسی گدگدا دینے والی خبر کا منتظر تھا۔ دوپہر ڈھلی اور دھوپ چھاؤں کا منظر ساری حویلی میں پھیل گیا۔ چودھری صاحب باپ کے ساتھ زنان خانے کی طرف آئے، پھوپھی سے کو بات کی اور پھر اپنی بیٹھک کی طرف چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی پھوپھی کچھ پریشان، کچھ بدحواس سی کمرے میں سے نکلی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں راجاں اور صاحباں کو پکارنے لگی وہ اپنے کام چھوڑ چھاڑ کر آواز کی طرف لپکیں۔ پھوپھی نے ان سے نہ جانے کیا کہا کہ انہوں نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں ایک دوسری کی طرف دیکھا اور باورچی خانے کی طرف بھاگ گئیں۔

پھوپھی کمرے میں آئی۔ خضرا کو تجسس بیتاب کرنے لگا لیکن وہ پھوپھی سے کچھ پوچھ نہیں سکی۔ پھوپھی نے قریب آ کر اسے گلے سے لگایا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھی...... پھوپھی۔ اس کی پیشانی چومی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اس کا بازو تھامے ہوئے اسے ساتھ میں لے گئی۔ اس نے ایک بڑا سا لوہے کا صندوق کھولا اور اس میں سے گوٹے کناری سے سجا ہوا سرخ ریشمی جوڑا نکالا اور خضرا کی طرف دیکھ کر رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''خضرا...... میں نے یہ جوڑا چھینا کے لئے بنایا تھا۔ اس پر گوٹا کناری میں نے اپنے ہاتھوں سے لگائی ہے دھیئے...... پر یہ چھینا کے مقدروں میں نہیں تھا۔ تُو بھی میرے چھینا جیسی ہے، میری اپنی دھی ہے...... اب اسے تُو پہن...... میں سمجھوں گی میری تیرے روپ میں زندہ ہو گئی ہے۔

خضرا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھی نظروں سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ پھوپھی نے شلوار میں سرخ ازار بند ڈالتے ہوئے پھر کہا۔

''شاباش دھیئے...... منہ ہاتھ دھو کر یہ جوڑا پہن لے۔ اللہ تیرے نصیب اچھے کرے۔''

خضرا بھونچکی سی رہ گئی۔ وہ اتنی ناسمجھ بھی نہیں تھی کہ پھوپھی کی بات کا مطلب نہ سمجھتی۔ اس نے پریشانی سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔

''پھوپھی...... یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''تیرا نکاح ہے دھیئے...... تیرا نکاح ہے...... تیرا باپ بیچارا بھی کیا کرے...... اسے ہر وقت تیری ہی فکر رہتی ہے۔ تیری ماں کچھ کرنے جوگی ہوتی تو اپنے ہاتھ سے تیرے شگن کرتی۔ پر اب تو مجبوری ہے۔ بس اللہ تیرے مقدر اچھے کرے۔'' پھوپھی نے گویا تفصیل سمجھائی۔

خضرا ساکت سی ہو کر پھوپھی کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ اتنا بھی نہیں پوچھ سکی کہ اس کا نکاح کس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس اچانک افتاد نے اسے بری طرح سے سہما دیا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

پھوپھی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''چل نا کڑیئے...... منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جا، چودھری صاحب کے بندے مولوی کو لے کر آتے ہی ہوں گے۔ چل شاباش میری امی...... آج تیری بہن چھینا ہوتی تو سارے ارمان نکالتی۔ اپنے ہاتھ سے تجھے تیار کرتی۔ ووہٹی بناتی...... پر......'' پھوپھی کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اور اس نے خضرا کو گلے سے لگا لیا۔

خضرا جیسے بے جان سی ہو کر پھوپھی کے بازوؤں میں گھری کھڑی رہی۔ پھوپھی کے آنسو اس کے شانے پر بہتے رہے۔ اس کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں اور وہ اس کی گرفت میں جیسے پتھر ہو گئی...... پھوپھی نے پھر شدتِ غم سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں دوہرایا۔

''ہائے خضرا...... آج چھینا ہوتی...... تو سارے ارمان پورے کرتی...... تجھے اپنے ہاتھوں سے ووہٹی بناتی......!!''

ووہٹی بننے کے نام پر خضرا کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا ننھا سا دل ماں کے لئے ہڑکنے لگا۔ ایک عرصے بعد ماں اسے اتنی شدت سے یاد آئی۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو اسے بغیر

بتائے، اس سے بغیر پوچھے اسے دلہن بننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی ماں ضر[ور] باپ کے مقابلے میں آن کھڑی ہوتی اور اسے اپنی پناہ میں لے لیتی۔ لیکن اس وقت کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ پھوپھی اس سے پیار کرتی تھی لیکن چودھری صاحب کی مرضی میں بھی خوش تھی۔ باپ اس کے لئے کبھی شفقت کی علامت نہیں رہا تھا۔ اس کا خوف ا[س] طرح روئیں روئیں میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اس سے نگاہ اٹھا کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پھوپھی نے گوٹے کناری سے بھرا ہوا سرخ سوٹ اس کے بازو پر ڈال دیا اور اسے چمکار کر بولی۔

''شاباش میری دھی...... چل یہ سگنوں کا جوڑا پہن کر تیار ہو جا...... دیر نہ کر۔''

خضرا کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے۔ یہ سرخ جوڑا پہن لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فضا میں اجنبیت کی بُو بس گئی تھی۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ انکار کا لفظ ہونٹوں پر لانا بھی قیامت ہو گیا تھا۔ چاروں طرف خوف کا پہرہ تھا۔ اسے چپ چاپ سرخ جوڑا پہن لینا پڑا۔ لپے اور کرن سے سجا ہوا دوپٹہ اوڑھنا پڑا۔ ایک بددل اور مجبور دلہن بن کر وہ دوسرے کمرے میں آئی تو خرم اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ارے آپی...... تم کہاں جا رہی ہو؟'' اس نے استعجاب سے پوچھا۔

خضرا کا مجبور و بے بس دل بری طرح سے امنڈ آیا۔ اجنبیت کی پُر ہول فضا میں خرم اسے اپنا اپنا سا لگا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ روتے ہوئے اس کے گلے سے لگ گئی۔ کبھی کے رکے ہوئے آنسو اس کے شانے، اس کے بال بھگونے لگے۔ خرم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ حیران سا اس کے بازوؤں میں گھبرا بار بار پوچھ رہا تھا۔

''آپی کیا ہوا...... تم کیوں رو رہی ہو...... تم کہاں جا رہی ہو؟''

خضرا کے پاس اس کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا جس کا قد بھی اس کے شانے سے کم تھا۔ وہ بھی اس کی طرح بے بس تھا۔ اس کو بتانے سے کیا حاصل تھا۔

''خضرا بی بی...... خضرا بی بی!......'' راجاں کی آواز پر وہ خرم سے علیحدہ ہوئی، دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے راجاں کی طرف دیکھا۔

''آ بی بی...... تجھے پھولوں کا زیور پہنا دوں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹوکری

میں سے موتیے کے گجرے نکالے۔

خضرا ساکت سی کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ خرم بھی کچھ سہم سا گیا۔ راجاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور اس کے بازو میں موتیے اور گلاب کے پھولوں سے گندھا ہوا گجرا باندھتے ہوئے وہ ذرا قریب ہوئی اور رازداری سے بولی۔

''خضرا بی بی! تیری پھوپھی نے تیرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

خضرا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کبھی کسی نے اچھا نہیں کیا تھا۔ تو وہ پھوپھی سے کیا توقع رکھ سکتی تھی۔ وہ آنکھوں میں آ جانے والے آنسو ضبط کرتی اپنی کلائیوں میں موتیے کے گجرے بندھواتی رہی۔

راجاں نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور دبی زبان سے بولی۔

''تیرے ابے کو بھی کچھ خیال نہ آیا ...... تیری ماں کہاں ہے خضرا بی بی؟ جیتی ہے یا مر گئی؟ جو تیرا ابا دوسری شادی کر رہا ہے۔''

''دوسری شادی......؟'' خضرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں دوسری شادی۔'' اس نے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ''تیرے وٹے میں وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ ملک جی کی سوتیلی بیٹی سے...... اس نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ ملک جی کی تین بیویاں پہلے ہی موجود ہیں۔ رنڈیوں کے پاس بھی آنا جانا ہے۔ ہمیشہ شرعی بیویاں رکھتے ہیں۔ کسی کو طلاق دی، کوئی مر مکا گئی تو چار دن صبر نہیں کرتے، نئی لے آتے ہیں...... ملکانی نوراں کو گزرے دوسرا مہینہ ہے اور انہوں نے نوراں کی پچھ لگ لڑکی کے وٹے میں تیرا رشتہ مانگ لیا...... غضب خدا کا تیرا باپ تو اندھا ہو گیا تھا۔ تیری پھوپھی نے بھی نہیں سوچا۔ تُو تو ملک جی کی بیٹیوں کے برابر ہے۔''

خضرا کا دل ڈوبنے لگا۔ جو سوال اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا اسے اس کا جواب مل گیا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ گھورتی ہوئی آنکھوں اور گھنی مونچھوں والا چہرہ اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو حقیقت بن کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر سرخ جوڑا تھا۔ راجاں اسے پھولوں کا زیور پہنا رہی تھی اور چودھری صاحب کے بندے مولوی کو لینے گئے ہوئے تھے۔

وہ جیسے چاروں طرف سے گھر گئی تھی۔ زندہ دیوار میں چنی جا رہی تھی۔ نہ کوئی فرار کا

راستہ تھا نہ نجات کا ذریعہ...... اس کی آنکھوں سے آنسو پوری شدت کے ساتھ بہنے لگے۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''میں کیا کروں راجاں؟''

راجاں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بالکل اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بولی۔

''خضرا بی بی...... میں چوری چھپے تمہیں یہاں سے نکال تو دوں مگر تم جاؤ گی کہاں......؟ جوان جہان لڑکی ہو...... زمانہ بہت برا ہے۔ کوئی ایسا عزیز رشتہ دار ہے جو تمہیں جھل لے...... جو تیرے ابے کے سامنے کھڑا ہو سکے۔''

خضرا کی سوچ دور تک گئی۔ اس کی زندگی میں کوئی بھی اپنا نہیں تھا جس نے اسے اپنائیت اور تحفظ کا احساس دیا ہو۔ جس کی چھاؤں میں، جس کی آڑ میں وہ پناہ لے سکے۔ اس کے لئے تو ماں بھی ٹھنڈی چھاؤں نہیں تھی۔ اگر وہ ماں کے پاس چلی بھی جاتی تو باپ منٹوں میں اسے ماں کے ہاتھوں سے چھین کر لے آئے گا۔ تو پھر وہ کس کے پاس جائے...... کون ایسا تھا جو اسے پناہ دے سکے۔ جو اس کے لئے ساری دنیا سے ٹکر لے سکے۔

اس کے دل نے چپکے سے ایک نام لیا...... اسے ڈھارس سی ہو گئی۔ اسے نجات کا راستہ نظر آنے لگا۔ اس نے بچوں کی سی بیتابی کے ساتھ راجاں سے استفسار کیا۔

''راجاں...... ونجل کہاں رہتا ہے؟''

''کون......؟'' راجاں نے یوں پوچھا جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا ہو۔

''ونجل......'' خضرا نے یقین سے دوہرایا۔

''ونجل...... ونجل چودھری؟'' راجاں نے جیسے تصدیق کرنے کو پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... وہی......'' خضرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہا...... خضرا بی بی...... اس موت جوگے نے تجھے بھی نہیں چھوڑا......؟'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

''کیا مطلب......؟'' خضرا کچھ نہ سمجھی۔

''جھلیئے...... اس کی تو دو بیویاں ہیں۔ ایک عورت کو اس نے گھر میں ڈالا ہوا ہے۔ تجھے بھی اس نے کوئی لارا لگایا ہے؟'' راجاں نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

خضرا کو محسوس ہوا جیسے وہ انتہائی بلندی سے نیچے ہی نیچے گرتی چلی جاتی ہے۔ اس ک

چھوٹا سا معصوم ذہن سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس حد تک بھی غلط بیانی کی جا سکتی ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کیوں کی جاتی ہیں...... گھر میں عورت ڈالنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ وہ تو اپنی سادہ لوحی میں یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ ونجل کو اس سے محبت ہے...... وہ اس پر جان دیتا ہے...... وہ اس کے لئے جان پر کھیل سکتا ہے۔ لیکن راجاں کے منہ سے نکلے ہوئے لفظوں نے اس کے اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کا یقین جل کر خاکستر ہو گیا۔ وہ اتنا بڑا صدمہ سہہ نہ سکی اور غیر ارادی طور پر راجاں کے گلے سے لگ کر سسکیوں کے درمیان بولی۔

''راجاں مجھے بتاؤ...... میں کیا کروں؟ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

خرم بھی قریب آیا اور پریشانی سے بولا۔ ''آپی...... کیا بات ہے؟''

راجاں نے محبت کے ساتھ اس کی پشت تھپتھپائی اور بے چارگی کے لہجے میں بولی۔

''دھیئے میں تجھے کیا بتاؤں...... میری اوقات ہی کیا ہے...... میں کمین تجھے کیا بتا سکتی ہوں...... میں نے تیرے جیسی ملوک کڑیوں کو چودھری اور ملکوں کے آگے ہارتے ہی دیکھا ہے...... یہ بڑے ڈاڈے ہیں...... اپنی کرتے ہیں...... اپنی منواتے ہیں۔'' اس نے ایک طویل سرد آہ بھری۔ ''کچھ نہ پوچھ دھیئے...... کچھ نہ پوچھ...... میری اس بڈھی جنڈڑی نے بڑا کچھ دیکھا ہے...... ان چودھریوں نے دھیوں کے ارمان زہر کے پیالوں میں ڈبو دیئے ہیں...... چھینا بھری جوانی میں یوں ہی تو قبر میں نہیں اتر گئی۔''

❁......❁

''راجاں...... راجاں...... تیار کیا تُو نے خضرا کو......؟'' پھوپھی بدحواسی میں پکارتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ''مولوی صاحب آ گئے ہیں۔''

راجاں گھبرا کر خضرا سے علیحدہ ہو گئی۔ ''ہاں چودھرانی...... کاکی تیار ہے۔''

خضرا نے آنسو پونچھتے ہوئے پھوپھی کی طرف بے چارگی سے دیکھا...... پھوپھی نے بڑے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا...... اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے لیکن ہونٹ چپ تھے۔ غم واندوہ میں ڈوبی وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے جھک کر خضرا کا چہرہ دیکھا۔

''صدقے جاؤں...... میری دھی کتنی سوہنی بنی ہے۔'' اس نے خضرا کی پیشانی پر بوسہ

دیا اور کرن نکلے ہوئے سرخ دوپٹے سے اس کا سر ڈھکتے ہوئے لمبا سا گھونگھٹ نکال اور راجاں سے بولی۔

''بس مولوی جی آنے ہی والے ہیں..... تو دوڑ کر صحباں کو بلا..... تم دونوں چادر پکڑ سامنے کھڑی ہونا۔''

پتہ نہیں راجاں کمرے سے گئی یا نہیں..... خضرا کو کچھ پتہ نہیں چلا..... اس کے لئے ساری دنیا اس لمبے زرتار گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ گھونگھٹ کے اندر تاریکی تاریکی تھی اور اس کے پار کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی اس میں آکر ختم ہوگئی ہے۔ اس سے آگے نہ کوئی امنگ تھی نہ آرزو۔ دھند ہی دھند..... گھٹن گھٹن..... خضرا کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھوں پیروں سے جان نکلنے لگی۔

اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا..... در و دیوار لرز اٹھے..... چیخیں اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''ہائے ربا خیر.....'' پھوپھی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی اور وہ بدحواسی میں راجاں کو بلند آواز میں پکارنے لگی۔ گرد و پیش سے بے خبر بیٹھی ہوئی خضرا نے بھی گھونگھٹ الٹ کر چاروں طرف خوفزدہ آنکھوں سے دیکھا۔ راجاں دھائی دیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''ہائے..... ہائے..... چودھرانی..... ہائے..... ہائے..... زمان نے چودھری صاحب کو گولی مار دی۔'' وہ سینے پر دوہتڑ مارتی ہوئی چلائی۔

''خیر..... خیر مانگ..... کیا بکواس کر رہی ہے؟'' پھوپھی نے بے ساختہ کہا اور افراتفری میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ خضرا وہیں ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

''آپی..... آپی.....'' خرم نے اس کا شانہ ہلایا۔ ''چلو..... امی کے پاس چلتے ہیں۔''

''امی.....؟'' خضرا چونک کر گرد و پیش میں واپس آتے ہوئے بولی۔

''جلدی کرو آپی..... آؤ بھاگ چلیں..... نہیں تو وہ تمہاری شادی ملک جی سے کر دیں گے۔'' خرم نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ملک جی کا نام سنتے ہی اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے خوفزدہ آنکھوں سے خرم کی طرف دیکھا.....

''خرم! اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''کوئی نہیں دیکھتا..... سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ تم جلدی کرو آپی! جلدی کرو.....'' خرم نے تیزی سے کہا اور دوڑ کر دروازے تک گیا تاکہ راہداری میں آنے جانے والوں کو دیکھ سکے۔ پھر عقب میں پلٹ کر واپس آیا اور تیزی سے بولا۔

''آپی..... ابھی سب اسی طرف لگے ہلوئے ہیں۔ ہم پچھلے دروازے سے نکل جائیں گے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ سب لوگ بیٹھک کی طرف ہیں۔'' خرم نے پھر اس کا بازو کھینچا۔

خضرا جیسے ہوش میں آگئی۔ وقت کی نزاکت نے اسے جرأت بخش دی۔ اس نے جلدی جلدی اپنی کلائیوں سے موتیے کے گجرے نوچے۔ انگلی سے انگوٹھی کی گرہ کھولی۔ سرخ دمکتا ہوا دوپٹہ اتارا اور پھوپھی کی پرانی چادر لپیٹ لی جس نے اس کے سرخ جوڑے کو کسی حد تک چھپالیا۔

''آؤ..... آؤ آپی..... جلدی سے.....'' خرم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

دونوں دبے پاؤں چوروں کی طرح قدم رکھتے ہوئے کمرے کے پچھلے دروازے سے نکلے..... راہداری میں پھیلی ہوئی تاریکی میں خوف اور وحشت گھلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سے شور اور دوڑتے ہوئے قدموں کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس نے خرم کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتی آگے بڑھی۔ وہ حویلی کے پچھواڑے بہت کم آتی تھی اس لئے راستے سے واقف نہیں تھی۔ اندھیرے نے نظر کے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ خضرا کو تو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس جانب چلے جا رہے ہیں۔ لیکن خرم شاید پہلے بھی پچھلا دروازہ استعمال کرتا رہا تھا اس لئے وہ نسبتاً اعتماد کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر جلدی چلنے کے لئے کہتا تھا۔ اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتے وہ راہداری میں سے ہوتے ہوئے پچھلی طرف کے بیکار پڑے ہوئے گودام میں داخل ہوئے۔ خرم نے جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

''اس کا ایک دروازہ گلی کی طرف بھی ہے۔ کوئی اس طرف آیا تو اسے دروازہ بند ملے گا۔'' وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔ کمرے میں تاریکی اور گہری ہوگئی۔ خضرا کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ اس کا دل سینے کی دیواروں کو توڑنے لگا۔ خرم اندازے سے

باہر نکلنے والا دروازہ تلاش کرتا ہوا بولا۔

''آپی......میرے ساتھ ساتھ رہنا۔''

خضرا نے بینائی سے محروم لوگوں کی طرح خرم کی آستین مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ خضرا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''چپ...... آپی چپ......'' خرم نے سرگوشی کی اور تیزی کے ساتھ ٹٹولتے ہوئے ا دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دستک میں تیزی آگئی۔ ساتھ کوئی کچھ کہہ بھی رہا تھا لیک پریشانی اور بدحواسی میں وہ پہچان نہیں پا رہے تھے کہ وہ کس کی آواز تھی۔ نہ ہی کچھ سنا دے رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے......

دروازے تک پہنچنا محال ہو گیا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا...... خدا خدا کر خرم کا ہاتھ دروازے پر پڑا۔ اس نے جلدی سے کنڈی کھولی اور دونوں نے قدم باہر گ میں رکھے۔ خرم نے پلٹ کر دروازے کی باہر والی چٹخنی چڑھا دی۔

''تمہیں راستے کا کچھ پتہ ہے خرم......؟'' خضرا نے چادر میں اپنا وجود چھپاتے ہو پریشانی سے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... مجھے سب پتہ ہے۔'' وہ جلدی سے بولا اور ایک سیلی ہوئی تن تاریک گلی میں گھس گیا۔ خضرا کے من میں ہول اٹھنے لگے۔ حویلی کی اونچی دیواروں س باہر آ کر غیر محفوظ اور بے سائباں ہونے کا احساس سا ہو گیا۔ وہ اپنے آپ میں ہی سم ہوئی خرم کے ساتھ تیزی سے قدم اٹھا رہی تھی لیکن اس کا ذہن بے طرح الجھا ہوا تھا پکڑے جانے کا خوف اور آنے والے وقت کے اندیشے اسے اندر ہی اندر کھا رہے تھے اس نے خرم کا بازو پکڑ کر آہستگی اور تشویش سے پوچھا۔

''خرم......ہم جائیں گے کہاں؟''

''امی کے پاس اور کہاں؟'' خرم کے لہجے میں اشتیاق کی کھنک تھی۔

''وہاں تو ابو آ کر ہمیں ڈھونڈ لیں گے اور ملک جی......'' خضرا نے سہمے ہوئے اندا میں اندیشہ ظاہر کیا۔

''کوئی بات نہیں...... امی کچھ نہ کچھ کر لیں گی...... میں ان کو بتاؤں گا کہ ملک صاح

کتنی بڑی عمر کے ہیں اور ان کی تین بیویاں بھی ہیں۔'' خرم نے جوش سے کہا۔

خضرا کو حوصلہ ہوا۔ چھوٹا سا خرم اسے اپنی عمر سے بہت بڑا معلوم ہونے لگا۔ غیر محفوظ ہونے کا جو جان لیوا احساس اس کے ذہن پر طاری تھا اس میں کچھ کمی آئی۔

''خرم تمہیں اسٹیشن کا راستہ پتہ ہے؟'' خضرا نے پوچھا۔

''ہاں پتہ ہے۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔

خضرا کو حیرت ہوئی اور کچھ شک بھی۔ ''خرم! تمہیں واقعی پتہ ہے یا یونہی کہہ رہے ہو؟''

''پتہ ہے...... پتہ کیوں نہیں...... میں تو کئی دفعہ پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اندر بھی گیا ہوں۔'' خرم نے تفصیل سے بتایا۔

''اچھا......'' خضرا کو قدرے تسلی ہوئی اور وہ بغیر سوچے سمجھے نگاہ جھکائے خرم کے ساتھ ساتھ چلتی چلی گئی، ان انجان گلیوں میں جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر کس منزل کی طرف جا رہی ہیں۔

رات کی تاریکی نے ان چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں کو پوری طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کہیں کہیں کسی گھر کے باہر کوئی بلب روشن تھا یا کھڑکیوں اور دریچوں میں سے روشنی کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں چھن چھن کر باہر گلی میں آن گری تھیں۔ خضرا من ہی من میں ڈر رہی تھی کہ کہیں کوئی ان کا پیچھا نہ کر رہا ہو...... کہیں کوئی انہیں روک کر کچھ پوچھ نہ لے۔ کہیں کسی کو ان پر شک نہ ہو جائے...... بھول بھلیوں ایسی گلیاں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ لیکن اسٹیشن تھا کہ آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کچھ پریشان ہو کر خضرا نے پھر خرم سے پوچھا۔

''خرم! تمہیں صحیح راستے کا تو پتہ ہے نا؟''

خرم نے پہلے کی طرح مستعدی سے جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے مدہم سے لہجے میں بولا۔

''آپی...... مجھے راستے کا پتہ ہے...... میں دن کو کئی مرتبہ ان گلیوں میں سے گزرا ہوں۔ مگر پتہ نہیں اس وقت اندھیرے میں یہ راستے بدل کیوں گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

خضرا دھک سے ہو گئی۔ اس نے خرم کے ہاتھ پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ خوفزدہ

نظروں سے گلیوں میں پھیلی ہوئی تاریکی کو دیکھا جو ہر لمحے پہلے کی نسبت زیادہ دبیز اور گمبھ
ہوتی چلی جا رہی تھی۔ فضا کی اجنبیت اور بڑھ گئی۔ خوف نے سارے وجود میں اپنے
پنجے گاڑ دیئے۔ وہ روہانسی ہوگئی۔

''خرم! اب ہم کیا کریں گے؟''

''کچھ نہیں ہوتا آپی...... کسی سے پوچھ لیں گے۔'' خرم نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''اگر کسی کو شک پڑ گیا کہ ہم گھر سے بھاگے ہوئے ہیں تو......؟'' خضرا لرز کر بولی۔

''آپی...... اگر تم ڈرو گی تو پھر مجھے بھی ڈر لگے گا۔'' خرم نے بچوں کے سے بھولپ
سے کہا۔

خضرا کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ دونوں اندر ہی اندر سہمے ہوئے ایک ان دیکھ
منزل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے...... گلیاں، مکانوں کے چھجوں سے گھری ہو
گلیاں...... سنسان ہوتی ہوئی گلیاں...... خوف سے لدی ہوئی گلیاں...... جیسے جیسے وقت
گزرتا تھا، ان کے خوف میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان کی امید ٹوٹتی اور ان کے پاؤں میں چل
کی سکت ختم ہوتی جاتی تھی۔

''آپی...... تمہارے پاس پیسے ہیں؟......'' اچانک خرم نے پوچھا۔

خضرا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ گھ
سے باہر انہیں پیسوں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اس نے پریشانی سے کہا۔

''نہیں خرم! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔''

خرم نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر کچھ حاصل نہیں ہوا......
سر جھٹک کر افسردگی سے بولا۔

''میں نے سوچا تھا سڑک پر نکل کر اسٹیشن تک کی کوئی سواری لے لیتے ہیں۔ لیکن......''

خضرا کا دل ڈوبنے لگا۔ غیر محفوظ ہونے کا احساس اس کے ذہن کے ساتھ چپک کر ر
گیا۔ اپنی چادر کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اس نے اپنی پسینے میں بھیگی ہوئی ہتھیلیاں چاد
کے پلو سے خشک کیں۔ اس کے ہاتھوں سے کوئی سخت چیز چھو گئی۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا
چادر میں پڑی ہوئی گرہ میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی گانٹھ کھولی
مڑے تڑے سو سو کے تین کرنسی نوٹ اس کے ہاتھ میں تھے۔ حیرت و مسرت سے وہ گنگ

سی ہوگئی۔ اس نے خرم کا بازو ہلایا۔

''خرم...... یہ دیکھو......''

''آپی! یہ کہاں سے آگئے؟'' خرم نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

''پھوپھی کی چادر کے پلو سے بندھے تھے۔ ہائے اللہ شکر ہے......'' خضرا نے ہانپتے
ہوئے کہا۔

''سنبھال کے رکھنا آپی...... اچھا...... بس ابھی سڑک پر نکل کر اسٹیشن تک کی کوئی
سواری پکڑ لیتے ہیں۔'' خرم پھر سنبھل گیا۔

''ہاں...... میں انہیں چادر میں باندھ لیتی ہوں۔'' خضرا حفاظت کی غرض سے روپوں کو
پھر چادر کے کونے میں لپیٹ کر گرہ لگانے لگی۔

''یہ کیا گرہ گانٹھیں لگا رہی ہو...... کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ......؟'' ایک نامانوس سی آواز نے
عقب سے کہا۔

دونوں نے چونک کر دیکھا...... گلے میں رنگین مفلر ڈالے، تاریکی میں بسا ہوا تاریک
چہرہ ان سے اوباش لہجے میں سوال کر رہا تھا۔ اس کے ساتھی ایک دکان کے چوڑے تھڑے
پر آڑے ترچھے بیٹھے نہ معلوم کیا کر رہے تھے۔ خضرا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خرم
نے پلٹ کر جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن خضرا نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے چلنے
کے لئے کہا لیکن اس غنڈے نے راہ روک لی۔ اس کے ساتھی بھی دور ہی سے بولیاں
مارنے لگے۔

''سوہنیو...... کدھر کے ارادے ہیں؟''...... مکروہ چہرہ اور بھی خوفناک ہوا۔

''زبان سنبھال کر بات کر اوئے...... ہٹ سامنے سے...... راستہ چھوڑ......'' خرم کا لہجہ
اس کے لڑکپن سے بہت بڑا تھا۔

وہ غنڈہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی جیسے ہنس کر خرم کو داد
دی۔ خضرا کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پھر خرم کا بازو پکڑا اور دبی
زبان سے بولی۔

''خرم چلو...... ان کے منہ نہ لگو۔''

''ایسی جلدی بھی کیا ہے...... چلی جانا......'' اسی بدمعاش نے خضرا کی بات سن کر اسے

براہِ راست جواب دیا۔

"بکواس مت کرو......" خرم نے تیز لہجے میں آگے بڑھ کر اسے ٹوکا۔

خضرا نے خرم کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اس غنڈے سے مدھم لہجے میں بولی۔ "بھائی خوامخواہ جھگڑا نہ بڑھاؤ...... ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں جانے دو۔"

"ہم کس لئے ہیں...... ہم چھوڑ آتے ہیں...... جانا کدھر ہے؟" اس کے انداز سے بدمعاشی جھلکی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے فقرے کے ساتھ فقرے ملائے۔

"ہاں ہاں...... ہم چھوڑ آئیں گے۔ حکم تو کرو سرکار...... ہم کس لئے بیٹھے ہیں۔"

خرم ضبط نہ کر سکا...... خضرا سے بازو چھڑاتا وہ ایک ہی جست میں اس غنڈے پر پڑا۔ وہ بھی غافل نہیں تھا اور خرم سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ اس نے خرم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اس کے دوسرے ساتھی بھی لپک لپک کر دکان کے تھڑے سے اتر آئے اور آتے ہی سے گتھم گتھا ہو گئے۔ سب نے اسے جیسے کھلونا بنا لیا اور چاروں طرف سے اسے گھیر نشانہ بنانے لگے۔

"چھوڑ دو میرے بھائی کو...... چھوڑ دو...... خدا کے لئے......" خضرا نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایک کا ہاتھ بھی نہیں روک سکی۔

گلی سنسان تھی اور مکانوں کے دروازے بند...... کہیں کوئی اکا دکا راہگیر بھی نہیں تھا۔ خضرا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خرم کو لگنے والی ہر چوٹ جیسے اس کے اپنے تن پر ڈال رہی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی ایک مکان کے دروازے پر پہنچی اور مجنونانہ انداز میں دونوں ہاتھوں سے اس کا کواڑ پیٹتے ہوئے چلائی۔

"دروازہ کھولو...... خدا کے لئے دروازہ کھولو...... وہ میرے بھائی کو مار رہے ہیں...... وہ اسے مار دیں گے...... کوئی اسے چھڑاؤ...... اسے پکڑو...... خدا کے لئے میری مدد کرو...... دروازہ کھولو......" وہ ہسٹریائی چیخوں کے ساتھ کہتی چلی گئی۔

کواڑ پیٹنے کی آواز اور اس کی چیخوں کو سن کر وہ سارے بدمعاش ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔ اردگرد کے کچھ مکانوں کے دروازے کھلے۔ جس دروازے پر خضرا دستک دے رہی تھی، اس کے کواڑ بھی کھلے اور ایک باریش بوڑھے نے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"کیا بات ہے کڑیئے؟"

"وہ میرے بھائی کو مار رہے ہیں......" خضرا نے روتے ہوئے کہا۔ کچھ دوسرے لوگ بھی قریب آ گئے۔ کچھ نے خرم کو تھاما جو غنڈوں سے مار کھاتے کھاتے بے دم ہو گیا تھا۔ خضرا نے اسے دوسروں کے ہاتھوں میں جھولتے دیکھا تو دوڑتی ہوئی خرم کے قریب پہنچی اور اسے بازوؤں میں سنبھال لیا۔

"کون ہو تم لڑکی...... اور اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی ہو؟" ایک اونچے لمبے آدمی نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"ہم گھر جا رہے تھے کہ انہوں نے ہمیں روک لیا۔" خضرا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ دبنگ لہجے میں بولا۔

"ہم شادی میں گئے ہوئے تھے۔" صورت حال کی سنگینی نے خضرا کو بہانہ بنانا سکھا دیا۔

اردگرد کھڑے ہوئے چہروں پر تحقیر اور آنکھوں میں شک تھا۔ ان کے لبوں پر مختلف سوالات تھے لیکن سب کا مفہوم ایک ہی تھا۔ ان کی نگاہوں کے زاویئے انہیں آپ سے آپ مجرم بنا رہے تھے۔ خضرا نے ان کی طرف سے توجہ ہٹائی اور خرم کے پھٹے ہوئے ہونٹ سے خون صاف کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ راز کھلنے کے خوف میں گھلی جا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس ان لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔

"کہاں جاؤ گے تم......؟" کسی نے پوچھا۔

"اسٹیشن پر......" خضرا نے خود کو سنبھال کر مستعدی سے جواب دیا۔

"اچھا...... تو تم دوسرے شہر سے آئے ہو۔" کوئی دوسرا بولا۔

"کوئی بڑا تمہارے ساتھ نہیں ہے......؟" کسی اور نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

خضرا کوئی الٹا سیدھا جواب دینے ہی والی تھی کہ انہی لوگوں میں سے بھاری جسم اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص آگے بڑھا، اپنے ریشمی مفلر کو گلے میں بل دیتے ہوئے اس نے غور سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور دوسروں کی نسبت نرم لہجے میں بولا۔

"تمہارے ابے کا نام مکھوا استاد ہے؟"

ان دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن پہچان نہیں پائے۔ لیکن اس نے

جس طرح باپ کا نام لیا تھا اس سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ باپ کا کوئی جاننے و
ہے۔

''پتر...... پہچانا نہیں...... میں ہوں، تمہارا چاچا...... نظام...... مکھو استاد کدھر ہے... وہ آج بھی اڈے پر نہیں پہنچا۔ اس نے ویگن لے کر جانی تھی۔'' اس نے اپنے مخصوص ا
لہجے میں کہا۔

اس کی آواز سن کر انہیں ویگن کا لمبا سفر یاد آیا۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکے۔ بس ٹکر ٹکر ان
طرف دیکھتے رہے۔ وہ باقی مجمع کی طرف مڑ کر مضبوط لہجے میں بولا۔

''میں ان دونوں کو جانتا ہوں...... یہ میرے استاد کے بچے ہیں...... میرا خیال ہے ا
سے بچھڑ گئے ہیں۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے جارہا ہوں...... صبح اسے اطلاع کر دوں گا۔

''ٹھیک ہے نظامے...... تم انہیں لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ...... ویسے سوچ لینا... جوان لڑکی کا معاملہ ہے۔'' ایک باریش بزرگ نے نظام کو تنبیہ کے لہجے میں کہا۔

''فکر نہ کرو بزرگو...... میں بیوی بچوں والا ہوں...... اور ان کا باپ میرا استاد ہے... نظام نے جیسے اپنی صفائی پیش کی اور ان سے بولا۔ ''چلو آؤ پتر...... آجاؤ میرے ساتھ۔''

وہ اس کے ساتھ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے...... وہ اس وقت ان کے لئے فرشتہ رحمت
بن کر آیا تھا جس نے انہیں اتنے لوگوں کی بھانت بھانت کی بولیوں سے محفوظ کر کے ا
مشکل لمحے سے نکال لیا تھا۔

وہ سر جھکائے ہوئے اس کے ساتھ چلتے گئے اور اس کے پیچھے پیچھے ایک ٹاٹ کے پردے والے گھر میں داخل ہو گئے...... جس میں چھوٹے چھوٹے ناک سڑسڑاتے بچے کلبلا رہے تھے۔ صحن کے عین وسط میں ایک بھاری بھرکم عورت پھولدار کپڑے پہنے کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس نے تیوری چڑھائی اور ناک پر انگلی رکھ کر ناپسندیدگی کے لہجے میں بولی۔

''یہ کون ہیں......؟''

''اپنے استاد مکھو کے بچے ہیں......'' نظام نے بے نیازی سے بتایا۔

''وہ آپ کدھر ہے...... جو بچوں کو یہاں چھوڑ گیا ہے؟'' اس کا انداز چبھتا ہوا سا تھا۔

''تو اپنے کام سے کام رکھ اور ان کے روٹی پانی کا بندوبست کر......'' نظام نے درشتی سے کہا۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی صحن کے اس گوشے کی طرف چلی گئی جہاں تنکوں کی چھت تلے چولہا اور باورچی خانے کے دوسرے لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ بچے ان کے اردگرد کھڑے ہو کر حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ دونوں پریشانی سے اب تک کھڑے تھے۔ نظام بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی انہیں باپ کے پاس پہنچا آئے گا۔ دونوں ہی اس خیال سے لرز رہے تھے۔ وہ جن حالات کی سنگینی سے بھاگ کر آئے تھے تقدیر انہیں پھر اسی کے حوالے کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔

''آؤ پتر...... اندر آجاؤ......'' نظام نے اندر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں معمول کی طرح اس طرف چل پڑے۔ ان کے ساتھ ہی بچوں کا لاؤ لشکر بھی روانہ ہوا۔ نظام نے ڈپٹ کر بچوں سے کہا۔

''یہ کیا پیچھے پیچھے پھر رہے ہو...... چلو اپنی ماں کے پاس۔''

کچھ بچے بسورنے لگے۔ کچھ ڈھٹائی سے ان کے ساتھ ساتھ لگے رہے۔ نظام مارنے

کو لپکا تو وہ سب کے سب شور مچاتے ہوئے ماں کی طرف دوڑے۔

''اندر آ جاؤ پتر!'' اس نے دونوں کو نرمی سے کہا۔

وہ دونوں سکڑے سمٹے ہوئے اندر کمرے میں داخل ہوئے جہاں رنگین پایوں اور میل نوار والی بڑی سی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اونچی پرچھتیوں پر مختلف برتن سجے ہوئے تھے او دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے آئینے پر کروشیے سے بنا ہوا رومال ڈھکا تھا۔ کمرہ نسبتاً صاف تھ اور سامان قرینے سے لگا ہوا تھا۔

نظام ان کے قریب ہی بیٹھ گیا اور مشفق لہجے میں بولا۔

''ہوں، سناؤ پتر...... اصل بات کیا ہے؟''

خرم اور خضرا دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... دونوں سہم سے گئے۔ دونوں کو ہی کچھ نہیں سوجھا کہ اسے کیا بتائیں اور کس طرح بتائیں...... نظام بھی ان کی ہچکچاہٹ کو تاڑ گیا اور اپنے لہجے کو اور نرم کر کے بولا۔

''ہاں پتر...... بتاؤ بات کیا ہے؟...... گھبراؤ نہیں...... میں تمہارا چاچا ہوں۔ تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔ اس کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ تم مجھے اپنی اولاد سے بڑھ کر ہو۔''

وہ دونوں پھر بھی چپ رہے تو اس نے پیار سے خرم کی پشت تھپتھپائی۔

''ہاں بھئی...... چھوٹے خان...... تم اپنے چاچے کو سب صاف صاف بتا دو۔ تمہاری باجی تو شرماتی ہے۔ شاباش یار...... جو بھی بات ہے مجھے بتاؤ...... میں یہاں کس لئے بیٹھا ہوں۔ خدا کی قسم تمہاری طرف کوئی آنکھ بھی ٹیڑھی کرے تو اس کی آنکھ نکال دوں۔'' اس نے بار بار خرم سے بڑی محبت کے ساتھ پوچھا۔

خرم نے جیسے اجازت لینے کو خضرا کی طرف دیکھا۔ خضرا نے اسے منع نہیں کیا۔ اب کچھ چھپانا لا حاصل تھا۔ تقدیر نے ان کی تگ و دو کو دائرے کا سفر بنا دیا تھا۔ وہ جہاں سے چلے تھے، وہیں پر پہنچنے والے تھے۔ خرم نے شاید اس کی آنکھوں سے رضامندی پا لی اور بچوں کی سی سادگی سے بولا۔

''ہم امی کے پاس جا رہے ہیں۔''

''کیوں...... خیر تو ہے...... مکھو استاد نے اس سے مک مکا کر دیا تھا۔'' نظام نے حیر سے کہا۔

''ابو آپی کا نکاح ملک جی سے کر رہے تھے۔ ملک جی بہت بڑے ہیں...... ابو جتنے...... بلکہ ابو سے بھی بڑے۔ ان کی پہلے بھی چار بیویاں تھیں۔ ایک مر گئی ہے...... وہ آپی سے......'' خرم نے اسے قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تو تم گھر سے بھاگ آئے ہو...... ہیں......؟'' نظام نے بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... وہ تو مولوی کو بھی لے آئے تھے۔ پر زمان نے پھوپھا جی کو گولی مار دی۔ سب لوگ اسی طرف لگے ہوئے تھے کہ ہم نکل آئے۔'' خرم نے تفصیل سے سمجھایا۔

''گولی مار دی پھوپھا جی کو...... یہ زمان کون ہے؟'' نظام نے پریشانی سے پوچھا۔

خرم اپنی جانب سے پوری وضاحت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ خضرا سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ نظام نے کسی سوچ میں ڈوبے ڈوبے لمبی سی ہوں کی اور اپنے بے ڈول سر کو کئی مرتبہ ہلایا...... پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔

''اچھا...... تو یہ بات ہے۔''

چند لمحے خاموش رہ کر اس نے خضرا کو مخاطب کیا۔

''کیوں کاکی...... تم ملک جی سے شادی نہیں کرنا چاہتی؟''

خضرا نے سر جھکا لیا...... خرم نے جلدی سے کہا۔

''پلیز انکل! آپ ہمیں امی کے پاس جانے دیں۔''

''استاد مکھو کو اس طرح کرنا تو نہیں چاہئے۔'' نظام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''دھی رانی تو ابھی بالڑی ہے...... بس ذرا قد نکال گئی ہے...... اسے اتنی جلدی کیا ہے...... میں اسے سمجھاؤں گا۔ میں اس سے بات کروں گا کہ ابھی کاکی کو پڑھنے دے۔''

''نہیں، نہیں انکل...... وہ آپ کی بات نہیں مانیں گے۔'' خرم نے اس کی بات اچک لی۔ ''وہ بہت خفا ہوں گے۔ وہ ہمیں ماریں گے۔ وہ آپی کی شادی ملک جی سے ضرور کر دیں گے۔''

خضرا نے بھی خرم کی تائید کرنی چاہی لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی صرف التجا آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ نظام پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

دروازے میں سے اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا بڑا سا

تھال تھا۔

"یہ لو...... روٹی کھالو۔" اس نے وہ تھال چارپائی پر رکھ دیا اور خود ایک جانب کھڑی ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں ناگواری تھی۔ اس کی آنکھوں سے ناپسندیدگی صاف جھلکتی تھی۔ نظام بھی چونک کر اپنی سوچوں سے باہر نکلا اور خوشگواری سے بولا۔

"چلو چلو...... پہلے روٹی تو کھاؤ...... بسم اللہ کرو۔"

خرم کو شاید بھوک لگی تھی۔ وہ معمولی سے تکلف کے بعد کھانے لگا لیکن خضرا کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ حالات کی بے یقینی نے اس کے ذہن کو بری طرح سے الجھا دیا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ سب کچھ ان کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ اب وہ نظام کے رحم و کرم پر تھے جو نہ جانے ان کی تقدیر کو کس سمت لے جانے والا تھا۔

"کاکی...... سوچ میں نہ پڑ...... آگے دیکھ کر روٹی کھا...... فکر نہ کر، سارا کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" نظام جو بہت دیر سے اسے کھویا دیکھ رہا تھا اسے متوجہ کرنے کو بولا۔

خضرا چونک گئی...... اس نے مجبوراً روٹی کا ایک نوالہ توڑا، بڑی آہستگی سے اس کا لقمہ بناتی رہی۔ لیکن اسے منہ میں رکھنے کو اس کا جی نہیں چاہا...... وہ بہت دیر تک نوالہ ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ نظام نے پھر اصرار کیا......

"روٹی کھا ناں کڑیے......"

خضرا نے نوالہ واپس چنگیر میں رکھ دیا اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بولی۔

"مجھے بھوک نہیں...... مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"کاکی...... تُو اسے اپنا گھر نہیں سمجھتی؟" نظام نے گلہ کیا۔

"نہیں...... یہ بات نہیں ہے...... میں......" خضرا نے ادھوری سی بات کی اور سر جھکا لیا۔

اسی وقت دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ نظام نے بلند آواز میں اپنے کسی بچے کا نام لیا۔

"اوئے...... دیکھ باہر کون آیا ہے؟"

بچوں کی فوج باہر لپکی...... ایک دوسرے کو دھکے دیتے، لڑتے جھگڑتے۔ وہ

واپس آئے اور بڑا لڑکا کمرے کی دہلیز پر آن کر چلایا۔

"مکھو چاچا آیا ہے......"

خرم کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ خضرا گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ خوف کے مارے ان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نظام بھی کچھ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور نسبتاً مدھم لہجے میں ان دونوں سے مخاطب ہوا۔

"باہر مکھو استاد آیا ہے۔ اگر کہتے ہو تو میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔ بڑے آرام سے سمجھاتا ہوں اسے...... وہ مان جائے گا۔"

خضرا کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ ششدر کھڑی کانپتی رہی۔ خرم نے جلدی سے کہا۔

"نہیں...... وہ کبھی نہیں مانیں گے...... وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ آپی کی شادی ملک جی سے کر دیں گے نظام چاچا! پلیز، آپ ہمیں امی کے پاس جانے دیں۔"

"کیوں کاکی! تُو کیا کہتی ہے؟" نظام نے گم سم کھڑی خضرا کو مخاطب کیا۔

خضرا نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"ہم امی کے پاس جائیں گے۔" وہ گھٹے ہوئے لہجے میں اتنا ہی کہہ سکی۔

"سوچ لو پتر...... باپ کا بڑا آسرا ہوتا ہے...... تم ابھی بچے ہو...... تمہیں نہیں پتہ باپ کا سایہ زندگی میں رہے تو انسان نرمی گرمی سے بچا رہتا ہے۔ سو اونچ نیچ ہوتی ہے دنیا میں...... دھی رانی! تُو پھر سوچ لے...... میں استاد مکھو سے بات کروں گا تو وہ زبردستی نہیں کرے گا۔" نظام نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

دروازے پر پھر زوردار دستک ہوئی۔ نظام کی کرخت چہرے والی بیوی نے کمرے میں جھانکا اور ناگواری سے بولی۔

"باہر کیوں نہیں جاتا...... وہ تو دروازہ توڑ رہا ہے۔"

خرم اور خضرا کانپ گئے۔ گھر کے دروازے پر باپ کی موجودگی نے انہیں سہما دیا......

نظام نے پھر ایک مرتبہ خضرا کو مخاطب کیا۔

"ہاں بول کاکی...... کیا خیال ہے تیرا؟"

خضرا کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکنے لگا۔ اس سے کچھ کہنا دشوار ہو گیا۔ اس ۔ بڑی ہمت سے نفی میں سر ہلایا اور بمشکل چند لفظ بولے۔

"نہیں...... ہم ابو کے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

نظام نے لمبی سی ہوں کی اور بغیر کچھ کہے تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی اس کی بیوی کمرے میں آ گئی اور خضرا سے بولی۔

"تمہارا باپ آیا ہے باہر...... اس کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں تم...... جوان جہا لڑکی ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو، باپ کے نام کو بٹہ لگاؤ گی؟"

خضرا چور سی بن گئی۔ اسے مدہم سے لہجے میں کہنا پڑا۔

"ہم امی کے پاس جا رہے ہیں...... کہیں اور نہیں۔"

"امی......" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "ماں بھی تو سنا ہے تمہاری......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

نظام بدحواسی میں دوڑتا ہوا اندر آیا اور سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم لوگوں نے مجھے عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں نے کبھی نکھو استاد سے جھوٹ نہیں بولا...... پر آج تمہاری خاطر یہ بھی کرنا پڑا۔ خدا معاف کرے۔ اس کے ساتھ تمہیں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔"

پھر اپنی بیوی کو تاکید کرنے لگا۔ "نیک بختے! تو ان کے منجی بسترے کا انتظام کر دے میں ذرا نکھو استاد کے ساتھ جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے دیر ہی ہو جائے۔"

بیوی نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا......

"یہ تو بچے ہیں...... ان کے ساتھ تیرا دماغ بھی چل گیا ہے۔ کان سے پکڑ اور حوالے کر انہیں باپ کے...... جوان جہان لڑکی ہے، کل کو خراب ہو کہیں تیرے متھے لگتی ہے۔"

"تو اپنی یہ بک بک پاس ہی رکھ......" نظام نے تلخی سے کہا۔ "دروازہ بند کر لے...... میں جا رہا ہوں۔"

نظام کی بیوی بڑبڑاتی ہوئی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔

خضرا اور خرم کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ خود کو بے حد کم مایہ اور حقیر سا محسوس رہے تھے۔ ان کے کان گلی کی طرف لگے ہوئے تھے جہاں سے نظام اور باپ کی باتیں

کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ دونوں سہمے ہوئے آنے والے لمحوں کے خوف میں سانس لے رہے تھے۔ پھر گلی میں سے باپ اور نظام کی آنے والی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ لیکن ان کا خوف کم نہیں ہوا۔ وہ دونوں اسی طرح ساکت بیٹھے رہے اور نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔

نظام کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اور چہرے پر ناگواری۔ اس نے ایک چھوٹا بچہ کولہے پر اٹھا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ بچوں کی پوری فوج بھی کمرے میں آن وارد ہوئی۔ وہ سب کے سب انہیں یوں حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔

نظام کی بیوی برا سا منہ بنا کر بولی...... "پہلے ہی گھر میں کون سی جگہ ہے، اوپر سے آیا گیا بھی سر پر...... مہمانوں کو تو یوں لے آتا ہے جیسے محل لے رکھا ہے...... اونہہ......"

وہ بچوں کو ڈانٹتی، پھٹکارتی، بلند آواز میں چلاتی اور چیزوں کو پٹختی زمین پر ایک میلی سی بوسیدہ دری بچھانے لگی۔ اس کے کولہے پر سوار چھوٹا بچہ بار بار اس کے پہلو سے لڑھک جاتا اور دوسرے بچے دری بچھانے کی بجائے اسے بگاڑنے لگے۔

خضرا جلدی سے اٹھی اور دری بچھانے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ ایک کونہ خرم نے بھی سیدھا کیا۔ بوسیدہ دری سے جھڑنے والا گرد و غبار کمرے میں پھیل گیا جو بچوں کی اچھل کود سے اور گہرا ہو گیا۔ اس نے شرارتیں کرتے ہوئے بچوں کو دو دو دھموکے جڑے اور انہیں تقریباً ایک قطار میں ایک طرف لٹا دیا۔ پھر خضرا اور خرم سے بولی۔

"تم بھی یہاں لیٹ جاؤ...... جگہ ویسے ہی بہت کم ہے۔"

خضرا اور خرم نے چور نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بوسیدہ اور میلی دری جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ سر کے نیچے رکھنے کے لئے کوئی تکیہ نہیں تھا مگر پھر بھی یہ غنیمت تھا کہ سر چھپانے کو ایک چھت تو میسر تھی۔ باہر پھیلی ہوئی خوفناک رات سے بچاؤ کے لئے ایک چار دیواری تو تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے اٹھے اور اسی بوسیدہ دری پر بازو کا تکیہ بنا کر سکڑ سمٹ کر لیٹ رہے۔

نظام کی بیوی نے زرد پیلا سا بلب بجھا دیا اور کمرے میں تاریکی اتر آئی۔ خضرا کی آنکھوں میں نام کو بھی نیند نہیں تھی۔ سخت زمین بری طرح سے کمر میں چبھ رہی تھی۔ بازو

سر کے نیچے رکھے رکھے سن ہو گیا تھا اور آنے والی صبح کا خوف روئیں روئیں میں جاگ ا تھا۔ گزرے ہوئے سارے واقعات کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے پھر لگے۔ اس کے جسم پر ابھی تک وہ سرخ جوڑا تھا جس کے ساتھ کا کامدانی دوپٹہ وہ وہیں چھ آئی تھی۔ اس کی سماعت میں ابھی تک پھوپھی کے الفاظ گونج رہے تھے کہ مولوی صاحب گئے ہیں...... ملک جی کے تصور سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اگر انہیں اس کی قسمت مالک بنا دیا جاتا تو؟

اس نے گہرا سانس لیا، اسے نجات کا احساس ہوا۔ یہ جگہ کیسی بھی تھی، نظام کی بیوی کتن بھی بدمزاج اور جھکی تھی لیکن یہ سب کچھ ملک جی کی بیوی بن جانے سے پھر بھی بہتر تھا۔

سوچوں کے لامتناہی سلسلوں میں کھوئے کھوئے وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں میں نہیں اتری۔

چاروں طرف سے خراٹوں اور لمبے لمبے سانسوں کی مسلسل آوازوں سے ایک شور سا م ہوا تھا۔ گلی میں سے اکا دکا گزرنے والوں کی صدا بھی معدوم ہو چکی تھی۔ خضرا کی سوچ میں نجل کا چہرہ جھانک رہا تھا جس نے اسے جذبوں کے ایک نئے رنگ سے روشنا کرایا تھا لیکن وہ رنگ کتنا کچا اور جھوٹا تھا...... محبت کے اولین ذائقے نے اس کے رگ پے میں زہر سا گھول دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گرم آنسو بھرنے لگے۔ اس کا سانس سے میں گھٹنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی کو پکارے، کسی کے سینے سے لگ جائے، کسی کے گرد با لپیٹ کر تنہائی اور بے چارگی کے احساس کو کم کرے۔

خرم اس سے کچھ ہی فاصلے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ چھوٹے سے روشندان میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی نے اس کی سفید قمیض کو نمایاں کر دیا تھا۔ وہ اپنے پن شدید طلب میں اس کی جانب کھسکی اور نیند کی غفلت میں پھیلے ہوئے اس کے بازو پر ا ہاتھ رکھ دیا۔

اچانک گلی میں سے مانوس سی آواز سنائی دی جس کی پہچان نے خضرا کو سن کر دیا۔

''اچھا یار نظام...... تُو نے بڑا ساتھ دیا۔ تیری مہربانی...... ان بچوں نے کہیں کا نہیں چھوڑا...... ہیں تو اسی کی اولاد۔ سپنولیے۔'' وہ گالی دے کر بولا۔ ''الو کے پٹھے...... گ ہوں گے اسی حرافہ کے پاس۔ مجھے اس کا بھی کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''استاد...... ذرا تحمل سے۔ لڑکی ذات کا معاملہ ہے۔ تیری بچی جوان ہے، کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا۔'' نظام نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو کہا۔

رات کی خاموشی میں ان کی آوازیں خضرا تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ وہ خوف کے مارے سمٹ گئی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے بھر گیا۔ باپ کی آواز اسے چہار جانب سنائی دینے لگی۔ وہ شور وغل میں گھر کر رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ان آوازوں کے درمیان پس کر رہ جائے گی۔ وہ گٹھڑی سی بنی کانپتی رہی۔ نہ جانے باپ کس وقت گیا اور نظام کس وقت گھر آیا۔

خضرا کو اس کی بیوی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ رات گئے بے آرام ہونے پر خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ پھر نظام نے پوچھا۔

''وہ دونوں سو گئے ہیں؟''

''ہاں...... سو مر گئے ہیں۔'' نظام کی بیوی نے ناپسندیدگی سے کہا۔ ''اب صبح ان دونوں کو ناشتہ بھی ٹھونسنا پڑے گا۔ گھر میں پہلے ہی کھانے کے لئے کیا رکھا ہے۔''

''اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر میں پہلے ہی تھکا ہوا ہوں۔'' نظام نے ڈپٹ کر کہا۔

''صبح انہیں چلتا کرنا...... اچھا...... میں نے کہہ دیا ہے۔'' نظام کی بیوی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تُو اپنی بکواس بند رکھ...... صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔'' نظام نے دانت پیسے۔ اس کی بیوی نے آواز تو مدھم کر لی لیکن اس کی بڑبڑاہٹ میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

خضرا اسی طرح دبکی پڑی رہی۔ رات کا ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح بیتنے لگا۔ اندھیرے کی سیاہی طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ بے خواب آنکھوں سے ایک ایک لمحہ گنتی رہی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ جلد سے جلد صبح ہو جائے اور وہ اس گھر کی چار دیواری سے رہا ہو سکیں۔ نظام کی بیوی کی بڑبڑاہٹ، بچوں کی روؤں روؤں اور نظام کے خراٹے سب مل کر فضا کو بے حد ناگوار بنا رہے تھے۔ خضرا صبح کی آس میں سونے کی کوشش کرنے لگی اور نہ جانے کس وقت زبردستی بھینچی ہوئی آنکھوں میں ایک بے چین سی نیند اتر آئی۔

ابھی ٹھیک طرح سے صبح نہیں ہوئی تھی کہ نظام کے چھوٹے بچے نے چیخ چیخ کر سارا گھر

سر پر اٹھالیا۔خضرا کی آنکھ کھل گئی لیکن وہ اسی طرح لیٹی رہی...... اس کی کمر اکڑ کر تختہ ہو رہی تھی اور بازو سر کے نیچے رکھے رکھے سُن ہو گیا تھا مگر اس نے کروٹ نہیں بدلی اور اسی انداز میں پڑی رہی جس طرح سو رہی ہو۔خرم ابھی تک گہری نیند میں تھا۔اس پر نظام کے بچے کی چیخ و پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ نظام کی بیوی جھنجلائی، بچے کو ڈانٹا اور دو چار دھمو کے بھی جڑ دیئے...... بچے نے اور آسمان سر پر اٹھالیا جس سے دوسرے بچے بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف بچوں کی ریں ریں کا شور پھیل گیا۔

نظام دودھ لے کر آیا اور چائے بننے لگی۔خضرا اور خرم ایک طرف چارپائی پر سکڑ سمٹ کر بیٹھ رہے۔نظام منہ میں مسواک ڈالے کمرے میں آیا۔مسواک منہ میں ہونے کی وجہ سے وہ عجیب سی آواز میں بولا۔

''کیوں بھئی پترو...... ٹھیک ٹھاک رات گزری؟''

خضرا نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔خرم جلدی سے بولا۔

''نظام انکل...... پلیز آپ ہمیں اسٹیشن پر چھوڑ آئیں...... ہم چلے جائیں گے۔''

''ٹیشن؟'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔''تمہیں اپنے ابے کا نہیں پتہ...... وہ آج سیدھا تمہاری ماں کے پاس جائے گا...... اگر تم اسے وہاں مل گئے تو وہ تمہیں اپنے ساتھ لائے بغیر نہیں رہے گا۔وہ بہت غصے میں ہے۔مجھے ڈر ہے کہیں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔''

خضرا گھبرا گئی...... خرم بھی پریشان ہوا...... نظام قریب آیا اور دونوں کے سر پر باری باری ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''یہ تمہارے چاچے کا گھر ہے۔اسے اپنا ہی گھر سمجھو...... دو ایک روز یہیں رہو، تب تک مکھو استاد تمہاری ماں کے پاس سے ہو کر آ جائے گا...... پھر تم لوگ چلے جانا اپنی ماں کے پاس۔ میں دھی رانی کے خیال سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے، وہ اپنی زبان پوری کرے گا۔''

خضرا کانپ سی گئی۔اسے بے طرح غیر محفوظ ہونے کا احساس ہوا۔خرم بھی الجھ سا گیا...... نظام نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

''پتر...... گھبراؤ نہیں...... جب تک تمہارا چاچا نظام زندہ ہے، تمہیں فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں...... میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس آپ پہنچا کر آؤں گا...... پر اپنے ابے

کے آگے کبھی میرا نام نہ لے دینا...... وہ تو میری الٹی کھال اتار دے گا۔''

اس کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا لیکن اس کے گھر میں ٹھہرنا بھی آزمائش تھی۔ نظام کی بیوی کی خشمگیں نگاہوں اور زہر آلود بڑبڑاہٹ سے بھری فضا میں سانس لینا بھی سزا لگتا تھا۔ وہ اب تک دو مرتبہ کمرے میں جھانک چکی تھی۔شاید یہ معلوم کرنے کے لئے کہ نظام ان کے ساتھ کیا باتیں کر رہا ہے...... اپنا غصہ ظاہر کرنے کو اس نے کئی مرتبہ بچوں کو پیٹا تھا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ نظام نے انہیں ٹھہرا لیا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔اس نے بچوں کو پیٹا۔ چیزیں پٹخیں اور نظام کے ساتھ ان دونوں کو بھی کوسنے لگی۔ نظام دانت پیستا، گالیاں بکتا باہر لپکا...... مارنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ نظام کی بیوی دہائی دینے لگی۔خضرا اور خرم سہم سے گئے۔خضرا کو اسی گھٹن کا احساس ہونے لگا جو ان کے گھر میں بھری رہتی تھی۔ وہ عجیب سے احساسِ جرم میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی وجہ سے ہی نظام کے گھر میں یہ ہنگامہ بپا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں نظام اندر آیا۔پیتل کی ایک سینی میں دو پیالے چائے اور کچھ رس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے وہ سینی ان کے سامنے چارپائی پر رکھ دی۔خضرا نے سر جھکا لیا...... خضرا کو اپنا آپ بے حد حقیر محسوس ہو رہا تھا...... اسے ناشتے کی وہ سینی بھیک کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

نظام نے انہیں ناشتہ کرنے کے لئے کہا لیکن ان کے لئے ایک نوالہ لینا بھی بار تھا...... گلے میں جیسے کچھ اٹک کر رہ گیا تھا۔نظام بار بار اصرار کرنے لگا تو خضرا کو چائے کا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگانا پڑا۔خرم بھی چائے میں رس بھگو کر کھانے لگا۔ نظام نے کپڑے بدلے، بالوں میں کنگھی کی اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

''اچھا...... تو میں چلتا ہوں...... رات کو ہی واپس آؤں گا...... ہاں کاکے، تُو گھر میں ہی رہنا...... باہر نہ نکلنا...... اچھا...... اللہ بیلی......'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی کرخت چہرے کے ساتھ نظام کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی ناپسندیدگی نے خضرا کو بے طرح خجل کیا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک خیال خضرا کے دل میں بجلی کی سرعت سے آیا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اپنی

چادر کے پلو سے سو روپے کا ایک نوٹ کھول کر اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

''چاچی...... یہ آپ بچوں کو کوئی چیز منگوا دیں۔ ہم تو جلدی میں کچھ لا ہی نہیں سکے۔'' اس کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے سرخ نوٹ کو دیکھ کر نظام کی بیوی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور اپنے جذبات چھپا کر بولی۔

''یہ پیسوں کا رعب نہ ڈالو مجھ پر...... نظام کو پتہ چل گیا تو وہ زمین آسمان ایک کر دے گا۔''

''نہیں...... ہم نظام چاچا کو کچھ پتہ نہیں چلنے دیں گے۔'' خرم نے خضرا کا ساتھ دے کو کہا۔ نظام کی بیوی نے نوٹ کو للچائی نظروں سے دیکھا اور اوپرے دل سے بولی۔

''نہیں...... نہیں...... تم اسے رکھو...... نظام کو پتہ چلا تو برا ہوگا۔''

''ان کو کیسے پتہ چلے گا...... آپ انہیں نہ بتائیں۔'' خضرا نے جلدی سے کہا اور نو اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس نے ڈھیلا سا انکار کیا اور مٹھی بھینچ لی...... اس کی آنکھوں میں سے اجنبیت ا ناپسندیدگی کے تاثرات ہلکے ہو گئے اور اس نے بات کی تو لہجہ پہلے کی نسبت نرم تھا۔

''تم نے ٹھیک طرح سے ناشتہ تو کر لیا ہے ناں؟''

خضرا اور خرم کے لئے کچھ کشادگی پیدا ہوئی۔ نظام کی بیوی کی چبھتی ہوئی بڑبڑاہٹ ب ہو گئی اور وہ ان کی موجودگی کو بھول کر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ خضرا نے وقت گزا کے لئے کمرہ صاف کیا، جھاڑ پونچھ کر دی...... چھوٹے بچوں کا منہ دھلا کر ان کے بالو میں کنگھی کی اور سبزی بنانے میں نظام کی بیوی کا ہاتھ بٹانے لگی۔

اچانک دروازے پر پڑا ہوا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر عجیب و غریب حلیے کا ایک شخص اند داخل ہوا۔ اس نے بڑے گھیر والی شلوار پر کڑھائی سے بھرا ہوا ریشمی کرتا پہن رکھا تھا۔ پر ٹوپی ترچھی رکھی تھی۔ اس کے غیر معمولی چوڑے چہرے پر بے حد باریک، سیاہ موچھیں تھیں جو اس کے اوپری ہونٹ پر ایک پتلی سی لکیر بناتی تھیں۔ وہ تیسری انگلی میں سگریٹ دبا کر ہاتھ کی مٹھی میں سے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔

''السلام علیکم......'' اس نے اندر قدم رکھتے ہی نعرہ مارا۔

نظام کی بیوی نے پلٹ کر دیکھا۔

''تو آج کہاں بھول پڑا چمن خان؟'' اس کے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔

''دیکھ لے بھرجائی...... ہم تو بھول کر بھی اپنے بھائی نظام کے گھر کا راستہ یاد رکھتے ہیں۔'' وہ ناک میں سے دھواں چھوڑتا ہوا بولا۔

''آ بیٹھ......!'' نظام کی بیوی نے ایک چوکی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چوکی گھسیٹتا ہوا بالکل قریب آ گیا اور چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہوا بولا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے خضرا کی طرف اشارہ کیا اور بے باکی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

خضرا نے ٹپٹا کر سر جھکا لیا اور جلدی جلدی سبزی بنانے لگی۔

''یہ ہے کون؟...... کہیں نظام دوسری تو نہیں کر لایا؟'' اس کا لہجہ رکیک تھا۔

''بکواس نہ کر...... نظام جو بھی ہے پر تیرے جیسا نہیں۔'' نظام کی بیوی نے تڑخ کر جواب دیا۔

خضرا شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے سبزی ہاتھ سے چھوڑ دی اور تیزی سے اٹھ کر اندر کمرے میں آ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ چمن خان کی غلیظ نگاہیں ابھی تک اس کے بدن میں پھانس کی طرح گڑھی ہوئی تھیں۔

خرم زمین پر بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھا کوئی پرانا اخبار دیکھ رہا تھا۔ خضرا کی آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا۔

''بہت بور ہو رہا ہوں آپی...... تھوڑی دیر باہر نہ ہو آؤں۔ اسٹیشن کا راستہ ہی دیکھ آؤں گا۔''

خضرا کانپ گئی...... اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہ...... نہ خرم...... تم کہیں مت جانا...... یہاں اکیلے میں مجھے ڈر لگے گا۔''

''آپی...... تم تو ایسے ہی ڈرتی رہتی ہو......'' خرم نے بچوں کی سی لاپرواہی سے کہا۔

نظام کے چھوٹے بچے کو اٹھائے ہوئے چمن خان اندر داخل ہوا اور خرم کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آہا...... یہاں تو چھوٹے خان بھی بیٹھا ہے۔''

چمن خان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا ایک کرنسی نوٹ نکال کر خرم کی

طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لے یار...... ٹونکڑ والے کھوکھے سے سگریٹ کی ایک ڈبی اور قوام والا پان تو لے کر جا...... پیلی پتی بھی ڈلوانا۔''

خرم تو پہلے ہی اکتایا ہوا تھا، وہ جانے کے لئے اٹھنے لگا لیکن خضرا نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''نہیں خرم...... تم نہیں جانا۔'' وہ دبی زبان میں بولی۔

''کاکی...... وہ کون سا کوہ قاف جا رہا ہے۔ ابھی آ جائے گا۔ جانے دے اسے۔ یہ پاس میں ہی تو کھوکھا ہے۔'' چمن نے آگے بڑھ کر خرم کا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور خرم کی پشت تھپتھپا کر بولا۔ ''جا شاباش...... بھاگ کر جا...... کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جانا...... سودا لے کر سیدھا گھر آنا...... چل نٹا فٹ......'' اس نے چٹکی بجائی۔

خرم خضرا کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ خضرا نے بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل جانا چاہا لیکن چمن نے دروازے کے سامنے ایک ٹانگ پھیلا دی۔ خضرا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

''میں نے لڑکے کو جان بوجھ کر باہر بھیجا ہے۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

خضرا نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نکھو استاد نے بھیجا ہے......'' وہ ڈرامائی لہجے میں بولا اور اپنی بات میں اثر پیدا کرنے کو چند لمحے خاموش ہوا۔

خضرا کی جان پر بن گئی۔ نہ جانے اس کے بعد وہ کیا کہنے والا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

''اسے نظام پر شک ہو گیا تھا۔ اس نے پتہ لگانے مجھے بھیجا ہے۔''

خضرا ساکت سی ہو کر اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''پھر یہاں آ کر میں نے سنا ہے کہ تم اس کے پاس جانا نہیں چاہتے۔ اب بتاؤ میں اس کو جا کر کیا جواب دوں؟'' وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

خضرا نے پریشانی سے عجلت میں کہا۔

''آپ ابو کو ہمارے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ ہم کل امی کے پاس چلے جائیں گے۔''

''امی کے پاس......؟'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تو کیا تمہارا باپ وہاں نہیں

پہنچ سکتا؟...... وہ تو چٹکی بجاتے میں تمہیں تمہاری ماں سے چھین کر لا سکتا ہے۔ اسے قانونی حق جو ہے۔ کوئی بھی طریقہ ہو...... تمہیں اس کے پاس جانا ہی پڑے گا۔''

خضرا کچھ پریشان، کچھ مضطرب سی ہو کر اس کی جانب تکنے لگی۔ وہ ایک آنکھ میچ کر رازداری سے بولا۔

''میری مانو تو میرے ساتھ چلو...... تمہیں ٹھیک ٹھاک سی نوکری دلوا دوں گا۔ اپنا کمانا اپنا کھانا۔ نہ کسی کی محتاجی نہ دھونس۔ چار پیسے تمہارا بھائی بھی لے آئے گا۔ آرام سے گزر ہو گی...... اس روز کی چخ چخ سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''نہیں...... ہم نظام چاچا سے پوچھ کر جائیں گے۔'' خضرا نے صاف جواب دے دیا۔

''نظام پہلے اپنی تو خیر منائے......'' وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں نکھو استاد کو اتنا سا اشارہ بھی دے دوں نا...... تو نظام کہیں نظر بھی نہیں آئے گا۔''

خضرا سہم سی گئی۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ وہ بے ساختہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور نظام کی بیوی کے پاس آ کر چھوٹتے ہی بولی۔

''وہ...... وہ کہہ رہا ہے میرے ساتھ چلو...... ہم اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ کبھی نہیں۔''

ہانڈی میں چمچہ چلاتے ہوئے نظام کی بیوی چونک گئی۔

''کیا کہہ رہی ہے تُو...... کس کی بات کر رہی ہے؟'' خضرا روہانسی ہو گئی۔ اس نے چمن کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے اسے آگاہ کیا۔ تب تک چمن بھی اٹھ کر صحن میں آ گیا۔

نظام کی بیوی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''چمن! تُو چپ چاپ یہاں سے چلا جا۔''

چمن نے ایک ہاتھ سے ٹوپی کو اپنے تیل سے چپڑے ہوئے ماتھے پر اور ترچھا کیا اور لفظ چبا چبا کر بولا۔

''میں تو اس کے بھلے کی کہتا ہوں۔'' اس نے ایک آنکھ میچی اور چند قدم اس کی طرف بڑھ کر رازداری سے بولا۔ ''مجھے تیرا بھی تو خیال ہے۔ جوان جہان لڑکی ہے، منہ متھے والی۔ یہ تھوڑے دن اور یہاں رہ گئی تو کہیں تجھے ہی نکال باہر نہ کر دے۔ مرد ہو کر کہہ رہا ہوں، مرد ذات کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا...... کیا جانے کب مغز میں کیا سما جائے۔''

اس کے لفظوں نے خضرا کو ندامت کے پسینے میں شرابور کر دیا۔ نظام کی بیوی نے بھ
ایک بدلی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور چمن سے تیکھے لہجے میں بولی۔

''میں اپنا بھلا برا خوب اچھی طرح سے سمجھتی ہوں..... بس تُو ٹھنڈا ٹھنڈا یہاں سے چ
جا..... راستہ پکڑ اپنا۔''

''اچھا.....'' چمن نے نتھنے پھلا کر جیسے ایک پھنکار سی ماری۔ ''کسی بھول میں ن
رہنا..... نظامے پر بڑا مان ہے نا تجھے..... اس پر اغوا اور حبس بے جا کا مقدمہ بن گیا ت
ساتھ میں تیری بھی سب اکڑ نکل جائے گی۔ ٹوٹ جائے گا یہ مان۔''

''تُو جاتا ہے یا.....'' نظام کی بیوی نے ایک زوردار گالی بکی..... ''آئندہ نظام گھر میں
ہو گا تو تیرے لئے دروازہ کھلے گا..... ورنہ نہیں..... جب دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔''

چمن نے منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا کہا اور منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

خضرا سہمی ہوئی سی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی..... نظام کی بیوی نے اسے چونکایا۔

''تمہارا بھائی کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اسے چمن نے سگریٹ لینے بھیجا ہے..... کھوکھے پر۔'' خضرا نے جواب دیا۔

''بیوقوف..... تم نے اسے مجھ سے پوچھے بغیر جانے کیوں دیا تھا؟'' وہ غصے میں بولی۔

''چمن نے کہا تھا کہ جاؤ..... وہ چلا گیا۔'' خضرا نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں
کہا۔

''تم اس سے بڑی ہو..... تم سمجھا نہیں سکتی تھیں۔ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لینا تھا۔''
ڈانٹتے ہوئے بولی۔

خضرا کے حلق میں آنسوؤں کا ایک گولا سا اٹک گیا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور اس
طرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

''اس بے ایمان کا کچھ پتہ بھی نہیں..... لڑکے کو کہیں باہر باہر ہی اپنے ساتھ نہ
جائے۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔

خضرا دھک سے رہ گئی۔ اس کے اندر ہول سے اٹھنے لگے۔ اگر خرم اس سے بچھڑ گیا
وہ اکیلی اور بے آسرا ہو جائے گی۔ خوف اور وحشت نے اسے چکرا دیا۔ اس کی آنکھیں
آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ وہ تیزی سے نظام کی بیوی کے قریب آئی اور روتے ہو

لہجے میں بولی۔

''اب کیا ہو گا چاچی..... اب کیا ہو گا؟..... وہ خرم کو لے گیا تو میں مر جاؤں گی......
چاچی کچھ کرو..... خدا کے لئے کچھ کرو۔''

''آرام کر کڑیئے تُو تو میرے بھی ہاتھ پیر پھلا رہی ہے..... تُو بس تیار ہو جا..... ابھی
تیرا بھائی آتا ہے تو میں تمہیں اسٹیشن پہنچا کر آؤں..... جہاں جانا ہے چلے جاؤ۔ میں اس
خدا ترسی میں کہیں اپنا ہی گھر نہ اجاڑ بیٹھوں۔''

خضرا نے اس کے لفظوں پر غور نہیں کیا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ خرم کے بغیر
ایک ایک لمحہ بھاری ہو رہا تھا۔ ہر آن دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں آنے والا وقت خرم کو اس سے
دور نہ لے جائے۔ کہیں خرم اس سے بچھڑ نہ جائے۔ یہ اندیشہ اسے اندر ہی اندر کچوکے لگا
رہا تھا کہ خرم ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ حالانکہ چمن نے اسے گلی میں سے سگریٹ لینے کے
لئے بھیجا تھا۔ اب تک اسے آ جانا چاہئے تھا۔

جیسے جیسے اسے دیر ہو رہی تھی، خضرا کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کے روئیں روئیں میں
خوف اور پریشانی جاگ رہی تھی۔ نظام کی بیوی بھی اپنا ہانڈی چولہا بھول کر بے چینی سے
آنگن میں ٹہل رہی تھی۔ وہ ہر دو منٹ بعد کہتی تھی۔

''کہاں چلا گیا وہ لڑکا موت جوگا..... ابھی تک نہیں آیا۔ خدا غارت کرے اس چمن کو
..... وہی اس کو ساتھ لے گیا ہو گا۔''

کتنے پریشان اور بے چین لمحے آگے بڑھ گئے۔ خضرا کا دل بیٹھنے لگا اور نظام کی بیوی
کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ پہلے وہ خود دروازے تک گئی اور ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر
دائیں بائیں سر گھما کر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بچے کو بھیجا..... لیکن
وہ بھی ناکام واپس آیا۔ خضرا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ نظام کی بیوی نے
اپنی میلی چادر اوڑھی اور خضرا سے مخاطب ہوئی۔

''چلو آؤ..... میں چھوڑ آؤں تمہیں۔''

خضرا نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں خرم کے بغیر نہیں جاؤں گی..... آپ اسے آ لینے دیں۔ پھر ہم فوراً چلے جائیں
گے۔''

"اور اتنی دیر میں چمن نے پولیس کا چھاپہ ڈلوا دیا...... تو پھر...... کسی نے ہماری تو نہ
سنی۔ انہوں نے تو تجھے گھر سے برآمد کر لینا ہے۔ بس تُو چلنے کی تیاری کر...... لڑکا ب
ہے۔ تیرے پیچھے آپ ہی پہنچ جائے گا۔" وہ تیزی سے بولی۔

"میں خرم کے بغیر اکیلی کیسے جاؤں...... آپ نظام چاچا کو تو آ لینے دیں۔ انہوں
کہا تھا کہ وہ ہمیں خود چھوڑ آئیں گے۔" خضرا نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کہا۔

"تُو تیاری کر، سمجھی!" نظام کی بیوی لہجہ بدل کر بولی۔ "زیادہ باتیں نہ بنا...... نظام
کوئی پتہ نہیں کہ وہ کس وقت آئے۔ میں تجھے اتنی دیر نہیں ٹھہرا سکتی یہاں۔"

"پلیز چاچی...... اس طرح نہ کریں......" خضرا نے اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔

"بس بس...... بہت ہو گئی۔ میں نے چھیمے سے کہہ دیا ہے کہ تیرا بھائی آئے تو ا
ہمارے پیچھے ہی بھیج دے...... تُو چلنے والی بات کر......" نظام کی بیوی نے اس کا بازو پکڑا
اور اس کی منت خوشامد پر دھیان دیئے بغیر اسے ساتھ لئے ہوئے دروازے سے باہر نکل
آئی۔

خضرا کے لئے ایک قدم اٹھانا بھی دشوار تھا۔ آنسوؤں نے اس کے رخساروں پر ایک
تار سا باندھ دیا تھا اور ہچکیاں لبوں پر آ آ کر دم توڑ رہی تھیں۔

"بس بس...... اب یہ رونا دھونا ختم کر...... لوگ کہیں کچھ اور ہی نہ سمجھ لیں۔ اور و
سیدھی اپنی ماں کے پاس جانا۔ راستے میں کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ کرائے کے پیسے
ہیں نا تیرے پاس؟" نظام کی بیوی اسے برابر ہدایات دے رہی تھی۔

کچھ ہی دور ایک تانگے والا کھڑا آوازیں لگا رہا تھا۔

"روپیہ ٹیشن...... روپیہ ٹیشن!!" اس کے اگلے حصے میں پہلے ہی سواریاں بھری
تھیں۔ پیچھے تھوڑی جگہ خالی تھی۔ نظام کی بیوی خضرا کے ساتھ وہیں پر ٹھنس گئی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر نظام کی بیوی نے خود ہی ٹکٹ خریدا اور اسے گاڑی میں بٹھا دیا ا
قریب ہی بیٹھی ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت سے بولی۔

"بہن ذرا بچی کا خیال رکھنا...... اکیلی ہے۔"

اس عورت نے شفقت سے خضرا کا شانہ تھپتھپایا اور نظام کی بیوی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں...... اپنی ہی بچی ہے۔ تم فکر نہ کرنا۔"

خضرا کا دل اندر ہی اندر کٹا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے جسم کا کوئی حصہ یہیں پر رہا جاتا ہے۔ جوں جوں گاڑی اسٹیشن کی حدود چھوڑ رہی تھی، اس کی روح بدن سے کھنچتی تھی۔ خرم سے بچھڑ جانے کا کرب اس کے وجود میں گھلتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر روئے۔ ہر ایک کو بتائے کہ اس کا بھائی اس سے بچھڑ گیا ہے۔ ایک ایک سے کہے کہ وہ اس کے بغیر اس شہر سے نہیں جانا چاہتی۔ ہر کسی کی منت کر لے کہ وہ خرم کو کہیں سے ڈھونڈ کر لا دیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور اپنی چادر میں منہ چھپا کر گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

اسی عورت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے بولی۔

"بیٹی کیوں رو رہی ہو...... چپ ہو جاؤ شاباش...... یہ ملنا بچھڑنا تو زندگی کے ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے۔"

خضرا نے اس عورت کے خیال سے ضبط کرنا چاہا لیکن آنسو رکنے میں نہیں آئے۔ وہ عورت بار بار اس سے پوچھتی رہی کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟...... اس قدر پریشان کیوں ہے...... اس کا سامان کدھر ہے؟...... لیکن خضرا کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں کو اپنی چادر کے پلو میں جذب کرتی رہی۔

گاڑی پلیٹ فارم پر آن رکی۔ خضرا اندر ہی اندر خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسے ا آپ بے حد غیر محفوظ معلوم ہو رہا تھا۔ تنہائی اور اکیلے پن کا خیال اسے بار بار کچوکے لگا تھا۔ اس کی ہم سفر خاتون نے اس سے پوچھا کہ وہ اسے گھر تک چھوڑ دے۔ لیکن خضرا۔ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور جلدی سے ٹرین سے نیچے اتر آئی۔ لیکن دل ہی دا میں بری طرح سے گھبرا رہی تھی۔ اسے ٹھیک طور پر گھر کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔

جب وہ یہاں سے چلے تھے تو باپ انہیں اس طرح گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا ؛ کہ انہیں گرد و پیش دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ نہ اسے راستے یاد تھے نہ گلی کوچے.... لیکن وہ اس خیال سے خود کو پُر اعتماد بنانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی کو کوئی شک نہ ہ جائے۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر وہ ابھی تذبذب میں ہی تھی کہ تانگے والے نے بلند آواز میں صدا لگائی۔ وہ جس مقام کا نام لے رہا تھا وہ اس کے لئے مانوس تھا۔ دل ہی دل میں اپنے گھر کا پتہ دہراتی وہ جلدی سے آگے بڑھی اور سواریوں والے تانگے میں بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی دھار سی بہہ رہی تھی۔ اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات رہ گئی تھی کہ اسے راستے کی مشکلوں سے چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچ کر ماں کے پاس پہنچنا ہے جس کی گود میں اس کے لئے پناہ ہو گی۔ جس کی چھاؤں میں دُکھوں کی کڑی دھوپ فراموش ہو جائے گی۔ اپنی چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتی وہ سہمی ہوئی آنکھوں سے گرد و پیش کو دیکھ رہی تھی۔ تانگہ رش سے بھری ہوئی سڑکوں پر راستہ بناتا چلا جا رہا تھا۔

راستے اسے ڈرا رہے تھے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہول رہی تھی کہ اگر یہ راستے اسے ماں کے گھر کی طرف نہ لے کر گئے تو وہ کیا کرے گی؟...... وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی

کہ تانگہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ وہ کوچوان کی آواز پر چونکی اور اپنی چادر سنبھالتی ہوئی جلدی سے نیچے اتر آئی۔ اس نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ اسے سڑکیں جانی پہچانی سی لگیں۔ اس کی جان میں جان آئی۔ اس کی ہمت بندھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ یہ اس کے سکول کی طرف جانے والا راستہ تھا۔ اس پہچان نے اس کا اعتماد بحال کر دیا۔ اسے دشواریوں کی کمی ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ اس نے گھر تک کا فاصلہ طے کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ معمول سے زیادہ تیز چلنے کی وجہ سے وہ قدرے ہانپ گئی۔

اس نے دستک دی۔ ایک بار...... دو بار...... اور پھر لگاتار کئی بار......

زینہ اترنے کی آواز سنائی دی۔ چٹخنی کھلی اور کواڑ وا ہوئے۔ ماں کا چہرہ نظر آیا...... لمحے بھر کو خضرا پہچان نہیں پائی۔ ماں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ صحت مند اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کا لباس شوخ اور قیمتی تھا۔ اس کے چہرے پر میک اپ کی تہہ تھی اور اس نے بال ایک نئے انداز میں سنوار رکھے تھے۔ خضرا کچھ جھجک سی گئی۔ وہ جو پہلے ماں کے سینے سے لگنے کے لئے تڑپ رہی تھی، کمزور سے لہجے میں اتنا ہی کہہ سکی۔

''امی...... میں خضرا ہوں......''

''ہیں...... تُو خضرا ہے......؟'' ماں نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر وہ چند لمحے اس کا چہرہ غور سے دیکھتی رہی۔ اس کے بدلے ہوئے چہرے میں سے وہ پہچانے ہوئے خدوخال جھلکے اور وہ اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''ہائے خضرا...... میری بچی...... تُو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔'' اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ ماں نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کی گرفت مضبوط کر دی اور اس کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے چہرے کو بے تحاشہ چومنے لگی۔ خضرا ممتا کے اس گداز میں آسودہ ہوتی چلی گئی۔ ماں کی دیوانگی میں کچھ کمی آئی تو اس نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولی۔

''خضرا...... خیر کے ساتھ تو آئی ہے نا...... تیرے ساتھ کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' خضرا نے ہونٹ بھینچ کر سسکیاں روکتے ہوئے کہا۔

"عجیب شخص ہے یہ تیرا باپ بھی...... تجھے اکیلی کو بھیج دیا۔ خرم تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟" ماں نے ناپسندیدگی سے باپ کا تذکرہ کیا۔

خضرا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"امی......خرم پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ماں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

خرم سے بچھڑ جانے کا لمحہ اس کے سارے وجود میں سلگ گیا۔ شدتِ کرب نے اس کی قوتِ گویائی چھین لی۔ وہ لرزتے لبوں کو کاٹتی بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ سکی۔ ماں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر اس کے بال سہلاتی ہوئی ہولے ہولے اسے تسلی دینے لگی۔

خضرا کو آسرا ملا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور آنسوؤں اور ہچکیوں کی زبان میں اپنے سارے دکھ ماں کی جھولی میں ڈال دیئے۔

ماں کبھی روتی، کبھی پریشان ہوتی، کبھی اس نے باپ کو کوسا، کبھی خرم کو یاد کیا۔ کتنے ہی پہر بیت گئے اور وہ باتیں کرتی رہیں۔ پھر ماں کو جیسے اچانک یاد آیا۔

"خضرا......تُو تو یونہی بھوکی پیاسی بیٹھی ہے۔ مجھے بھی تیرے ملنے کی خوشی میں خیال نہیں آیا۔ چل اٹھ، منہ ہاتھ دھولے۔ میں تیرے لئے کھانا نکالتی ہوں...... چل اٹھ جا میری بچی۔ تُو فکر نہ کر۔ میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گی۔ تیرا باپ یہاں آئے تو سہی۔ کیسی خبر لیتی ہوں میں اس کی، نانی یاد نہ آجائے تو کہنا۔ اور وہ حرافہ نظام کی بیوی، لگتا ہے جمن کے ساتھ ملی ہوئی ہے...... اسے بھی سمجھ لوں گی۔" ماں اپنی رو میں کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

خضرا بے دلی سے اٹھی اور اس نے غیر ارادی طور پر پہلی بار ان در و دیوار پر نگاہ ڈالی جن پر اس کے بچپن کی چھاپ تھی۔ اسے قدرے حیرت ہوئی...... گھر میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ وہ جس کمرے میں کھڑی تھی وہاں بان کی چارپائیوں کی جگہ ایک بڑا بیڈ، کرسیاں، الماری اور ڈریسنگ ٹیبل آ گیا تھا۔ فرش پر سستا سا قالین بھی بچھا ہوا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کی نگاہ ملحقہ کمرے پر پڑی...... وہ ایک باقاعدہ ڈرائنگ روم کی طرح آراستہ تھا۔ غسل خانے کی حالت بھی بدلی ہوئی تھی۔

منہ دھو کر اس نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھا تو وہ خود کو بھی اجنبی سی لگی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اس نے بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے برابر کیا۔ اسے دور سے ماں کی آواز سنائی دی۔

"خضرا......آ، کھانا کھالے۔"

خضرا کو محسوس ہوا جیسے اس نے یہ آواز صدیوں بعد سنی ہے...... ممتا کے لگاؤ اور محبت سے لبریز آواز نے اسے تحفظ کا احساس بخش دیا...... اس کے بے چین دل کو قرار آ گیا۔ اس کی بے کل روح میں طمانیت اتری۔ اسے یقین ہو گیا کہ مشکلات کا خاتمہ ہو گیا ہے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ماں نے دوبارہ پکارا تو خضرا غسل خانے سے باہر نکلی۔ وہ سیدھی کچن میں ہی گئی اور اسے ایک مرتبہ پھر خوشگوار سی حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ باورچی خانہ بھی باقی گھر کی طرح جدید اور پُر آسائش ہو چکا تھا۔

ماں نے کھانے کی ٹرے ایک چھوٹی تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔ خضرا کو دیکھ کر اس نے اس کے بیٹھنے کے لئے ایک مونڈھا کھینچ کر قریب کر دیا۔ خضرا کو پہلے تو بھوک نہیں تھی لیکن ایک عرصے بعد ماں کی ممتا کی چھاؤں تلے اس کے ہاتھوں سے پکے ہوئے کھانے دیکھ کر اسے کھانے کی خواہش ہونے لگی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی کھاتی رہی...... وہ ماں کی والہانہ نگاہوں کو مسلسل اپنے چہرے سے چھوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ترسے ہوئے دل میں آسودگی بوند بوند برس رہی تھی۔

وہ ساری شام ماں نے اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزاری۔ وہ کرید کرید کر اس سے ایک ایک لمحے کی روداد سنتی رہی...... اس کے باپ کے بارے میں بہت سے سوالات پوچھے۔ خضرا کو بار بار خرم کا خیال آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا؟...... کس حال میں تھا؟...... تنہائی اور اکیلے پن نے اسے خرم سے بہت نزدیک کر دیا تھا...... اس کے اندر خرم کے لئے ماما کا ایک نرم و نازک جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ خرم کا خیال اس کے دل سے نہیں اترتا تھا۔ اس کی سوچوں کا رخ ہر لمحے خرم کی طرف مڑ جاتا تھا۔ وہ بار بار سوچتی تھی کہ وہ تو ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں تلے آسودہ ہے...... لیکن خرم نہ جانے کہاں اجنبی رشتوں کے درمیان سانس لے رہا ہوگا۔

گھر کے در و دیوار وہی تھے لیکن باقی ہر شے بدلی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی تو وہ پہلی معصوم بچی نہیں رہی تھی۔ ماں کے کپڑے اسے پورے آنے لگے تھے۔ اس کی سوچوں نے بھی کتنے ہی رنگ بدل لئے تھے۔ گزرے لمحوں کے تلخ ذائقے ابھی تک رگوں میں گھلے ہوئے تھے۔ اس زندگی میں وہ گھر کی سی اپنائیت نہ جانے کیوں نہیں تھی؟...... نہ جانے ماں کے ساتھ بھی وہ بے تکلفی اور مانوسیت پیدا نہیں ہو سکی تھی جو ماں اور بیٹی کے رشتے کو ایک ڈھارس، ایک تحفظ بنا دیتی ہے۔ ماں کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مسلسل کچھ سوچتی رہتی ہے۔

اسے یہاں آئے ہوئے دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ ایک شام دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں چھت پر کپڑے پھیلانے گئی ہوئی تھی۔ خضرا نے کچھ دیر ماں کے آنے کا انتظار کیا لیکن دستک بار بار ہونے لگی۔ وہ زینے سے نیچے اتری۔ اس نے چٹخنی کھولی اور دروازے کا پٹ ذرا سا وا کر کے بولی۔

''کون ہے......؟''

آنے والے نے دہلیز پر قدم رکھ دیا اور ذرا سے کھلے ہوئے دروازے کو کھول کر اندر آتے ہوئے بولا۔

''زرینہ کہاں ہے؟...... آپ کیا کوئی مہمان ہیں...... پہلے تو آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔''

خضرا پریشان سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ درمیانی عمر کا مضبوط آدمی تھا۔ اس کے بال پیشانی سے غائب تھے اور قلمیں سفید تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی سفر سے آیا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر خضرا کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور سوالیہ لہجے میں بولا۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کون ہیں؟''

خضرا نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا...... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دے۔ اپنے بارے میں اس شخص کو کیا بتائے؟...... جو خود اس کے لئے اجنبی تھا۔ اسی وقت زینے پر سے ماں کی آواز سنائی دی۔

''خضرا...... خضرا...... کون آیا ہے؟''

خضرا چونک سی گئی اور وہ بغیر کچھ کہے سیڑھیاں چڑھ کر یوں اوپر چلا گیا جیسے گھر کا آدمی

ہو۔ خضرا بھی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آئی تو وہ برآمدے میں بیٹھا اپنے بوٹوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ خضرا اسے دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

ماں پانی کا گلاس لئے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکلی۔ خضرا کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ کچھ بدل سا گیا۔ وہ تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے بولی۔

''آ جاؤ خضرا......!''

خضرا چند قدم آگے بڑھی ماں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خضرا...... یہ تمہارے انکل عمر دراز ہیں۔ سلام کرو انہیں۔''

خضرا نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سلام کیا۔

''یہ میری بیٹی خضرا ہے...... کل ہی آئی ہے۔ اس کے باپ نے اسے بہت پریشان کیا ہے۔ یہ اب یہیں رہے گی۔''

ماں نے یوں کہا جیسے اس سے اجازت طلب کر رہی ہو۔

عمر دراز نے ایک گہری نگاہ خضرا پر ڈالی۔

''یہ تو تمہارے برابر ہی معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں...... بڑی جلدی قد نکال لیا ہے اس نے...... ورنہ اس کی عمر تو سولہ سترہ برس بھی نہیں ہے۔'' ماں نے فخر و محبت کے لہجے میں کہا۔

عمر دراز نے سگریٹ سلگاتے ہوئے براہِ راست خضرا کو مخاطب کیا۔

''کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟''

خضرا ابھی متذبذب ہی تھی کہ ماں نے اس کی بجائے جواب دیا۔

''اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوا ہے۔ یہاں سے گئی تھی تو آٹھویں میں پڑھ رہی تھی۔ سوچتی ہوں اس سال اسے میٹرک کا امتحان دلوا دوں...... اس کے تو کتنے ہی سال مارے گئے۔''

خضرا عمر دراز کے انداز اور ماں کے رویے سے بہت کچھ سمجھ چکی تھی۔ لیکن اس کا دل اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی گھر کر رہی تھی۔ لمحے بھر میں ہی اسے گھر کی فضا سے اجنبیت کی بو آنے لگی۔ اس نے قدم بڑھائے اور چاہا کہ وہاں سے ہٹ جائے لیکن ماں نے اسے مخاطب کر لیا۔

''خضرا، ذرا ایک پیالی چائے تو بنا دے۔''

خضرا چپ چاپ باورچی خانے میں گھس گئی۔ اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھ آنسو آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں آئے اور اس کے رخساروں پر بہتے چلے گئے۔ ا نے بچپن سے اب تک اس گھر میں دراڑیں ہی پڑتی دیکھی تھیں لیکن آج کے دن کے د میں ایک ایسی چبھن تھی جو محرومی بن کر اس کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی۔ وہ سپنے ہمیشہ لئے ٹوٹ گئے تھے جو اس نے ایک بھرے پرے گھر کے لئے دیکھے تھے۔ حالات کی تما ترسنگینی کے باوجود اس نے تصور ہی تصور میں ماں اور باپ کو ہزاروں بار ایک ساتھ ہنس بولتے اور ان والدین کی طرح محبت کے ساتھ ایک ساتھ رہتے ہوئے دیکھا تھا دوسروں کے گھروں میں نظر آتے تھے۔ لیکن آج...... آج تو ان خوابوں کے سارے تا بانے بکھر گئے تھے۔

وہ خوفزدہ سی ہوگئی۔ وہ ماں سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی آنکھوں میں امڈتے چلے آتے تھے اور اس کا سارا وجود آنسوؤں میں ڈوب رہا تھا۔ چولہے پر رکھا چائے کا پانی ابل کر باہر گرنے لگا تو وہ چونکی۔ اس نے چائے ابھی پیالی میں نہیں ڈالی تھ کہ ماں باورچی خانے میں آئی۔

''خضرا...... چائے بن گئی......؟'' اس کا لہجہ اوپرا اوپرا سا تھا اور وہ اس سے آنکھیں چار نہیں کر رہی تھی۔

خضرا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ ماں قریب آئی، چند لمحے ٹھٹک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی جس پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ پھر ہولے سے اس کے سر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''خضرا...... میں تیرے دل کی حالت جانتی ہوں...... مجھے تیرے دکھ کا پتہ ہے..... لیکن تقدیر کے فیصلوں کے سامنے تو سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔''

''زرینہ...... زرینہ......! بھئی یہ چائے کب آئے گی؟''

عمر دراز کی آواز باورچی خانے کے اندر داخل ہوئی۔ ماں نے جلدی سے چائے کا پیالی اٹھالی اور کچن سے باہر نکل گئی۔

رات کا کھانا کھا کر عمر دراز باہر نکلا تو ماں اس کے قریب آئی۔ اس کے چہرے

ندامت لکھی تھی۔ اس نے پہلے خضرا کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہا، پھر کچھ ہچکچا کر پیچھے ہٹا لیا اور خجالت آمیز لہجے میں بولی۔

''خضرا...... تم ابھی بچی ہو۔ تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں نے یہ سب کچھ کتنا مجبور ہو کر کیا ہے۔ تمہارے باپ نے مجھے طلاق دے دی تھی تو پھر مجھے اس معاشرے میں زندہ رہنے کے لئے کسی سہارے، کسی نام کی تو ضرورت تھی ناں...... عمر دراز نے مجھے سہارا دیا ہے بیٹی...... وہ بہت ہمدرد اور اچھا انسان ہے...... وہ تمہیں بیٹی کی حیثیت سے قبول کر لے گا۔''

خضرا کو ماں کا معذرت آمیز لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ ماں ہو کر بیٹی کے سامنے صفائی کیوں پیش کر رہی تھی۔ خضرا کو اس کی باتوں میں حقیقت سے زیادہ مبالغہ نظر آیا۔ اس کا کوئی لفظ بھی اسے سچا نہیں لگا۔ پھر اس کے پاس یقین کرنے کے لئے تھا ہی کیا...... ماں نے، باپ نے جو کچھ بھی کیا تھا ان سے پوچھے بغیر، ان کی مرضی معلوم کئے بغیر، ان کے دل کا خیال کئے بغیر کیا تھا۔

اس نے بددلی سے سر اٹھایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

''امی! میں نے تو کچھ نہیں کہا۔''

ماں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن شاید اس کے اندر کے احساسِ جرم نے اسے کچھ اور نہیں کہنے دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں متذبذب سی کھڑی رہی...... شاید کچھ کہنے کی کوشش میں...... یا شاید کسی نئی دلیل کی کھوج میں...... جو اس کے فعل کا جواز بن جائے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کے درمیان رابطہ یک لخت منقطع ہو گیا ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں، دونوں علیحدہ علیحدہ دنیاؤں کے باسی ہیں۔

ماں کمرے سے باہر نکل کر نہ جانے کس کام میں مصروف ہو گئی اور خضرا چپ چاپ بیٹھی سوچوں کے ہجوم میں گھری رہی۔ وہ اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب اس نے عمر دراز کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ جھجک کر یک دم اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''بیٹھی رہو...... بیٹھی رہو۔'' عمر دراز نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن خضرا بغیر کچھ کہے سر پر آنچل ڈالتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ان کے بیڈ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے ماں کو دودھ کا مگ لے کر اس کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ مدھم مدھم

آوازیں اس تک پہنچیں، ہنسنے، باتیں کرنے کی آوازیں، پردہ کھینچنے اور دروازہ بند ہو
آوازیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے ماں کی ممتا کا دروازہ بھی اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو
ہے۔ ماں کا رشتہ کچے دھاگے کی صورت چٹ سے ٹوٹ گیا ہے۔ اسے لمحے بھر میں ماں
صورت بھول گئی۔ وہ اسے کوئی دوسری عورت معلوم ہونے لگی۔

وہ جب سے آئی تھی اسی کمرے میں ماں کے ساتھ سوتی تھی لیکن آج اس کمر
دروازہ اس پر بند ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج رات وہ کہاں سوئے گی
کمروں کی بدلی ہوئی ترتیب میں وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اپنے لئے سو
کی جگہ تلاش کرتی رہی...... اسے سب کچھ بے حد غیر محفوظ لگ رہا تھا۔ تنہائی جیسے رگ رگ
میں سرایت کر رہی تھی۔ یادوں کا کرب چاروں طرف برس رہا تھا۔

وہ بند دروازے کے پیچھے سے آنے والی دبی دبی آوازوں سے دور چھوٹے کمر
میں گھس گئی جہاں گھر میں نئی چیزیں آ جانے کی وجہ سے پرانا سامان یونہی ڈال دیا گیا تھا
وہ ٹوٹا ہوا بوسیدہ سامان جس سے اس گھر کی خوشبو آتی تھی، جواب کہیں یادوں میں ہی با
رہ گیا تھا۔ حقیقت میں تو اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔

میلے سے بلب کی زرد روشنی میں وہ ایک صوفے پر سکڑ سمٹ کر لیٹ رہی جس
اسپرنگ ڈھیلے ہو رہے تھے اور جگہ جگہ سے اس کی بھرائی جھانک رہی تھی۔ نیند اس
آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ساری ناخوشگوار یادیں اسے گھیرے کھڑی تھیں۔

ماں کی بار بار کی دستک نے اسے ہوشیار کیا تو دن چڑھ آیا تھا۔ رات کی بے چینی
نس میں کھلی ہوئی تھی۔ وہ کسلمندی سے اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ ماں نے اسے دیکھ کر
اطمینان کا سانس لیا۔ خضرا نے ایک بھرپور نگاہ ماں کے سراپے پر ڈالی۔ وہ تروتازہ او
شگفتہ تھی اور اپنی عمر سے کہیں کم نظر آ رہی تھی۔

ماں اس کی غیر معمولی گہری نگاہوں سے سٹپٹا سی گئی اور جلدی سے بولی۔

"خضرا دن چڑھ آیا ہے اور تم ابھی تک سو رہی ہو...... آؤ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔"

خضرا منہ وغیرہ دھو کر کچن میں آئی لیکن دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ عمر دراز چھوٹی تپا
سامنے رکھے ناشتہ کر رہا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر خضرا کی طرف دیکھا۔

"آ جاؤ...... رک کیوں گئی ہو؟" اس نے نوالہ نگلتے ہوئے کہا۔

ماں نے بھی اصرار کیا۔

"آؤ خضرا...... بیٹی! ناشتہ کر لو۔"

خضرا واپس نہیں پلٹ سکی۔ ان چاہے قدم لیتی باورچی خانے کے اندر آئی۔ ماں نے
یک پلیٹ میں کچھ سلائس اور انڈا رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ خضرا نے پلیٹ پکڑ لی اور چاہا
کہ اسے اندر کمرے میں لے جائے کہ عمر دراز نے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔

"بیٹھ جاؤ ناں...... کھڑی کیوں ہو؟"

ماں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ایک چھوٹی کرسی گھسیٹ کر تپائی کے قریب
کر دی۔ خضرا کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ لیکن اپنے سامنے رکھے ہوئے ناشتے میں سے کچھ بھی
کھانے کو اس کا دل نہیں چاہا۔

"زرینہ! تم نے اپنی بیٹی کو سلام کرنا بھی نہیں سکھایا......" عمر دراز نے ماں سے کہا۔

"بچی ہے نا...... شرماتی ہے آپ سے۔" ماں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

وہ منہ ہی منہ میں ہنسا۔

"میرا خیال ہے یہ اب بھی شرما رہی ہے۔ اسی لئے تو ناشتہ نہیں کر رہی، اسی طرح بیٹھی
ہے۔"

ماں بھی ہنسی۔ "اب آپ اس کی ہر بات تو نوٹ نہ کریں نا۔"

ماں باورچی خانے میں واپس آئی تو وہ اسی طرح ناشتہ سامنے رکھے بیٹھی تھی۔

"خضرا! ناشتہ کرو ناں بیٹی...... ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ماں نے ایک دزدیدہ نگاہ اس پر
الی۔ خضرا کرسی دھکیل کر اٹھ گئی۔

"نہیں...... میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"کیوں...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ماں نے قریب آ کر پوچھا۔

"ہاں...... ٹھیک ہے بالکل۔" اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا اور چلنے لگی۔

ماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "خضرا! اس بات کو دل سے نہ لگاؤ بیٹی...... یہ ہونا ہی تھا۔
ناید مقدر میں یہی کچھ لکھا تھا۔ ورنہ میں نے تمہارے باپ کے ساتھ نبھا کرنے کے لئے
لیا کیا جتن نہیں کئے لیکن اس نے میری کسی قربانی، کسی خدمت کا لحاظ نہیں کیا اور طلاق
برے منہ پر دے ماری۔ تم دونوں کو علیحدہ چھین کر لے گیا۔ میں نے تم دونوں کے لئے

جگہ جگہ خواری دیکھی۔ لیکن مجھے تمہاری ہوا بھی نہیں لگنے دی اس ظالم نے...... م
تمہارے لئے کیسا کیسا نہیں تڑپی...... پھر بیٹی! مجھے بھی تو زندگی گزارنی تھی نا...... اس د
میں رہنے کے لئے مجھے بھی تو کوئی سہارا چاہئے تھا۔'' وہ پھر اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''امی...... میں نے تو کچھ نہیں کہا۔'' خضرا نے اپنا بازو ماں کے ہاتھ سے چھڑا
ہوئے کہا۔

''تم ناشتہ کرلو بیٹی...... اپنی جان کو روگ نہ لگاؤ...... تم ابھی بچی ہو...... تمہیں دنیا
اونچ نیچ کا کچھ پتہ نہیں۔'' ماں نے اسے پھر کرسی پر واپس بٹھا دیا۔ ''بس اب آرام
ناشتہ کرو اور پھر تیار ہو جاؤ...... میں یہاں تمہیں استانی جی کے پاس بٹھا دوں...... وہ تمہیں
تیاری کروا دیں گی۔ تم اسی سال میٹرک کا امتحان دے دینا...... تمہارے باپ نے تو میر
ضد میں تمہارا بیڑا بھی ڈبو دیا...... مفت میں دو تین سال ضائع کروا دیئے...... میں چا
ہوں کہ تم پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔''

خضرا کو ماں کی اس بات میں نجات کا راستہ نظر آیا۔ ورنہ تو زندگی اسے ٹھہرا ہوا متعف
پانی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے ناشتے کی تپائی قریب کر لی اور خاموشی سے ناشتہ کر
لگی۔

استانی جی ایک مشفق اور محبت کرنے والی ادھیڑ عمر بیوہ تھیں۔ یہی ٹیوشنز ہی ان کی گز
اوقات کا ذریعہ تھیں۔ ان کے مہربان چہرے کے نقوش میں اب تک خوبصورتی اور سبک
پن تھا۔ سامنے کی کچھ لٹیں سفید ہو چلی تھیں۔ چکن کے سفید کپڑوں میں وہ بے حد اچھی
لگ رہی تھیں۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں خضرا کو اپنی بہت سی ہم عمر لڑکیاں بیٹھی پڑھ
نظر آئیں۔ انہوں نے بڑی شفقت سے اسے اپنے قریب بٹھایا اور مختلف سوالات کر
اس کی تعلیمی استعداد کا اندازہ لگاتی رہیں...... پھر ماں سے بولیں۔

''بچی ذہین ہے...... میرا خیال ہے کورس مکمل کر لے گی۔''

''بس استانی جی...... میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس سال میٹرک کر جائے۔'' ماں
جلدی سے کہا۔

''کیوں نہیں...... محنت کرے گی تو میٹرک کیا ایم اے بھی کرے گی۔'' استانی جی
خضرا کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے استانی جی...... آج تو میں اسے لے کر جا رہی ہوں۔ کتابیں کاپیاں خرید دوں گی...... کل یہ پڑھنے آ جائے گی۔ آپ اسے اپنی ہی بچی سمجھیں۔'' ماں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''میرے لئے کوئی بچی غیر نہیں...... سب بچیاں میری اپنی ہیں۔'' استانی جی نے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔ ان کے لہجے کی مہربانی ان کے مہربان چہرے پر بھی تھی۔

خضرا کو وہ بے حد اچھی لگیں۔ اس کے من کے اندھیروں میں ان کے چہرے کی چاندنی نے اجالا سا کر دیا۔ ماں نے اسے ساتھ لیا اور استانی جی کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ وہ گھر جانے کی بجائے بازار کی طرف ہو لی۔ اس نے خضرا کو بتایا کہ وہ اس کی کتابیں وغیرہ خرید کر ہی گھر جائے گی تا کہ کل سے اس کی پڑھائی باقاعدگی سے شروع ہو سکے۔ خضرا کے ذہن پر چھایا ہوا غبار بھی قدرے ہلکا ہوا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اسے خود کچھ کرنے کا موقع ملے گا تو وہ ان سارے رشتوں سے بے نیاز ہو جائے گی جن رشتوں نے اس کے دل سے رشتوں کی ساکھ ہی بھلا دی تھی۔

پُر رونق بازار میں گہما گہمی تھی۔ لوگ اپنی دھن میں مگن چلے جاتے تھے۔ خریداری کے بیگ اٹھائے تیزی اور افراتفری میں...... جیسے کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ خضرا ماں کے ساتھ ساتھ چلتی ارد گرد ایک تحیر آمیز نگاہ ڈال رہی تھی۔ اس نے ایک عرصے بعد بازار کی جیتی جاگتی رونقیں دیکھی تھیں۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور شیشے کے بڑے بڑے شو کیسوں سے سجی ہوئی دکان کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

خضرا کو حیرت ہوئی۔ یہ کتابوں کی دکان نہیں تھی۔ رنگ برنگ سامان سے لدا ہوا یہ کوئی جنرل سٹور تھا جس کے مختلف کاؤنٹروں پر زیادہ تر عورتیں ہی خریداری کر رہی تھیں۔ ماں چھوٹے چھوٹے قدم لیتی کاؤنٹر کے قریب پہنچی۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص یکدم اٹھ کھڑا ہوا اور گرم جوشی کے لہجے میں بولا۔

''آؤ...... آؤ زرینہ...... تم آج کس طرح بھول پڑیں۔''

خضرا نے نیچی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ بلی جیسی آنکھیں اسے ماضی کے گزرے لمحوں میں بہت دور تک لے گئیں۔ اس کی پہچان جاگ اٹھی۔ وہ یقیناً بلا بھائی ہی تھا جو پہلے کی نسبت کافی فربہ ہو گیا تھا۔ گالوں پر چڑھی ہوئی چربی کی وجہ سے اس کی بلی جیسی

آنکھیں اندر کو دھنس کر پہلے جیسی نمایاں نہیں رہی تھیں لیکن ان کی پراسرار چمک اب
ویسی ہی تھی۔

''ہم غریبوں کو تو تم نے بالکل ہی بھلا دیا ہے......'' وہ شکوہ کر رہا تھا۔

''اوہ......تم جیسے غریب......'' ماں نے ایک شریری تفاخر آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔

''غریب نہیں تو اور کیا؟......تم جیسے ہماری دکان پر آئیں تو ہم امیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن
تمہیں تو یہ بھی گوارا نہیں۔'' اس کے انداز میں ایک چھیڑ سی جاگی۔

''اچھا......رہنے دو تم ان باتوں کو......'' ماں نے ناز سے کہا۔ ''دراصل میں تو بازار آئی
تھی، یہ خضرا کی کتابیں لینے......تمہاری دکان کھلی دیکھی تو سوچا ایک دو ضرورت کی چیزیں
اور بھی لیتی چلوں۔''

''ایک دو چیزوں کی کیا بات ہے......ساری دکان ہی تمہاری ہے۔'' بلّا بھائی نے ا
آنکھوں کو خضرا پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا اور پھر چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بو
''زرینہ! سچ بتانا......یہ تمہاری بیٹی خضرا ہی ہے؟''

ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور تفاخر آمیز نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تو بہت بڑی ہو گئی ہے......پہلی نظر میں تو پہچانی نہیں جاتی۔'' بلّا بھائی نے بدستور
خضرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایمان سے تمہاری بیٹی نہیں، چھوٹی بہن لگتی ہے۔ تم
کیا سدا بہار ہو۔''

بلّا بھائی نے یہ بات صرف ماں کو سنانے کے لئے دبی زبان میں کہی۔ لیکن خضرا
بھی اسے صاف سنا۔ اسے بلّا بھائی کی یہ بے تکلفی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ماں
شاید خضرا کے خیال سے بات بدلنے کو کہا۔

''بھئی ہمیں تو دیر ہو رہی ہے۔ میں نے بھی خضرا کے لئے کتابیں بھی خریدنی ہیں۔''

''کتابیں بھی آ جائیں گی۔ تمہارے حکم کرنے کی دیر ہے۔'' بلّا بھائی نے معنی خیز
میں کہا اور نسبتاً بلند آواز میں پکارا۔ ''چھوٹے......او چھوٹے......ادھر آ۔''

ایک چھوٹے سے قد کا لڑکا لپک کر آیا۔

''بات سن......'' بلّا بھائی نے سیف کی دراز کھینچ کر سو سو روپے کے دو کرنسی نوٹ نکا
کر اس کی طرف بڑھائے۔ ''پہلے حاجی کی دکان سے بوتلیں پکڑ کر دے جا۔ اور پھر

میں میرزا صاحب کی کتابوں کی دکان پر چلے جانا......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خضرا سے
مخاطب ہوا۔ ''کون سی کلاس کی کتابیں چاہئیں بے بی؟''

خضرا کوئی جواب نہ دے سکی۔ ماں نے جلدی سے کہا۔ ''تم یہ بوتلوں کا تکلف وغیرہ
رہنے دو۔ بس کتابیں منگوا دو۔ تمہاری مہربانی......اب ہم کہاں دھوپ میں خوار ہوتے
پھریں گے۔ آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے۔'' اس نے پرس کھول کر کتابوں کی فہرست نکال
کر دی اور دس دس کے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر گنتے ہوئے بولی۔

''ٹھہرو......یہ پیسے بھی لے جاؤ۔''

''بس اب تم اپنی یہ ساہوکاری تو رہنے دو۔ حساب کتاب بعد میں ہو جائے گا۔'' بلّا
بھائی نے اس کے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی چھین کر کاؤنٹر پر رکھے اس کے پرس میں
ڈال دی۔ ماں نے بہتیرا انکار کرنے کی کوشش کی لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یہ انکار
کتنے اوپرے دل سے کر رہی ہے۔ اس نے پرس دوبارہ کھولنے کی زحمت نہیں کی اور یونہی
زبانی کلامی بلّا بھائی کے ساتھ ہنستی مسکراتی شوخ و شریر بحث کرتی رہی۔

بوتلیں آ گئیں۔ ماں نے نہ نہ کرتے ہوئے ایک بوتل تھام لی اور دوسری خضرا کے
ہاتھوں میں دے دی۔ خضرا کے لئے یہ سب کچھ بے حد عجیب اور پریشان کر دینے والا تھا۔
بلّا بھائی بظاہر ماں سے باتیں کر رہے تھے لیکن ان کی بلی جیسی پراسرار آنکھوں کا زاویہ بار
بار اس کے وجود سے بھی چھو جاتا تھا۔ وہ شوخ و شریر باتوں کے درمیان اسے بھی مخاطب کر
لیتے تھے۔

خضرا کو نہ ان کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں نہ ان کی نگاہیں۔ وہ اس کاؤنٹر سے سرکتی
ہوئی آگے بڑھ گئی اور مختلف شوکیسوں میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر وقت گزارنے لگی۔ مگر
اس کا ذہن ابھی تک اس کاؤنٹر کی طرف تھا جہاں ماں، بلّا بھائی کے ساتھ باتوں میں لگی
ہوئی تھی۔ اس طرح نہ جانے کتنی طویل گھڑیاں بیت گئیں۔ پھر ماں نے اسے پکارا۔ اس
نے دیکھا کہ کتابوں کا بندھا ہوا پیکٹ آ گیا ہے۔ ماں نے ایک مرتبہ پھر پرس کھول کر بلّا
بھائی کو کتابوں کی قیمت دینے کی اداکاری کی اور بلّا بھائی نے پیسے لینے سے انکار کرتے
ہوئے ماں کا پیسوں والا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پیسوں سمیت اس کی مٹھی بند کر دی۔
ماں نے ایک ادائے دلنواز سے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبا لیا اور مصنوعی خفگی

سے بولی۔

''بس اسی لئے میں تمہاری دکان پر نہیں آتی۔ بہت زیادتی کرتے ہو تم۔''

بلاّ بھائی ہنسے۔ ''میں زیادتی کرتا ہوں...... ایمان سے کہنا، میں نے کبھی کی زیادتی؟''

ماں نے سر جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کتابوں کا پیکٹ اٹھا کر خضرا سے بولی۔ ''چلو خضرا۔''

خضرا سر جھکا کر ماں کے ہمراہ چلنے لگی تو بلاّ بھائی نے پکارا۔

''بے بی...... بے بی سننا......''

خضرا چونک گئی۔ ماں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ بلاّ بھائی نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''بے بی...... یہ تمہارے لئے ہے۔''

خضرا نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے پھر خفا ہونے کی اداکاری کی۔ ''بھئی یہ تکلف ہے؟''

''تم رہنے دو زرینہ...... یہ میرا اور بے بی کا معاملہ ہے۔'' بلاّ بھائی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ماں پھر ہنس پڑی۔ اس نے لفافہ تھام لیا اور خضرا کے ہمراہ دکان سے باہر آ گئی۔

خضرا کے لئے یہ سب کچھ بے حد عجیب اور ناپسندیدہ تھا۔ اسے کتابوں کے پیکٹ چوڑیوں، کلپوں اور ربنوں سے بھرے ہوئے خاکی لفافے سے گھن آ رہی تھی۔ وہ نا سمجھ تھی کہ ماں کے انکار میں چھپے اقرار اور بلاّ بھائی کے بے جا التفات میں چھپے ہوئے مع... نہ پا سکے۔ وہ ندامت و خجالت میں ڈوبی جا رہی تھی۔ اسے اپنا آپ بڑا ہی نیچ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اندر نفرت کا لاوا سا پھوٹ رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے اظہار پر قادر نہیں تھی ماں سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے رویے کی بدصورتی اسے کھٹکنے لگی تھی۔

اب اس کے انداز میں ماں کی سی ممتا نہیں رہی تھی۔ اس نے بھول کر بھی کبھی خو... تذکرہ نہیں کیا تھا۔ نہ اسے کبھی یاد کیا نہ اس کے بارے میں سوچا۔ عمر دراز آتا تو وہ اس... ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتی۔ یہ بھول کر کہ ساتھ والے کمرے میں اس کی بیٹی موجود ہے۔

خضرا اب بہت کم اپنے کمرے سے نکلتی تھی۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر...

کر دی تھی۔ اس توقع میں کہ وہ خود کو کسی قابل بنا سکے۔ استانی جی بے حد مہربان تھیں۔ وہاں پڑھنے والی کچھ لڑکیوں سے اس کی جان پہچان بھی ہو گئی تھی لیکن وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے گھر تک نہیں لائی تھی۔ گھر اسے ایک قید خانہ سا معلوم ہوتا تھا جس کی چار دیواری میں سانس لینا کسی ناکردہ گناہ کی سزا معلوم ہوتا تھا۔

ماں کے ساتھ اس کی بہت کم بات ہوتی تھی۔ دونوں کے درمیان جیسے تکلف کی ایک اونچی دیوار آن کھڑی ہوئی تھی۔ ماں بھی اس سے بس ضرورت کی بات ہی کرتی تھی۔ اس کے لہجے میں سے ماں کا لہجہ نفی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ایک روز وہ کتابیں لئے بیٹھی تھی کہ ماں نے کمرے میں جھانکا۔

''خضرا...... ذرا نیچے والے کمروں کی جھاڑ پونچھ تو کر دو۔ الماریوں کو بھی صاف کر کے ساری چیزیں نکال لینا۔''

خضرا نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا کہ وہ یہ اہتمام کیوں کر رہی تھی۔

''میرا خیال ہے نیچے کرایہ دار رکھ لیں۔ تھوڑی آمدنی ہی ہو جائے گی۔ خالی پڑے ہوئے کمرے ہمیں کیا دیتے ہیں...... دیکھو نا...... تمہاری پڑھائی وغیرہ کا بھی تو خرچہ ہے نا۔ تمہارے باپ نے تو پلٹ کر نہیں پوچھا۔'' ماں نے وضاحت کی۔

خضرا اندر ہی اندر کٹ کر رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھیک کے ٹکڑوں پر پڑی ہے۔ اس کی آنکھوں میں گرم آنسوؤں سے چبھن سی ہونے لگی۔ اس کے حلق میں جیسے کوئی چیز آن کر اٹک گئی۔ وہ بے دردی سے ہونٹ کاٹتی ہوئی اٹھ گئی اور اندر ہی اندر آنسو پیتی زینہ زینہ اتری۔

نیچے کے دونوں کمرے تقریباً خالی ہی تھے۔ خضرا کے ذہن میں ہزاروں سوال چکرا رہے تھے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے اپنا وجود بے حد فالتو اور بیکار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ کی طرح جو کمرے میں بھرا ہوا تھا۔ جسے سمیٹ کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال دینا تھا۔

اس نے بے دلی سے جھاڑ پونچھ کی، فرش دھو کر خشک کئے۔ الماریوں کی صفائی کی اور ان میں بھرا کاٹھ کباڑ اور دوسری فالتو چیزیں سمیٹیں اور انہیں زینے کے نیچے بنے ہوئے سٹور میں رکھنے کے لئے سٹور میں داخل ہوئی تو وہاں بھی حالت ابتر تھی۔ اس نے سوچا کہ

لگے ہاتھوں یہاں کی بھی تھوڑی بہت صفائی کر دے۔ وہ اپنے خیال میں ابھی جھاڑ پو
میں لگی ہوئی تھی کہ اچانک دو مضبوط بانہوں نے اس کی نازک کمر کو حلقے میں لے لیا۔ خض
کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ پوری قوت سے بانہوں کے اس حصار کو توڑ کر باہر نکلی اور ا
نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سارے بدن میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"اوہ!...... یہ تم ہو خضرا؟" عمر دراز استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ "میں سمجھا تمہاری ما
ہے۔ دراصل تم نے اس کے کپڑے پہن رکھے ہیں نا...... تو مجھے مغالطہ ہو گیا تھا۔ تم کچ
خیال نہ کرنا...... اچھا......" اس نے قدرے پشیمانی سے وضاحت کی۔

خضرا خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

"تم پریشان نہ خضرا......" وہ قریب آیا۔ وہ گھبرا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔ "پگلی......
خوامخواہ گھبرا رہی ہے۔ خدا کی قسم میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں واقعی سمجھا تھا کہ اسٹو
میں تمہاری ماں ہے۔ تم بالکل اسی کی طرح لگتی ہو۔ تمہارا قد بھی تو اس کے برابر ہے۔ بس
تم کچھ خیال نہ کرنا...... شاباش۔"

خضرا گنگ سی ہو کر سہمی ہوئی بے یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"میری بات پر یقین کرو خضرا...... مجھے غلط نہ سمجھو...... مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہاں تم ہو...... اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ لیکن میں پھر بھی تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ چلو مجھے معاف کر دو...... معاف کر دو مجھے۔" عمر دراز نے ساکت کھڑی ہوئی خضرا کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر منت بھرے لہجے میں کہا۔

خضرا پیچھے ہٹی...... عمر دراز نے سر جھٹکا...... "اوہو بھئی...... تم تو یوں ڈر رہی ہو جیسے می
تمہیں کھا جاؤں گا۔" وہ اس کے قریب آیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا چاہتا تھ
کہ خضرا نے بجلی کی سرعت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسٹور سے باہر نکل جانا چاہا۔ لیکن عم
دراز نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ خضرا نے سہم کر اس کی طرف دیکھا۔

"بات سنو لڑکی...... اپنی ماں سے اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ وہ وہمی سی عورت ہے۔ مفت میں بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے سمجھیں۔" اس کا لہجہ نسبتاً درشت ہو گیا۔

خضرا نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور اس سے بازو چھڑا کر گرتی پڑتی سارا زینہ طے کر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟...... کہاں جائے؟...... کس

سے بات کرے؟...... کس کے سامنے اپنے زخم کھولے؟

ماں شاید غسل خانے میں تھی اس لئے کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے اپنے کمرے میں پہنچی۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے عمر دراز اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

اسے باپ سے کبھی انس نہیں رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اسے بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ خرم سے بچھڑنے کا احساس اس کی رگ رگ میں زہر بھر رہا تھا۔ اگر وہ ان دونوں کی چھاؤں میں ہوتی تو اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو نہ ہوتے۔

وہ سارا وقت کمرے میں گھسی بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لئے بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ رات کو ماں نے آ کر پوچھا تو اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا۔ ماں اسے اسپرین لینے کی تاکید کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور وقفے وقفے سے ماں اور عمر دراز کی آوازیں ہنسی میں لتھڑی ہوئی اس تک آنے لگیں۔ خضرا نے تکیے میں منہ چھپا لیا اور آنسوؤں سے تکیہ بھگونے لگی۔

اس نے کمرے سے نکلنا بہت کم کر دیا۔ خصوصاً عمر دراز کی موجودگی میں تو وہ بالکل باہر نہیں نکلتی تھی۔ اس کے دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ اسے ہر شے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے خرم بہت یاد آتا تھا۔ وہی تو ایک سچا رشتہ تھا جو اس کی زندگی میں باقی بچا تھا۔ لیکن تقدیر نے اسے بھی مفارقت اور لاعلمی کی دھند میں کہیں چھپا دیا تھا۔

وہ اپنی پڑھائی کی طرف بہت توجہ دینے لگی تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کی منزل یہ گھر نہیں۔ اسے اس سے آگے جانا ہے۔ وہ دل ہی دل میں مستقبل کے تانے بانے بنتی رہتی۔ وہ بچھڑے ہوئے خرم کو تلاش کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا سہارا لے کر وہ سارے سہاروں سے بے نیاز ہو جائے۔

وہ استانی جی کے یہاں عموماً ساڑھے دس گیارہ بجے جاتی تھی۔ اس وقت تک عمر دراز کام پر چلا جاتا تھا اور ماں صفائی وغیرہ کر کے فارغ ہو جاتی تھی۔ اس روز بھی خضرا نے کتابیں اور فائل اٹھائی اور ابھی کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اگلا قدم روک لیا۔ آواز عمر دراز کی تو نہیں تھی۔ پھر باہر

کون ہوسکتا تھا؟ وہ بھی اندازہ لگانے کے لئے غور سے سننے لگی۔

"زرینہ بیگم...... تمہارا مکان کل سے کرائے پر چڑھ جائے گا۔ اور کوئی حکم......؟ خدمت ہمارے لائق؟" نامانوس سی مردانہ آواز نے کہا۔

ماں کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ "ایک دم سے ساری خدمتیں تو نہیں لے لینی ناں۔ بچا کر بھی رکھنی ہیں۔"

"اچھا!!......" لہجہ شریر تھا۔ "یوں کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے خدمت گار بہتیر[ے] ہیں۔ تمہیں ہماری ضرورت ہی نہیں۔"

"بکواس نہ کیا کرو......" ماں کی آواز میں محظوظ ہونے کی سی کیفیت تھی۔

"ہاں بھئی...... جو سچ بولے وہ بکواس ہی کرتا ہے۔" انداز چھیڑ چھاڑ کا سا تھا۔

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی ہنسی کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہی۔ پھر ا[س] نے ہنستے ہنستے بمشکل کہا۔

"تم بڑے وہ ہو رؤف۔"

"اچھا...... ہم وہ ہیں...... اور وہ عمر دراز کیا ہے...... ہمارا رقیب روسیاہ...... قسم خدا [کی] بعض اوقات تو دل چاہتا ہے سالے کو......"

"ارے، ارے...... خبردار...... میرے مجازی خدا کو کچھ مت کہنا۔" ماں نے اس [کی] بات کاٹتے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا۔

"آہا...... عمر دراز اور مجازی خدا......!!" وہ مذاق اُڑاتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔

دہلیز پر کھڑی ہوئی خضرا ایک ناقابل فہم اذیت میں ڈوب گئی۔ وہ اتنی نا سمجھ نہیں تھی [کہ] اس گفتگو کی نوعیت کو سمجھ نہ پاتی۔ اس کا رواں رواں ندامت میں ڈوب گیا۔ وہ یہ سو[چنا] نہیں چاہتی تھی کہ ماں ویسی ہی ہے جیسی کہ باپ کہتا تھا۔ لیکن وہ ان لمحوں کو کس طرح [سے] جھٹلا دیتی...... وہ اپنے کانوں سے ایک غیر مانوس مردانہ آواز میں اس کی شوخ ہنسی کو گھلتے ملتے سن رہی تھی۔ شوخ فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا اور خضرا ساکت سی ہو کر سنتی رہی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اسے سولی پر چڑھے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔

"خضرا...... او خضرا......" اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

وہ چونک گئی۔ ماں نے پھر پکارا تو وہ اکھڑے ہوئے قدموں کے ساتھ باہر آ[ئی]

برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا وہ اونچا لمبا بھدا شخص اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لو دیکھ لو خضرا کو...... ماشاءاللہ کتنی بڑی ہوگئی ہے۔" ماں نے اسے مخاطب کیا۔

"ارے واقعی...... یہ تو ماشاءاللہ بہت بڑی ہوگئی ہے۔" اس نے قریب آکر خضرا کے سر پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ "بھئی میں تمہارا انکل رؤف ہوں...... کچھ یاد ہے تمہیں؟"

خضرا سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

"یہ اب بھی ویسی کی ویسی ہے، شرمیلی۔" رؤف نے اس کے گریز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا ایک بھائی بھی تو تھا...... وہ کہاں ہے؟"

خرم کے ذکر پر خضرا کی آنکھیں بھیگ سی گئیں

"وہ اس کے باپ کے پاس ہے۔" ماں نے یوں جلدی سے کہا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کہیں خضرا خرم کے بارے میں کچھ اور نہ کہہ دے۔

خضرا کو حیرت ہوئی۔ یہ کیسی ماں تھی؟...... جسے اپنے بیٹے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے اندر نفرت کا لاوا سا پھوٹنے لگا۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور انہیں خوش گپیوں میں مصروف چھوڑ کر زینہ اترنے لگی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اگلے روز وہ استانی جی کے گھر سے واپس آئی تو نچلے برآمدے میں کچھ سامان، کچھ اٹیچی کیس اور بستر بند وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ 'شاید کرایہ دار آگئے ہیں۔' خضرا نے دل ہی دل میں سوچا اور زینہ چڑھ کر اوپر آگئی۔ ماں شاید کچن میں تھی اسی لئے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ خضرا کتابیں وغیرہ رکھ کر منہ ہاتھ دھو رہی تھی کہ ماں نے پکارا۔

خضرا، تولیے سے منہ پونچھتی کچن کے دروازے پر آئی۔

"بات سن خضرا......!" ماں نے ایک ٹرے میں کھانے کی پلیٹیں رکھتے ہوئے کہا۔ "نیچے کرائے دار آگئے ہیں۔ تُو انہیں یہ کھانا دے آ...... آج ہی آئے ہیں۔ کہیں گے کھانے تک کا کسی نے نہیں پوچھا۔"

"امی...... میں دے کر آؤں؟" خضرا نے برا سا منہ بنایا۔

"اور کیا میں جاؤں گی؟...... مجھ سے بار بار زینہ نہیں اُترا چڑھا جاتا...... جا شاباش، لے جا۔" ماں نے ٹرے اٹھا کر اسے تھمائی۔

خضرا ٹرے سنبھالے ہوئے زینہ اتری۔ چھوٹے سے صحن اور برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ برآمدے میں پڑا ہوا کچھ سامان بھی اندر جا چکا تھا۔ کمرے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اندر کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ خضرا نے کچھ ہچکچا کر دروازے پر دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہے...... آ جایئے......" ایک مردانہ آواز نے جواب دیا۔

خضرا کچھ جھجکی، اس نے پھر دستک دی۔ جواباً اسی آواز نے اندر آ جانے کو کہا۔

خضرا متذبذب سی ہو گئی۔ وہ اندر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کرائے دار کو دروازے پر ہی ٹرے تھما کر لوٹ جائے گی۔ اسی لئے اس نے پھر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

"اوہو...... بھئی کہہ رہا ہوں کہ اندر آ جاؤ...... سنائی نہیں دیتا کیا؟" جھنجلائی ہوئی آواز دروازے کی طرف آئی۔

دوسرا پٹ بھی وا ہوا، پھولے ہوئے گھنگھریالے بالوں اور فراخ پیشانی والا ایک خوش شکل نوجوان اس کے روبرو تھا۔

"آ...... آپ......؟" وہ غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر شاید اپنے لہجے پر پشیمان ہوا۔

"جی...... میں کھانا لائی تھی۔" خضرا نے کھانے کی ٹرے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ...... کھانا؟...... بھئی اس کرم فرمائی کا سبب آخر کیا ہے؟...... یہ آپ فرشتۂ رحمت بن کر کہاں سے آ گئی ہیں؟...... میں تو اس وقت کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔" اس نے بے حد خوش طبعی سے کہا اور اس کے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے پکڑنے کی بجائے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

"آپ اندر تو تشریف لے آئیں۔ خدا کی قسم آپ نے تو دل خوش کر دیا ہے۔"

خضرا نے سمٹ کر بازو چھڑا لیا اور کھانے کی ٹرے قریب ہی پڑے ایک میز پر رکھی اور جانے کے لئے پلٹ گئی مگر اس نے راستہ روک لیا۔

"ٹھہریئے تو سہی ناں...... کچھ تو بتایئے کہ آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں مجھ بیچارے اکیلے پر یہ عنایت فرمانے؟"

خضرا جھجک کر انگلی پر آنچل لپیٹتے ہوئے بولی۔ "میں اوپر سے آئی ہوں۔"

"اوپر سے......؟" وہ ہنسا۔ "یعنی اوپر سے؟......" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور ٹرے پر سے خوان پوش اٹھاتے ہوئے شرارت سے بولا۔ "آہا...... اس کا مطلب ہے ہمارے لئے من وسلویٰ اتر آیا ہے۔"

اس نے آنکھ کے گوشے سے سٹپٹائی ہوئی خضرا کی طرف دیکھا۔ "آپ کون سے آسمان کی حور ہیں؟"

خضرا گڑبڑا گئی۔ "میں خضرا ہوں اور اوپر والے گھر سے آئی ہوں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ آپ آج ہی آئے ہیں اس لئے میں یہ کھانا آپ کو دے آؤں۔" اس نے ایک ہی سانس میں پوری تفصیل بتا دی۔

"بس بس...... مجھے یقین ہے کہ آپ کو آپ کی امی نے ہی بھیجا ہے۔ اب بیٹھ تو جایئے، کھڑی کھڑی تھک جائیں گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں بس، میں چلتی ہوں۔" خضرا نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

"اچھا...... تو آپ ڈرتی ہیں کہ اگر آپ ٹھہریں تو میں کوئی اور فرمائش نہ کر دوں؟" اس نے چھیڑا۔

"نہیں...... یہ بات نہیں ہے۔" خضرا نے تردید کی۔

"یہ بات نہیں ہے تو پھر ایک فرمائش سن لیجئے۔ بھئی دیکھئے نا اتنا اچھا کھانا کھانے کے بعد ایک پیالی چائے کی طلب بھی ہو گی۔ اور اس وقت سارا سامان بکھرا پڑا ہے۔ میں خود بھوت بنا ہوا ہوں۔ نہ خود چائے بنا سکتا ہوں اور نہ باہر جا سکتا ہوں۔ اس لئے چائے بھی آپ ہی کو پلانی پڑے گی۔" وہ کرسی کھینچ کر کھانے کے لئے بیٹھتا ہوا بولا۔

خضرا کو موقع غنیمت معلوم ہوا۔ وہ بغیر کچھ کہے تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اوپر آئی تو ماں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ خضرا نے قدرے بیزاری سے اطلاع دی۔

"وہ چائے مانگ رہا ہے۔"

"اچھا......" ماں مسکرائی۔ "چل ایک پیالی بنا کر دے آ...... ہم نے کون سی روز روز دینی ہے۔ اب اس نے اپنے منہ سے جو مانگ لی ہے۔" اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا اور کچن سے باہر نکل گئی۔

خضرا نے برا سا منہ بنایا۔ وہ ذہنی طور پر بہت اکتائی ہوئی تھی لیکن ماں کے سامنے انکار نہیں کر سکی۔ اوپرے دل کے ساتھ اس نے ایک پیالی چائے بنائی اور زینہ اتر کر اس کے کمرے کے باہر پہنچی۔ اس نے دستک دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ دہلیز پر نمودار ہو کر بولا۔

''مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آپ آ گئی ہیں۔''

خضرا نے وہیں کھڑے کھڑے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔

''اوں ہوں...... یہ کون سا طریقہ ہے چائے دینے کا۔'' اس نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ ''اندر تشریف لائیے، چائے میز پر رکھئے اور مجھ ناچیز کو شکریہ ادا کرنے کا موقع دیجئے۔''

خضرا کو مجبوراً آگے بڑھنا پڑا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر ٹرے میں جمائے اور بغیر اس کی طرف دیکھے ٹرے اٹھا کر چلنے لگی تو وہ قریب آیا۔

''کھانا بہت اچھا تھا...... آپ نے بنایا تھا؟''

''نہیں......'' خضرا نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

''اور یہ چائے......؟'' اس نے پیالی اٹھا کر ایک چسکی لی۔

''میں نے بنائی ہے۔'' خضرا نے یوں مدہم لہجے میں کہا جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہی ہو۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے...... چائے تو بہت اچھی ہے۔'' وہ زوردار لہجے میں کہنے لگا۔

خضرا نے پھر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنا سامان کھول لوں تو پھر آپ کو بہت مزیدار سی چائے پلاؤں گا۔ میں چائے بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔''

خضرا نے کوئی جواب نہیں دیا اور برتنوں کی ٹرے اٹھا کر چلی آئی۔

ماں کرایہ دار پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی۔ دوسرے روز بھی اس نے کھانے کی ٹرے سجائی اور خضرا کو تھماتے ہوئے بولی۔

''لے نیچے کرائے دار کو کھانا دے آ...... کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو پوچھ لینا۔''

خضرا نے سجی ہوئی ٹرے کی طرف دیکھا جو اس کے ہاتھوں میں تھما دی گئی تھی اور دل

میں سوچا کہ بھلا اس باتونی کرائے دار کو آج کھانا پہنچانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بازار سے بھی تو کھانا کھا سکتا ہے۔ لیکن نہ ماں سے سوال کر سکتی تھی کہ وہ اسے کھانا کیوں بھجوا رہی ہے اور نہ کرایہ دار سے ہی کہہ سکتی تھی کہ وہ بازار سے کھانا کیوں نہیں کھاتا۔

زینہ اترتے ہوئے اسے اس کی شوخ آنکھیں اور شریر باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک نامعلوم سی جھجک اسے آہستہ رو بنا رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ابھی برآمدے میں ہی پہنچی تھی کہ کرایہ دار دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اسے کھانے کی ٹرے اٹھائے دیکھ کر وہ کھل اٹھا اور بڑے تپاک سے بولا۔

''واہ، واہ...... کتنے وقت پر آئی ہیں آپ۔'' الٹے قدموں کمرے کے اندر جاتے ہوئے اس نے خم ہو کر پورے آداب سے کہا۔ ''آئیے، آئیے...... تشریف لائیے...... خوش آمدید، خوش آمدید!''

خضرا محجوب سی ہو گئی۔ اس نے کمرے کے اندر داخل ہو کر کھانا جلدی سے میز پر رکھ دیا اور وہ سینے پر بازو لپیٹے مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کھانا رکھ کر پلٹی تو وہ خوش طبعی سے بولا۔

''بھئی آپ کو کس طرح پتہ چل جاتا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں ابھی کھانا کھانے کے لئے ہی نکل رہا تھا۔ آپ بالکل صحیح وقت پر پہنچی ہیں۔ ویسے آپ لوگ بہت تکلیف کر رہے ہیں۔ میری تو عادتیں خراب ہو جائیں گی۔ مجھے گھر کا کھانا کھانے کی عادت پڑ گئی تو ہوٹل کا کھانا اچھا نہیں لگے گا...... پھر میں بیچارا کیا کروں گا؟''

خضرا نے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبا لیا۔ اسے کچھ نہیں سوجھا کہ اس کے جواب میں کیا کہے۔ وہ مسکرایا اور قریب آ کر مصنوعی رازداری سے بولا۔

''ویسے آپس کی بات ہے میں یہ سب کچھ آپ کی والدہ کے لئے کہہ رہا ہوں اور محض تکلفاً۔ انہیں آپ بھی بتائیے گا۔ ورنہ میں آپ کو سچ سچ بتاؤں کہ مجھے آپ کا اس طرح کھانا لے کر آنا بہت اچھا لگتا ہے۔''

خضرا نے دراز پلکوں کو جنبش دی اور ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے حسین چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''کچھ تو بولا کیجئے۔ اتنی سی بات کرنے میں آپ کی آواز کچھ زیادہ خرچ نہیں ہو گی۔'' وہ

ہنس کر بولا۔

''بس میں چلتی ہوں۔'' خضرا نے اس کی گہری نگاہوں سے گھبرا کر کہا۔

''میں نے اس قسم کے فقرے بولنے کو تو نہیں کہا۔'' وہ کہنے لگا۔

''امی کہہ رہی تھیں کہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔'' خضرا نے اطلاع د کے انداز میں کہا۔

''جو کچھ امی کہتی ہیں آپ بھی وہی کہتی ہیں؟'' وہ اس کی بات کا جواب دینے بجائے اس سے سوال کرنے لگا۔

خضرا شپٹا گئی۔ اپنی نرم انگلیوں کو مسلتے ہوئے اس نے مبہم سا فقرہ کہا۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ اپنی طرف سے بھی تو کچھ کہا کریں نا۔'' وہ بولا۔

خضرا نے جواب نہیں دیا اور چلنے کی ٹھانی تو وہ جلدی سے بولا۔

''اپنی والدہ سے میرا شکریہ کہہ دیجئے گا۔ اور آج آپ کو چائے بنانے کی تکلیف نہ دوں گا۔ میں نے ہیٹر وغیرہ نکال لیا ہے۔ میں خود چائے بناؤں گا اور آپ بھی میرے ساتھ ایک پیالی چائے پیجئے گا۔''

خضرا کچھ متذبذب ہوئی تو وہ اس کی نظر پہچان کر بولا۔

''آپ اپنی امی سے پوچھ آئیں۔ انہوں نے اجازت دی تو بسر و چشم...... تب تک میں کھانا بھی کھا لوں گا۔''

خضرا کوئی رضا مندی دیئے بغیر ہی اس کے کمرے سے لوٹ آئی اور ماں سے تذکرہ کئے بغیر اپنے کمرے میں گھس گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں ماں کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ اسے ہی پکار رہی تھی۔

خضرا اٹھ کر کمرے سے باہر آئی تو ماں نے برتن دھوتے ہوئے کہا۔

''خضرا جا، کرائے دار سے برتن لے آ...... میں وہ بھی دھو لوں۔''

خضرا کچھ الجھی لیکن ماں سے کہہ نہیں سکی کہ کرائے دار نے اسے چائے پینے کی دعوت دی تھی۔ ماں نے اسے یوں کھڑے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

''اس طرح کیوں کھڑی ہے...... جاتی کیوں نہیں؟''

خضرا کو پھر بھی بتانے کی ہمت نہیں پڑی اور وہ زینہ اترنے لگی۔

کرایہ دار کھانا کھا چکا تھا اور اس نے بجلی کے ہیٹر پر ایک چھوٹی سی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ وہ خضرا کو دیکھتے ہی بولا۔

''کھانا بہت اچھا تھا۔ کس نے پکایا تھا؟''

''امی نے......'' خضرا نے مختصر سا جواب دیا۔

''کبھی آپ بھی بنا کر کھلائیے ناں اپنے ہاتھ سے۔'' وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔ خضرا نے سر کو جنبش دی اور برتنوں کی ٹرے اٹھا کر چلنے کا ارادہ کیا۔ وہ تیزی سے لپکا اور اس نے دوسری طرف سے ٹرے پکڑ لی۔

''آپ کہاں چلیں...... آپ نے تو چائے پینی ہے میرے ساتھ۔''

''نہیں...... میں چائے نہیں پیتی۔'' خضرا نے جھوٹ بولا۔

''نہیں پیتیں تو آج پی کر دیکھیں...... پینے لگیں گی۔'' وہ اس کے ہاتھ سے ٹرے لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں...... مجھے دیر ہو جائے گی۔'' خضرا نے عذر پیش کیا۔

''تو کیا ہوا؟...... آپ نے کون سی گاڑی پکڑنی ہے؟'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''امی ناراض ہوں گی۔'' خضرا نے بہانہ بنایا۔

''پرواہ نہ کیجئے...... اتنی اچھی چائے کے لئے تھوڑی سی ڈانٹ بھی پڑ جائے تو حرج نہیں۔'' اس نے شرارت سے کہا اور اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر میز پر رکھی اور ہیٹر کی طرف دوڑا۔ ''اوہو...... آپ نے تو چائے کا ستیاناس کروا دیا۔'' اس نے چائے کی کیتلی کو ہیٹر سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

خضرا اسی طرح ہچکچائی سی کھڑی رہی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بھئی یہ آپ یونہی کھڑی کیا کر رہی ہیں؟ الماری میں چائے کے دو مگ پڑے ہیں، انہیں نکال کر دھوئیں۔''

خضرا کو مجبوراً چائے کے مگ دھونے پڑے۔ اس نے چائے انڈیلی۔ ایک کرسی لا کر میز کے قریب رکھی اور بڑی تعظیم سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''آئیے...... تشریف رکھیے۔''

خضرا کو بیٹھ جانا پڑا۔اس نے دوسری کرسی پر بیٹھ کر ایک مگ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''نوازش ہے آپ کی کہ آپ میرے ساتھ چائے پینے پر آمادہ تو ہوئیں۔ مجبوراً ہی سہی۔اب کوئی بات کیجئے نا۔''

وہ برتن لے کر اوپر آئی تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ ماں کی ناراضگی کے خیال سے من ہی من میں گھبرا بھی رہی تھی لیکن ماں نے خلاف توقع کچھ بھی نہیں کہا۔اس نے صرف اتنا پوچھا کہ وہ اتنی دیر سے کیا کر رہی تھی۔خضرا نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ کرایہ دار نے اسے چائے پینے کے لئے روک لیا تھا۔ ماں نے نہ اعتراض کیا، نہ ڈانٹا۔ بالکل عام سے لہجے میں بولی۔

''اب یہ برتن سنک میں رکھ دے......شام کو ہی دھلیں گے۔''

کرایہ دار اب جیسے گھر کا فرد بن گیا تھا۔اس کا نام تو عمار تھا لیکن ماں اسے ہمیشہ کرایہ دار ہی کہتی تھی۔ وہ کسی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازم تھا اور اکثر سارا سارا دن غائب رہتا تھا۔لیکن جب وہ گھر پر ہوتا تو ماں اسے کھانا وغیرہ ضرور بھیجتی۔ وہ کرایہ دینے یا کسی اور ضرورت سے اوپر بھی آ جاتا۔ خضرا بھی رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہو گئی۔ اب اس کی موجودگی اسے پریشان نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کی شریر باتوں اور ہنستی ہوئی آنکھوں کی عادی سی ہو گئی تھی۔

خضرا کے امتحان شروع ہو گئے تھے۔اس نے بہت محنت کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے اچھے نمبر آئیں۔اسے اب منزل تک پہنچنے کی آس ہو گئی تھی۔اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ اس زندگی سے الگ اپنا رستہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی جس میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سانس لینے پر مجبور تھی۔

ایک دوپہر وہ پرچہ دے کر لوٹی تو اس کی دستک پر عمر دراز نے دروازہ کھولا۔خضرا شپٹا سی گئی۔اس واقعے کے بعد آج اس سے سامنا ہوا تھا۔اس نے جلدی سے اسے سلام کیا اور اس کے برابر سے گزرتی ہوئی زینہ طے کرنے لگی۔عمر دراز بھی دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے ہی اوپر آ گیا۔

خضرا نے اپنے کمرے کا رخ کیا تو اس نے آواز دے کر روک لیا۔خضرا نے نیچی نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھا، ماں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کچھ جھجکتی ہوئی واپس آئی۔

''سنا ہے تمہارے امتحان ہو رہے ہیں......'' اس نے پوچھا۔

''جی......'' خضرا نے مدہم لہجے میں کہا۔

''کیسے پرچے ہو رہے ہیں؟'' اس نے استفسار کیا۔

''جی اچھے ہو رہے ہیں۔'' خضرا نے مختصر سا جواب دیا۔

"پاس تو ہو جاؤ گی ناں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کوشش تو کر رہی ہوں......" خضرا ٹالنے کے انداز میں بولی۔

"تم پاس ہو جاؤ...... ہم تمہیں بہت اچھا تحفہ لے کر دیں گے۔" عمر دراز کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔

"امی کہاں ہیں؟" خضرا نے بات بدلنے کو کہا۔

"ہمسایوں کی طرف گئی ہے۔" عمر دراز نے اطلاع دی۔

خضرا دھک سے رہ گئی۔ وہ جانے کے ارادے سے پلٹی لیکن عمر دراز نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

"بات سنو......" وہ بولا۔

خضرا نے خوفزدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد ملائمت سے بولا۔

"خضرا! تم ناراض ہو مجھ سے؟"

خضرا نے جھجک کر اپنا بازو چھڑایا اور دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے منمنائی۔ "جی نہیں۔"

"میرا خیال ہے تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔" وہ دو تین قدم اس کی طرف بڑھا۔

"نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" خضرا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"تو پھر تم میرے سامنے کیوں نہیں آتیں؟ مجھ سے چھپتی کیوں پھرتی ہو؟ اس روز کے بعد یہ آج کا دن ہے کہ میں نے تمہاری صورت دیکھی ہے۔" وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔

خضرا بوکھلا کر پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے لگ گئی۔ عمر دراز نے اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا......

"بولتی نہیں ہوں، ہیں...... کیوں چھپتی پھرتی ہو مجھ سے...... میں تمہارا کچھ نہیں لگتا؟ بولو۔"

خضرا پوری جان سے لرز گئی۔ اس نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اس کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہا لیکن عمر دراز نے ایک بار میں ہی اسے اپنے لمبے مضبوط بازو میں سمیٹ لیا اور اس کے کان کے ساتھ اپنا ہونٹ لگا کر بولا۔

"ارے...... تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو...... بھلا اس دن والی بات تم نے دل میں کیوں بٹھا لی ہے...... مجھ پر یقین کرو کہ اس روز مجھے مغالطہ ہو گیا تھا، میں نے معافی بھی مانگ لی

ں۔ مگر تم ہو کہ کسی کی غلطی معاف ہی نہیں کر سکتیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ بھولے سے ہوا
ے۔" اس کا انداز مفاہمت اور نرمی کا تھا۔

خضرا خود کو چھڑانے میں روہانسی ہو گئی۔ "پلیز مجھے چھوڑ دیں۔" اس نے گھٹے ہوئے
ے میں کہا۔

"اوہو...... بھئی تم اتنا کیوں گھبرا جاتی ہو...... بھلا میرے تمہارے بیچ کوئی رشتہ نہیں
، کیا؟ بس مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے یا نہیں؟" عمر دراز نے
ے بازو کی گرفت ڈھیلی کر کے اسے چھوڑتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

خضرا نے جان چھڑانے کو جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور وہاں سے ٹل جانا چاہا۔
ن عمر دراز پھر اس کے رستے میں تھا۔

"یہ بھی تو بتاؤ کہ اب تو تم مجھ سے نہیں چھپو گی ناں؟"

خضرا نے سہم کر پھر نفی میں سر ہلایا۔

"اور ہاں...... اپنی ماں سے اس بارے میں کچھ مت کہنا، اچھا...... میرا رشتہ جو سوتیلا
ا۔" اس نے یوں کہا جیسے اسے اس بات کا بہت دکھ ہو۔

خضرا نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ جانا چاہا۔

"میری بات سمجھ گئی ہو ناں تم......؟" اس نے استفسار کیا۔

"جی......" خضرا نے بمشکل کہا اور تقریباً دوڑتے ہوئے اس نے اپنے کمرے میں آ کر
ا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اور اس کے سارے وجود
ف کی ایک دبیز تہہ جمتی جا رہی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن عمر دراز
دموں کی چاپ اسے اب بھی دروازے کے باہر سنائی دے رہی تھی۔ اسے محسوس ہوتا
ے وہ ابھی بند کمرے کے کسی گوشے میں سے نکل کر کسی عفریت کی طرح اس پر چھا
ے گا۔ خوف سے اس کا رواں رواں لرز رہا تھا لیکن وہ اپنے اس خوف کا تذکرہ کسی سے
کر سکتی تھی۔ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں امنڈتے چلے آتے
ہمیشہ کی طرح چپ چاپ رو دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس گھر سے باہر کوئی
ٹھکانہ نہیں تھا اور گھر کی چار دیواری بھی بے امان ہو چلی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے
بند گلی میں گھر گئی ہو...... جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

غیر محفوظ ہونے کا خیال اس کے رگ و پے میں زہر بن کر اتر گیا۔ وہ عمر دراز سے کترانے لگی۔ جب تک وہ گھر میں رہتا، وہ اپنے کمرے میں بند رہتی اور اس کے کان اس کی آہٹوں پر لگے رہتے۔ اس کی آواز اسے خوفزدہ کرتی رہتی۔ وہ اس کی موجودگی میں شدید ضرورت پر بھی باہر نہ نکلتی۔ جب تک وہ گھر سے نہ چلا جاتا، بے چینی اسے کاٹتی رہتی۔

ماں اور اس کے درمیان بے چینی کی دیوار اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھی۔ ماں کی اپنی دلچسپیاں اور اپنے ملنے والے تھے۔ وہ ان میں مصروف اور مگن رہتی۔ اکثر اس کی کوئی نہ کوئی سہیلی اسے ملنے آ جاتی اور وہ اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہتی۔ ایسے میں خضرا اور بھی اکیلی ہو جاتی اور اپنی تنہائیوں کے ساتھ کمرے میں بند گھٹ گھٹ کر جیتی رہتی۔

وہ آخری پرچہ دے کر آئی تو ماں پہلے سے کہیں جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ خضرا کو دیکھتے ہی اس نے جیسے اطمینان کا سانس لیا اور چھوٹتے ہی بولی۔

"کیسا ہوا پرچہ.....؟" اس کا انداز رسمی تھا۔

"اچھا ہو گیا ہے۔" خضرا نے اوپرے دل سے جواب دیا۔

"چلو شکر ہوا کہ یہ پرچوں کی چخ چخ تو ختم ہوئی۔" اس نے لاپرواہی سے کہا اور پرس شانے پر ڈال کر چادر لپیٹتی ہوئی بولی۔

"سن خضرا! کچن میں تیرا کھانا رکھا ہے۔ میں ابھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک آتی ہوں۔ دروازہ بند کر لے۔"

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ زینہ اتر گئی۔ خضرا ساکت سی وہیں کھڑی رہ گئی۔ وہ ماں سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر نہ جائے لیکن ماں کو یہ سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے خوف کا تذکرہ ماں سے کرنا چاہتی تھی۔ اسے بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ ماں اس سے اتنی قریب نہیں تھی کہ اس کی بات سمجھ لیتی۔

یہ اندیشہ اس کے سارے وجود میں اپنے خوفناک پنجے گاڑ رہا تھا کہ اگر عمر دراز گھر آ گیا تو کیا ہو گا؟..... اس کی بھوک اڑ گئی۔ اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے سلاد میں سے ٹماٹر اور کھیرے کے چند قتلے کھائے اور باقی کھانا فریج میں رکھ کر پلٹی تو لمحے بھر کو اس

جان نکل گئی۔ دروازے میں عمر دراز کھڑا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

خضرا بے طرح پریشان ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمر دراز گھر پر ہے۔ وہ عین دروازے میں کھڑا تھا۔ خضرا اس کے برابر سے گزرنے کی بجائے سنک کی طرف چلی گئی تا کہ اس کی نگاہوں کی پہنچ سے نکل جائے اور خود کو برتن دھونے میں مصروف ظاہر کرنے کو اس نے پانی کا نل کھولا۔

عمر دراز نپے تلے قدموں سے اندر آیا اور پانی کا نل بند کرتے ہوئے بڑے رکھ رکھاؤ سے بولا۔

"کیسے ہوئے ہیں تمہارے پرچے؟"

"جی ٹھیک ہی ہو گئے ہیں۔" خضرا نے مستعدی سے جواب دیا اور ہمت کر کے کچن سے باہر نکل جانا چاہا لیکن عمر دراز نے اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر جانے سے روک دیا۔

خضرا کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

عمر دراز نے زوردار جھٹکا دیا۔ "چپ رہو..... کھا نہیں جاؤں گا میں تم کو۔"

خضرا نے خوفزدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری ماں نے تمہیں میرے سامنے آنے سے منع کیا ہے؟" اس نے دانت بھینچ کر پوچھا۔ اس کی انگلیاں خضرا کے بازو میں گڑھی جاتی تھیں۔ خضرا نے سہم کر نفی میں سر کو جنبش دی۔

"تم نے اس بات کا ذکر اپنی ماں سے کیا تھا؟" اس نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔

خضرا نے پھر سر کی اضطراری جنبش میں سہما ہوا انکار کیا۔

"جھوٹ بکتی ہو تم....." عمر دراز نے اسے اتنی سختی سے جھٹکا دیا کہ نازک اندام خضرا ساری کی ساری لچک گئی۔

"نہیں، نہیں..... میں جھوٹ نہیں بولتی۔ میں نے امی کو کچھ نہیں بتایا..... بالکل کچھ نہیں۔" خضرا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"سچ کہہ رہی ہو تم؟" اس نے سختی سے پوچھا۔

"خدا کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں۔" خضرا نے یقین دلانے کو قسم کھائی۔

"تو پھر تم مجھ سے کیوں چھپتی پھرتی ہو؟ تمہاری ماں بھی ہر وقت میری ٹوہ میں لگی رہتی

ہے؟" اس کا انداز باز پرس کا سا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں پتہ...... کچھ نہیں......" خضرا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تو تم نے اپنی ماں سے کچھ نہیں کہا؟" اس نے جیسے اپنے آپ دوہرایا۔

"نہیں...... نہیں...... بالکل نہیں......" خضرا نے یقین دہانی کرانے کو کہا۔

"ٹھیک ہے...... اس سے کچھ مت کہنا......" عمر دراز نے سخت لہجے میں بات کی۔

خضرا نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عمر دراز نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے اور مفاہمت کے انداز میں بولا۔

"دیکھو خضرا! تم ابھی بچی ہو...... تمہیں نہیں پتہ کہ مائیں کس طرح سے اپنی ہی بیٹیوں سے حسد کرنے لگتی ہیں۔ اپنی ہی بیٹیوں کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ تم اپنی ماں کے دل میں شک پیدا نہ کرو۔ پگلی! گھر میں گھر کی طرح سے رہو۔" وہ اپنے مضبوط بازو اس کے گرد لپیٹتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے سہمے ہوئے خوبصورت چہرے کے عین مقابل لے آیا۔ "تم بہت پیاری لڑکی ہو...... میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں...... پھر تم مجھ سے کیوں چھپتی پھرتی ہو...... دیکھو میں بھی اسی گھر کا فرد ہوں۔ اگر تم اس طرح کا رویہ اختیار کرو گی تو تمہاری ماں کے دل میں شک بیٹھ جائے گا۔ یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

خضرا نے لرز کر اپنا چہرہ پیچھے ہٹایا اور اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے تڑپی۔

"چھوڑیں مجھے...... چھوڑیں پلیز...... نہیں تو میں امی کو بتاؤں گی۔" گھبراہٹ میں اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیا کیا......؟" عمر دراز کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا۔ "اچھا...... تم اپنی ماں کو بتاؤ گی۔" اس نے دانت پیسے۔ "میں تمہارا گلا نہیں گھونٹ دوں گا۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے خضرا کی گردن اس طرح دبائی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لئے مچلی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے عمر دراز کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کی۔ عمر دراز نے اس کی گردن چھوڑ دی اور اس کی خوف سے تارہ بنی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"دیکھا، بس اتنی سی دیر لگتی ہے اور زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہے۔" اس نے ہولے سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "لیکن تم تو بہت سمجھدار لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے

کہ تم کوئی ایسی بات نہیں کرو گی کہ مجھے تمہاری زبان اس طرح سے بند کرنی پڑے۔"

خضرا نے غیر ارادی طور پر نفی میں سر کو جنبش دی۔ وہ اس طرح سہم گئی تھی کہ اس میں اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ یوں اس کے روبرو کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم

"زرینہ...... زرینہ......!" زینے پر سے کسی نے پکارا تو عمر دراز چونک گیا۔

"جاؤ جا کر دیکھو، شاید تمہاری ماں کی کوئی ملنے والی آئی ہے۔" عمر دراز نے اسے متوجہ کیا۔ خضرا کو وہ اس وقت فرشتہ رحمت معلوم ہوئی جس نے اسے ان عذاب لمحوں سے نجات دلا دی تھی۔ جو خوف کی ان اکیلی گھڑیوں میں اس کے لئے سہارا بن گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتی تیز قدموں کے ساتھ باورچی خانے سے باہر نکلی اور اصرار کر کے اسے اوپر لے آئی۔

۞......۞

زندگی میں دشواریاں بڑھ گئی تھیں۔ وقت بڑا بے رحم ہو گیا تھا۔ باپ نے نہ پلٹ کر پوچھا تھا نہ اس کے بارے میں کچھ پتہ ہی تھا۔ خرم اس طرح زندگی سے نکل گیا تھا جیسے بھائی کا رشتہ اس کی جھولی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ ماں کے چہرے کی اجنبیت ہر روز دبیز ہوتی چلی جاتی تھی۔ کسی رشتے پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ ہر تعلق کھوکھلا ہو گیا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں سے تحفظ رخصت ہو گیا تھا۔ عمر دراز کی آنکھیں ہر طرف سے گھورتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

امتحانوں کے بعد کی فرصت اور بھی بیزار کن تھی۔ اس کے لئے سکون اور تحفظ کے وہی لمحے تھے جو وہ اس گھر سے دور رہ کر گزارتی تھی۔ بیکار رہنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا۔ اخبار میں ایک اشتہار میں اس نے ٹائپنگ کی کلاسوں کے بارے میں پڑھا تو اسے ایک نئی راہ سوجھی۔ اگر وہ فرصت کے ان لمحات میں یہ کورس کر لے تو اس کے لئے کسی ملازمت کا حصول آسان ہو جائے گا۔ اس طرح وہ جلد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے لئے فیس کی ضرورت تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ماں سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا...... تمہارے انکل سے بات کروں گی۔"

خضرا کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔

''ان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے...... میں تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔''

''بیوقوف......! گھر کے مرد سے بات تو کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر فیس وغیرہ بھی تو اسے ہی دینی ہے۔ مفت میں داخلہ تو نہیں ہو جائے گا۔ تیرے باپ نے تو پلٹ کر نہیں پوچھا۔ ایسا کمینہ شخص ہے۔ اپنی اولاد کو دوسروں کے ٹکڑوں پر چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں دھول مٹی پھانکتا پھرتا ہے۔'' ماں ناپسندیدگی سے بڑبڑائی۔

خضرا ساکت سی ہو گئی۔ اس نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ کیا وہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھی جو وہ اسے باپ کی غفلت کا طعنہ دے رہی تھی؟...... عمر دراز کا احسان جتا رہی تھی۔ اسے اپنا وجود بے حد حقیر معلوم ہونے لگا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ بھیک لینے والے کچھ کہنے کا حق کہاں رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی اور بہت دیر تک اپنے دل کا حال بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنے رخساروں پر لکھتی رہی۔

پچھلے پہر ماں نے پکارا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ کر باہر آئی۔ ٹھٹک کر اس نے آنچل سر پر ڈالا۔ عمر دراز ماں کے قریب کھڑا گھڑی کا اسٹریپ بند کر رہا تھا۔

''خضرا! جلدی سے تیار ہو جا۔ یہ تیرے انکل تجھے تیرے ٹائپنگ سکول میں داخلہ دلوانے لے جا رہے ہیں۔'' ماں اس سے مخاطب ہوئی۔

خضرا ہچکچائی۔ ''میں...... میں استانی جی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

عمر دراز نے ابرو اچکائے۔ ماں نے ناگواری سے کہا۔ ''باتیں نہ بنا...... چل جا کر تیار ہو۔''

''لیکن استانی جی نے وعدہ کیا تھا۔'' خضرا نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ماں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ عمر دراز نے کڑک لہجے میں کہا۔

''زرینہ! یہ تم اپنی بیٹی کو کیا سکھاتی پڑھاتی رہتی ہو جو مجھ سے اتنی خار کھاتی ہے...... جانا نہیں چاہتی یہ میرے ساتھ؟''

''نہیں، نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' ماں پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''یہ شروع سے ہی بہت شرمیلی ہے۔ اپنے باپ سے بھی یہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔''

''اس کا باپ تمہیں بہت یاد آتا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''آپ بھی بات کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ اس کے باپ نے مجھے کون سا سکھ دیا ہے جو میں اسے یاد کروں گی؟'' ماں نے بمشکل بات سنبھالی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... اگر اس کو نہیں جانا تو نہ سہی۔ بعد میں نہ کہنا کہ لڑکی کو داخلہ نہیں دلوایا تھا۔ اچھا میں چلتا ہوں پھر۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے نخوت سے کہا۔

''نہیں، نہیں...... جائے گی کیوں نہیں۔ ابھی دو منٹ میں تیار ہو جاتی ہے۔'' ماں نے جلدی سے کہا اور خضرا کی طرف دیکھ کر سختی سے بولی۔

''سنتی نہیں تُو خضرا...... چل جا کر تیار ہو جا۔''

خضرا مجبور سی ہو گئی۔ بے دلی سے قدم اٹھاتی وہ اندر کمرے میں آئی۔ عمر دراز کے ساتھ جانے کے خیال سے اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا لیکن نہ وہ انکار کر سکتی تھی نہ ماں سے ہی کچھ کہہ سکتی تھی۔

اس نے تیار کیا ہونا تھا۔ بالوں میں برش کر کے اس نے چادر اٹھائی اور پاؤں میں سینڈل پہنتے ہوئے وہ دروازے تک آئی۔ اس کے قدم رک رک جاتے تھے۔ یونہی دروازے کے قریب کھڑی وہ مضطرب سی ہونٹ کاٹتی ہوئی سوچنے لگی کہ اپنی بات ماں تک کس طرح پہنچائے۔

''خضرا...... او خضرا! تیار نہیں ہوئی تُو اب تک۔ کون سے سولہ سنگھار میں لگی ہوئی ہے تُو؟'' دروازے کے باہر ماں کی جھنجلائی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ماں نے دروازہ کھولا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر اپنے دل میں چھپی ساری باتیں اس پر آشکار کر دے۔ لیکن ماں کے چہرے پر ممتا اور اپنائیت کے بجائے غصہ اور خفگی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے خضرا...... وہ کب سے تیرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ کوئی عقل ہے تجھ میں کہ نہیں...... چل جلدی چل۔ دفع ہو مر۔''

خضرا کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ ماں کے چہرے کو اجنبی چہرے میں بدلتے دیکھنا بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ اندر ہی اندر اذیت کے اس زہر کو پیتی باہر آئی تو عمر دراز اسکوٹر کی چابی انگلی میں گھماتے ہوئے اس کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔

''چلو بھئی چلو...... ایک تو تم لوگوں کو تیار ہونے میں گھنٹے لگتے ہیں۔'' وہ اس کی طرف

دیکھ کر بولا اور تیزی سے زینہ اتر گیا۔ خضرا اس کے پیچھے پیچھے مرے ہوئے قدموں سے سر جھکائے یوں چلی جیسے اپنی مقتل گاہ کی طرف چلی جاتی ہو۔

تمام راستہ وہ اسکوٹر پر عمر دراز کے پیچھے اپنے آپ میں ہی سمٹی ہوئی بیٹھی رہی۔ عمر دراز نے ایک جگہ اسکوٹر روکا اور چابی نکالتے ہوئے بولا۔

''تم بہت گھبرائی ہوئی لگتی ہو۔ آؤ پہلے کچھ کھا پی کر اپنے حواس درست کرو۔ پھر انسٹی ٹیوٹ چلتے ہیں۔ وہ یہ نہ سوچیں کہ لڑکی کو کہیں سے اغوا کر کے لایا ہے۔''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔ آپ انسٹی ٹیوٹ ہی چلیں۔'' خضرا نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

''صورت پہ تمہاری بارہ بجے ہوئے ہیں اور تم کہتی ہو کہ ٹھیک ہوں۔ چلو اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اندر چلو۔'' عمر دراز نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ہم قدم کرتے ہوئے کہا۔

علیحدہ کیبن میں ویٹر ان کے سامنے آئس کریم سے بھرے ہوئے کپ رکھ کر چلا گیا تو عمر دراز نے کہا۔

''خضرا! تم میرے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھیں؟''

خضرا نے سہمی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار آنچل سے سر ڈھکتے ہوئے مبہم سے انداز میں کہا۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔''

''تو پھر تم آنے میں پس و پیش کیوں کر رہی تھیں؟'' اس کی گہری نگاہیں خضرا کے خوبصورت چہرے سے مسلسل چھونے لگیں۔

خضرا اس کی نگاہوں سے پریشان ہوتے ہوئے پہلو بدلنے لگی۔ اس کی بات کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ اپنے آنچل کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے بالکل خاموش رہی۔ اس کا سر آپ سے آپ جھکتا چلا گیا۔

عمر دراز نے میز پہ ٹکے ہوئے اس کے چھوٹے سے ملائم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا۔

''دیکھو خضرا...... میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ اس قسم کی حرکتیں نہ کیا کرو جن

سے تمہاری ماں کو شک ہو...... تم مجھ سے اتنا کتراتی ہو کہ تمہاری ماں سوچے گی کہ نہ جانے کیا بات ہے۔ اور یہ خود تمہارے لئے ہی اچھا نہیں۔''

''پلیز چلیں......'' خضرا نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

''احمق...... ابھی سے چلیں؟ اور یہ آئس کریم کون کھائے گا؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' خضرا نے گھبراہٹ اور بے چینی کے لہجے میں کہا۔

''آئس کریم کو دل نہیں چاہ رہا تو کچھ اور منگوا لیتے ہیں۔'' عمر دراز نے فراخدلی سے کہا۔

''نہیں، نہیں...... بس آپ چلیں، پلیز...... میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' خضرا نے اٹھتے ہوئے کرسی دھکیلی۔

''بکواس بند کرو...... خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔'' عمر دراز نے اپنا بازو بڑھا کر اسے زبردستی کرسی پر واپس بٹھا دیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''آرام سے یہ آئس کریم کھاؤ، سمجھیں...... یہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں۔''

خضرا پوری جان سے لرز گئی۔ اس نے سہم کر چمچہ ہاتھ میں لیا اور یوں جلدی جلدی آئس کریم کھانے لگی جیسے جان پر بنی ہو۔ عمر دراز مسلسل اس کی طرف دیکھتا رہا پھر زور سے ہنس پڑا۔

''خضرا تم کتنی جلدی گھبرا جاتی ہو...... آرام سے کھاؤ بھئی یہ آئس کریم۔ میرا مقصد تمہیں ڈرانا نہیں تھا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم یہ آئس کریم کھاؤ۔ کچھ دیر اطمینان سے بیٹھو۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو چار چار کپ آئس کریم کے کھا جاتی ہیں باتوں باتوں میں۔''

خضرا نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ یوں آئس کریم کھاتی رہی جیسے زہر کھا رہی ہو۔ اس کے حلق میں پھندے سے لگ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ پڑنے کو بے تاب تھے۔ خوف اس کے سارے وجود پر جگہ جگہ نقب لگا رہا تھا۔ وہ دبکی ہوئی سی ایک انداز میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

عمر دراز کچھ دیر آئس کریم کھاتا رہا، پھر گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کوئی بات کرو ناں خضرا...... تم تو یوں بیٹھی ہو جیسے گونگی ہو۔''

خضرا اپنا ہونٹ چباتی ہوئی اسی طرح چپ بیٹھی رہی۔

"عجیب لڑکی ہو تم بھی۔" وہ ہنسا۔ "ہوٹل میں اس طرح آنا کوئی انوکھی بات تو نہیں۔ میں تو تمہارے خیال سے یہاں آ گیا تھا۔ تم شروع سے اتنے مشکل حالات میں رہی ہو، تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تمہاری عمر تو ہنسنے بولنے کی ہے۔ لیکن حالات نے تمہیں کتنا سنجیدہ بنا دیا ہے۔" اس کا لہجہ ہمدردانہ ہو گیا۔ خضرا الجھ سی گئی۔ وہ کتنی متضاد باتیں کرتا تھا۔ پل بھر میں شیطان بن جاتا تھا تو دوسرے پل میں ہمدردی کا نقاب اوڑھ لیتا تھا۔ وہ اپنے رویے سے کچھ بھی واضح نہیں ہونے دیتا تھا۔ لیکن اس کی ذات سے وابستہ خوف کبھی اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتا تھا۔ اس کے دم سے اٹھنے والے اندیشے کبھی زائل نہیں ہوتے تھے۔ خضرا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اسی طرح سہمی ہوئی سی سوچوں میں گم بیٹھی رہی۔

عمر دراز نے ویٹر کو بلا کر بل چکایا اور خضرا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی سے اٹھا دیا۔ وہ سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ بڑے غیر محسوس انداز میں عمر دراز نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار کھینچ لیا۔ اس کی آواز بالکل قریب سے سنائی دی۔

"میرا خیال ہے تمہیں یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ اپنی ماں سے کسی بات کا ذکر نہ کرنا۔ ہیں نا۔ تم تو بہت اچھی لڑکی ہو اور سمجھدار بھی۔"

"پلیز...... پلیز......" خضرا نے اس مضبوط حصار کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے منت کی۔ "خدا کے لئے......" خوف کے مارے اس کے ہونٹوں سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"نہیں، نہیں......" اس کے چہرے کو بہت قریب محسوس کر کے خضرا نے سانس روک کر کہا۔

"ہے نا پگلی بالکل ہی......" عمر دراز نے اپنے بازوؤں کا حصار توڑتے ہوئے خضرا کو ہلکے سے جھنجھوڑا۔ "کتنا ڈر جاتی ہو تم۔ بھلا میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بالکل سرسری سے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں تو تمہیں آئس کریم کھلانے آیا تھا کہ ذرا امتحانوں کی بوریت سے نجات مل جائے۔ تم بہت کمزور ہو گئی ہو۔ شاید محنت بہت کی ہے۔ تم پاس ہو جاؤ گی تو تمہیں چائنیز میں لنچ کرائیں گے۔ تم کبھی چائنیز تو نہیں گئی ہو گی۔ ہیں نا۔" اس نے اس طرح پوچھا جیسے اب سے پہلے گزرنے والا لمحہ اسے یاد ہی نہیں تھا۔

خضرا ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ اس کی روح کانپ رہی تھی۔ وہ اسی طرح سُن سی ہو کر کھڑی رہی جیسے اس کی کوئی بات نہیں سنی ہو۔

ٹائپنگ سکول میں داخلہ دلوانے کے بعد وہ گھر آئے تو عمار ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مار نے اٹھ کر خوش اخلاقی سے عمر دراز کے ساتھ ہاتھ ملایا اور خیریت دریافت کرنے لگا۔

"بہت دیر لگا دی آپ نے۔" ماں نے کہا۔

"ہاں راستے میں ایک دوست مل گیا تھا۔ اس کے ساتھ چائے پینے میں دیر ہو گئی۔" ر دراز نے سرسری سا جواب دیا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ ماں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے گئی۔

عمار نے خضرا کو مخاطب کیا۔

"ہو گیا آپ کا داخلہ؟"

"جی......" خضرا نے خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل کہا۔ اس کے ذہن پر ابھی تک زرے لمحوں کا خوف طاری تھا۔ عمار اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

"بہت دنوں سے تم نظر نہیں آئیں۔ کیا بات ہے؟ ناراضگی ہے کوئی......؟" اس کی خ آنکھیں خضرا کے چہرے پر مرکوز ہوئیں۔

"امتحان ہو رہے تھے۔" خضرا نے اُکھڑا ہوا سا جواب دیا۔

"تو اب تو امتحان ہو گئے ہیں...... کبھی نیچے ہی آ جایا کرو۔ میں انتظار کرتا رہتا ہوں۔ ب بھی سیڑھیوں پر کوئی آہٹ ہوتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ شاید تم ہو۔ لیکن جب تم ں ہوتیں تو کچھ مت پوچھو کہ کتنی مایوسی ہوتی ہے...... تم نے میری عادتیں خراب کر دی ۔" وہ مدہم لہجوں میں نئے جذبوں کو سمونے لگا۔ خضرا کے دل میں کوئی احساس نہیں گا۔ اس کے من میں کسی تمنا نے آنکھ نہیں کھولی۔ وہ جذبوں سے عاری چہرہ لئے اس کے ل کھڑی رہی۔ عمار نے ایک اور شیریں سرگوشی کی۔

"کل شام آؤ تو تمہارے امتحان ختم ہونے کی خوشی میں اچھی سی چائے پئیں......" اور لفظ اس کے منہ میں ہی رہے اور عمر دراز کی بلند آواز اور تلخ لہجے نے اسے خاموش کر

"تم نے اسے اتنا سر پر کیوں چڑھا لیا ہے...... جب دیکھو منہ اٹھائے اوپر چلا آتا ۔ کرایہ دار ہے وہ۔ اس سے کہو کہ اپنی جگہ پر رہے۔"

"آہستہ بات کریں...... وہ سنے گا تو کیا کہے گا کہ کیسے لوگ ہیں۔" ماں نے دبی زبان

میں اسے خاموش کروانے کی کوشش کی۔

''سنتا ہے تو سن لے۔ کرایہ دار ہے ہمارا...... میں اس کا سامان اٹھا کر باہر بھی پھینک سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بدمعاش یہاں کے چکر کیوں لگاتا ہے، کہاں نظر ہے اس کی۔ یہ تمہاری ہی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہوئی ہو۔'' عمر دراز کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

عمار کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ خضرا ندامت میں ڈوب گئی۔ عمر دراز کی آواز ہر لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''آئندہ میں اسے یہاں نہ دیکھوں۔ نہ ہی خضرا کو نیچے بھیجا کرو۔ جوان لڑکی کی ماں ہو، تمہیں کچھ احساس ہے یا نہیں۔ ذمہ داری تو اس کی مجھ پر ہے نا۔''

عمار نے ہونٹ چباتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور ایک قدم یوں اس طرف بڑھا جیسے عمر دراز کو اس کے لفظ لوٹانا چاہتا ہو۔ پھر اس نے سر جھکائے کھڑی خضرا کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے لیکن پھر سر جھٹک کر اس کے برابر سے گزرتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔

عمر دراز کی مشتعل آواز دروازے کی طرف بڑھی۔ ''تم رہنے دو اپنی یہ من من...... میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ......'' وہ غصے میں بکتا جھکتا شاید اسی طرف آ رہا تھا۔

اس کی آواز کو قریب آتے سن کر وہ بدحواسی میں تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی اور دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر ڈھے گئی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے کے باہر آوازوں کا لاوا بہہ رہا تھا۔ عمر دراز نہ جانے کیا کہہ رہا تھا اور ماں اسے روک رہی تھی۔ خضرا کانوں میں انگلیاں دیئے تکیے میں منہ چھپائے دبکی پڑی تھی۔ بچپن کی سلگتی یادیں اسے کچوکے دے رہی تھیں۔ وہی لمحے، وہی آوازیں، وہی تلخیاں لوٹ آئی تھیں۔ نہ معلوم کب تک باہر وہی وقت ٹھہرا رہا جو اس کی رگوں میں خوف بن کر بہتا تھا اور وہ اسی خوف میں ڈوبتی ابھرتی نہ جانے کب ایک بے چین نیند کے گلے لگ گئی۔

☼......☼

عمار نے چند ہی دنوں میں مکان خالی کر دیا۔ خضرا سے نہ اس کی بات ہوئی نہ سامنا۔ ے تو یہ بھی ماں سے پتہ چلا کہ وہ گھر چھوڑ گیا ہے۔ اس کے دل میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ ہے عمار کے رویے پر تعجب نہیں ہوا۔ وجل بھی تو اس کی زندگی سے اسی طرح علیحدہ ہو گیا ا، کوئی لفظ کہے بغیر، کوئی وجہ بتائے بغیر، کوئی جواز پیش کئے بغیر، کوئی وعدہ کئے بغیر، کوئی اس، کوئی امید دلائے بغیر۔ اس نے بے حسی سے ماں کی بات سنی اور اپنے چہرے سے سی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

ماں نے بے نیازی سے کہا۔ ''چلو خلاصی ہوئی، جان چھوٹی، ڈیڑھ ہزار تو کل اس کی نخواہ تھی اور سارا دن جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔ اگر تمہارے انکل اس سے نہ کہتے تو میں پ ہی اس سے مکان خالی کرنے کے لئے کہنے والی تھی۔

خضرا نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے اس کی حیرت میں ابھرتے ہوئے وال کو پڑھ لیا اور جہاندیدہ لہجے میں بولی۔

''تو بچی ہے ناں ابھی...... تجھے ان باتوں کی سمجھ نہیں۔ پر میں تیرے بھلے کی ہی سوچتی ں۔''

خضرا اس کی بات کچھ سمجھی کچھ نہیں۔ وہ ان باتوں کو سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی جو اس کے ل میں گرہ لگا دیتی تھیں۔ جو ماں کے رشتے پر دھند کی تہہ جما دیتی تھیں۔ جو اس کے دل ں شبہات کو ہوا دیتی تھیں۔ جس پر وہ اعتبار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کچے اور ناپائیدار شتوں کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ بھیک کے ٹکڑوں کو اپنی زندگی سے نکال پھینکنا چاہتی تھی۔ اسے آگے بڑھنے کی ایک راہ نظر آ گئی تھی۔ وہ بڑی محنت سے ٹپنگ سیکھ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس کورس کو مکمل کر لینا چاہتی تھی جو اسے نجات دلا سکتا ا۔ جو اس کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے سر کو سبک بار کر سکتا تھا۔ جس نے اس ے دل میں پلنے والی موہوم امیدوں کو واضح اور روشن کر دیا تھا۔

عمر دراز کسی ذاتی کام سے کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی گھر میں م موجودگی سے خضرا کو کچھ آزادی، کچھ رہائی کا احساس ہوا تھا ورنہ تو اس کی موجودگی میں ارا وقت اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں ہی گزر جاتا تھا۔ وہ اس سے چھپتی پھرتی تھی ر اس کی تیز آنکھیں اس کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتی رہتی تھیں۔

ایک روز خضرا انسٹی ٹیوٹ سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک موٹر بائیک تیز آواز کے ساتھ بالکل فٹ پاتھ کے ساتھ آ کر رکا۔ خضرا نے غیر ارادی طور پر دیکھا۔

''ہیلو......'' عمار نے سیاہ چشمہ اتارتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔

خضرا کو خوشگوار سی حیرت ہوئی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور عام سے لہجے میں اس کی گرم جوشی کا جواب دیا۔ ''ہیلو۔''

''میرا خیال ہے تم ناراض ہو مجھ سے۔ تمہیں بتائے بغیر جو چلا آیا تھا۔'' وہ کچھ نادم لہجے میں بولا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' خضرا سرسری لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

''خضرا ٹھہرو......'' وہ اس کے پیچھے لپکا۔

''نہیں...... راستے میں کھڑا ہونا برا لگتا ہے۔'' خضرا نے عذر پیش کیا۔

''پلیز...... تم میرے ساتھ چلو۔ مجھے بہت ساری باتیں کرنی ہیں تم سے۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''نہیں، نہیں...... مجھے گھر پہنچنا ہے۔'' خضرا نے صاف انکار کر دیا۔

''بس تھوڑی سی دیر...... صرف پندرہ بیس منٹ میرے ساتھ چلو...... میں تمہیں گھر کے اسٹاپ پر اتار دوں گا۔ اب اتنی دیر تو تمہیں بس کا انتظار کرنے میں بھی لگ جائے گی۔ خضرا! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں...... بہت ضروری۔'' وہ بار بار اصرار کرنے لگا۔

خضرا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ماننی پڑی۔

وہ اسے لے کر اس جگہ پہنچا جہاں وہ آج کل رہ رہا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں اس کا سامان اب تک بکھرا پڑا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی یہاں آ کر اترا ہے۔ عمار نے جلدی جلدی ایک کرسی کو کتابوں، رسالوں اور الم غلم اشیاء سے خالی کیا اور خضرا کو بیٹھنے کے لئے پیش کرتا ہوا بولا۔

''خضرا! آج تم یہاں آئی ہو تو مجھے یہ بے سرو سامان کمرہ بھی گھر لگنے لگا ہے۔ اس کے در و دیوار تمہیں جانتے ہیں...... میں نے ان کے ساتھ تمہاری بہت ساری باتیں کی ہیں۔''

خضرا بے اعتباری سے چپ بیٹھی رہی۔

عمار نے اٹھ کر ہیٹر آن کیا۔ ''ٹھہرو...... پہلے میں تمہارے لئے چائے بنا لوں، پھر ت کرتے ہیں۔''

''نہیں...... رہنے دیجئے...... دیر ہو جائے گی۔'' خضرا نے اکھڑے ہوئے لہجے میں ہا۔

''دیر کیا ہونی ہے...... ابھی بن جاتی ہے۔'' عمار نے چٹکی بجائی۔

واقعی اس نے بہت جلد چائے کی دو پیالیاں بنا لیں۔ ایک پیالی خضرا کو تھماتا ہوا بولا۔

''یہ چائے تو شاید اچھی نہیں بنی لیکن ہم جس لمحے میں اسے پی رہے ہیں یہ بہت اچھی ے گی۔'' وہ دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

خضرا خاموشی سے چائے پینے لگی۔ اس نے نہ کچھ کہا نہ اس کی ضرورت ہی محسوس کی۔ ھی چند لمحے خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا، پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

''خضرا! میں اس روز اپنی توہین برداشت نہیں کر سکا تھا۔ مجھے تم سے ملے بغیر اس ح نہیں آنا چاہئے تھا لیکن کوئی ایسا موقع ہی نہیں تھا کہ میں چند منٹوں کے لئے بھی تم مل سکتا۔ تمہارے والدین میری نگرانی کرنے لگے تھے۔ میرا خیال ہے تمہارا بھی خیال ر ہے ہوں گے۔ میں تمہارے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر تمہارے انکل کچھ ذریعوں سے مجھ پر دباؤ ڈلوایا، اسی لئے مجھے وہ گھر جلدی میں چھوڑنا پڑا۔ میں اپنا مان تو اٹھا لایا تھا لیکن میری سوچ، میرے تصورات، میرے سارے جذبے وہیں پر رہ تھے۔ میں بہت دنوں سے تمہیں تلاش کر رہا تھا کہ تم سے پوچھوں کہ تم نے ان رات، ان جذبوں میں سے کسی کو پہچانا؟ کوئی تمہارے من میں بھی اترا؟''

اس کی گہری نگاہوں نے خضرا کے گلاب رخساروں کو تمتما دیا لیکن اس کے خوبصورت وں، اس کے والہانہ جذبوں پر اسے بالکل اعتبار نہیں آیا۔ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ اور لمحاتی۔ نہ جذبوں کو قرار تھا نہ رشتوں کو ثبات نہ محبت میں کوئی سچ تھا نہ کسی تعلق میں پائیداری۔ کسی رشتے، کسی جذبے نے اسے اعتبار نہیں دیا تھا تو وہ جذبوں کا یہ نیا ل کس طرح باندھ لیتی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی چائے پیتی رہی۔ تاثرات سے عاری ے کے ساتھ۔

عمار چند لمحے اس کے دلنشین چہرے پر اپنے سوال کا جواب تلاش کرتا رہا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"خضرا...... شاید تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔"

"میرے برا یا اچھے لگنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" خضرا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اہمیت کیوں نہیں ہے...... تمہیں کیا معلوم کہ اس کی میرے نزدیک کتنی اہمیت ہے۔
وہ زوردار لہجے میں بولا۔

"جو حالات کے ہاتھ میں کھلونا ہو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔" خضرا نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا اور مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے...... پلیز آپ مجھے چھوڑ آئیں۔"

عمار بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔

"خضرا!! ابھی سے اتنی جلدی تمہیں دیر ہوگئی ہے؟"

"بس، پلیز چلئے۔" خضرا نے بے چینی سے کہا۔

"خضرا! کتنی جلدی یہ طلسم ٹوٹ گیا ہے، کسی سہانے خواب کی طرح۔" وہ والہانہ نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہوا بولا۔

خضرا نے پہلو بدلا اور چند قدم دروازے کی طرف چلی۔ عمار نے اس کی پھولدار چادر کا ایک کونہ انگلیوں میں دبا لیا۔ خضرا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے اپنی چادر کو ہلکے سے کھینچا...... عمار نے پلو نہیں چھوڑا اور امنڈتی ہوئی تمناؤں کے بیتاب لہجے میں بولا۔

"خضرا...... مجھے یہ امید تو دے جاؤ کہ ہم ملتے رہیں گے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" خضرا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی ننھا سا، خوبصورت وعدہ تو میرے پاس چھوڑ جاؤ...... میری تنہائیاں آباد ہو جائیں گی۔" اس نے رسان سے کہا۔

خضرا کی دھڑکنوں میں یکبارگی ایک نغمہ سا جاگا لیکن اس نے من کی گنگناہٹ پر کان نہیں دھرا اور ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے چادر کا پلو چھڑاتی ہوئی بولی۔

"بس اب مجھے چھوڑ آیئے...... پلیز۔"

عمار نے اس کا پلو چھوڑ دیا، میز پر سے موٹر بائیک کی چابی اٹھائی، خضرا کے قریب آیا اور اس کی فراخ پیشانی پر سے بالوں کی ایک گھنگھریالی لٹ انگلی سے سنوارتا ہوا بولا۔

"خضرا...... میں اور میرا یہ کمرہ تمہیں بہت یاد کریں گے۔ کبھی کبھی آجایا کرنا۔"

عمار نے اسے بس اسٹاپ سے کچھ ہی دور اتار دیا۔ خضرا نے گھڑی دیکھی۔ اسے معمول سے کچھ زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی اور تیز قدموں سے گھر پہنچی۔ زینے کی آخری سیڑھی پر وہ قدرے ٹھٹک گئی، عمر دراز برآمدے میں کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ تو گویا وہ سفر سے واپس آگیا تھا۔ خضرا نے سلام کر کے آگے بڑھنا چاہا لیکن عمر دراز کی آواز نے اسے روک لیا۔

"خضرا......" اس کی آواز معمول سے زیادہ بلند تھی۔ "یہاں آؤ۔" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

خضرا گھبرا کر مڑی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ بمشکل چند قدم آگے بڑھی۔

"کہاں سے آرہی ہو؟" اس نے دبنگ لہجے میں پوچھا۔

خضرا کا رنگ فق ہوگیا۔

"سکول سے......" اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔

"سکول میں تو ایک بجے چھٹی ہوتی ہے اور اس وقت ڈھائی بجے ہوئے ہیں۔ بتاؤ کہاں تھیں تم؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے غرایا۔

"بس خراب ہوگئی تھی۔" خضرا نے ڈرتے ڈرتے بہانہ بنایا۔

"بکومت...... سچ سچ بتاؤ کہاں تھیں تم؟" وہ شدید طیش میں دانت پیس کر آگے بڑھا اور اس کے بال پکڑ کر دھاڑا۔ "بولو...... کہاں گئی تھیں تم؟"

خضرا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ تکلیف سے آنکھیں میچتے ہوئے اس نے بال چھڑانے کی کوشش کی۔

"امی...... امی......" وہ خوفزدہ ہو کر چلائی۔

ماں دوڑ کر باورچی خانے سے باہر نکلی اور گھبرائے ہوئے خفگی سے بولی۔

’’آخر ایسی کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے کہ آپ لڑکی کو ہلکان کر رہے ہیں؟‘‘

’’ہٹ جاؤ تم پیچھے...... مجھے اس سے بات کر لینے دو۔‘‘ عمر دراز نے ماں کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور خضرا کے بال کھسوٹتا ہوا خونخوار لہجے میں بولا۔

’’بکتی کیوں نہیں اُلو کی پٹھی کہ کس سے مل کر آ رہی ہو...... بولو، جواب دو میری بات کا۔‘‘

ماں پھر بیچ میں آ گئی اور پوری قوت کے ساتھ عمر دراز کو دھکیلتی ہوئی غصے سے چلائی۔

’’چھوڑیں...... چھوڑیں...... آپ تو لڑکی کی جان نکال دیں گے۔ میں خود اس سے بات کر لوں گی۔ میں خود پوچھ لوں گی اس سے۔ آپ چھوڑیں تو سہی۔‘‘

عمر دراز نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ کر اسے دھکا دیا۔

’’پوچھو اس سے کہ یہ اس لفنگے کرایہ دار کے ساتھ کہاں رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ اس کے موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کب سے اس نے یہ آوارہ گردیاں شروع کی ہوئی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو بدنام ہم ہوں گے۔‘‘ وہ شدید غصے میں چلایا۔

’’بس...... اب محلے بھر کو تو نہ سنائیں۔ ہو گئی غلطی۔ آئندہ نہیں کرے گی۔ آپ بیٹھیں آرام سے۔‘‘ ماں نے پھر اسے ٹوکا اور لڑکھڑاتی ہوئی خضرا کا بازو پکڑ کر اسے اندر کمرے کی جانب لے چلی۔

’’سمجھا دو اسے اچھی طرح سے کہ اگر آئندہ میں نے اسے اس بدمعاش کے ساتھ دیکھ لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔‘‘ اس کی غصے میں بھری آواز ان کے پیچھے پیچھے آئی۔

خوف اور توہین کے احساس سے لرزتی خضرا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ماں نے ملامت آمیز لہجے میں آہستگی سے کہا۔

’’خضرا...... یہ تُو نے کیا، کیا...... تُو کب سے کرایہ دار کے ساتھ مل رہی ہے؟‘‘

خضرا کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ اس کی اپنی ماں ہی اس پر الزام لگا رہی تھی۔ بغیر اس سے پوچھے، بغیر اسے صفائی کا موقع دیئے۔ اس کا دل اندر ہی اندر کٹنے لگا۔ شدید ملال کی کیفیت میں اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود آنسو بہاتی رہی۔ ماں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

’’چل بس اب چپ ہو جا...... تیرے انکل تیرے بھلے کے لئے ہی کہتے ہیں۔ تُو ابھی

ی ہے، تجھے ان باتوں کی کیا خبر...... آئندہ تُو سیدھی گھر آیا کر، اب نہ ملنا اس سے
پھا!...... تمہارے انکل نے دیکھ لیا تو بری بات ہو گی۔ تیرا باپ کسی قابل ہوتا تو کسی
سرے کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن وہ ایسا بے غیرت ہے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ اب
دکھلاتا ہے، جو خرچہ اٹھاتا ہے اس کی ماننی بھی پڑتی ہے۔‘‘

ماں کے ہاتھوں کے لمس نے خضرا کو بیتاب سا کر دیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے
ی۔ ماں نے ایک عرصے بعد اسے ممتا کے دلار کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔

’’بس کر بیٹی!...... یہ سوتیلے رشتے بھی تو اپنوں کے دیئے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے
ر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ تیرے باپ کی کوتاہیاں بھگتنے کو ہم رہ گئے ہیں۔ بس اب چپ ہو
، شاباش......‘‘ ماں نے اس کے آنسو پونچھے۔ ’’تُو اپنے کام سے کام رکھ، اس کا خیال
ں سے نکال دے۔ ابھی تیری عمر بہت کم ہے۔ تُو ان معاملوں سے دور رہ کر صرف اپنی
ھائی میں دھیان لگا۔‘‘ ماں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے سمجھانے
ی۔

خضرا کے دل میں ہزاروں باتیں کھولنے لگیں۔ وہ اس کے جواب میں بہت کچھ کہنا
ہتی تھی۔ وہ اس توہین کے جواب میں عمر دراز کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھا دینا چاہتی
ی لیکن اسے کچھ بھی کہنے کا ڈھنگ نہیں آیا۔ وہ یہ سوچتی اور ہچکچاتی رہ گئی کہ بات کو کس
رح اور کہاں سے شروع کرے...... کون سے لفظ استعمال کرے اور اپنی سچائی کے حق میں
ون سی دلیل دے۔

دوسرے تیسرے روز وہ گھر آئی تو ماں اسے سیڑھیوں کے درمیان ہی مل گئی۔ اس نے
رہ لباس پہن رکھا تھا اور پرفیوم سے سارا زینہ مہک رہا تھا۔ وہ خضرا کو دیکھتے ہی بولی۔

’’خضرا! میں ذرا ایک ملنے والی کی طرف جا رہی ہوں۔ تمہارے انکل گوجرانوالہ گئے
ئے ہیں، شام تک ہی لوٹیں گے۔ میں تب تک واپس آ جاؤں گی...... تُو فکر نہ کرنا......
ں کر کھانا کھا لے۔‘‘

خضرا دھک سے رہ گئی۔ عمر دراز کے ہیولے چاروں طرف سے اس کی طرف لپکنے
لے۔ اس نے سہم کر ماں کو روک لینا چاہا لیکن وہ دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ خضرا نے
وازہ بند کیا اور الجھی الجھی سی اوپر آئی۔ کھانا کھانے کو بھی اس کا جی نہیں چاہا۔ اگرچہ ماں

بتا گئی تھی کہ عمر دراز شام کو لوٹے گا مگر اسے پل پل کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ایک ایک لمحہ بار ہو گیا تھا اور وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ ماں کو گئے بھی دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے تھے اور اس کا ایک ایک لمحہ کانٹوں پر گزر رہا تھا۔

خدا خدا کر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی جان میں جان آئی۔ یقیناً ماں واپس آ گئی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی اور اس نے دروازہ کھولا۔ اس کی روح لرز گئی۔ عمر دراز اس کے مقابل تھا...... وہ بغیر کچھ کہے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ وہ بھی اتنی ہی تیزی سے اس کے پیچھے آیا اور اپنا بیگ میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تمہاری ماں کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کسی سہیلی کی طرف گئی ہے۔'' خضرا نے سرسری سا جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

''بات سنو خضرا......'' عمر دراز نے پکارا۔

خضرا نے پلٹ کر دیکھا۔

''خضرا......تم ناراض ہو مجھ سے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''جی نہیں۔'' خضرا نے سہمے ہوئے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہا۔

وہ دو ہی قدموں میں قریب آ گیا اور بردباری سے بولا۔

''خضرا مجھے افسوس ہے، اس روز تمہارے ساتھ زیادتی ہو گئی تھی۔ غلطی تو تمہاری تھی لیکن مجھے اتنا سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

خضرا گم سم سی کھڑی رہی۔ وہ سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ وہ اب بھی اس سے مخاطب تھا۔

''اس روز پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا...... کیوں اتنا غصہ آ گیا تھا مجھے۔ بعد میں مجھے بہت افسوس ہوا لیکن موقع نہیں ملا کہ تم سے معذرت کر سکتا۔''

خضرا سر جھکائے یوں کھڑی رہی جیسے اس کی بات ختم ہوتے ہی بھاگ اٹھے گی۔ عمر دراز نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔''

خضرا یوں پیچھے ہٹی جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ کھول کر کمرے میں گھس جانا چاہا لیکن عمر دراز نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور نسبتاً درشت لہجے میں بولا۔

''اب تو تم اس بدمعاش سے نہیں ملتیں؟''

خضرا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ عمر دراز نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

''بس اب اس سے بالکل مت ملنا۔ ورنہ میرے ہاتھوں اس الو کے پٹھے کا خون ہو جائے گا اور اس کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔'' وہ اس کا سر ہلا کر بولا۔

خضرا نے نفرت سے اس کے ہاتھ جھٹکے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے تو تمہارے لئے پتہ نہیں کیا کچھ سوچا ہے، وہ دو ٹکے کا آدمی تمہارے قابل نہیں۔ بس تم ہر وقت خوش خوش رہا کرو۔ یہ کیا ہر وقت رونی صورت بنائے رہتی ہو؟...... ہنسا بولا کرو۔ کوئی بات کیا کرو۔ ہر وقت اس کوٹھڑی میں گھسی رہتی ہو۔ تمہارا دل نہیں گھبراتا؟'' وہ اس کے گلابی رخسار کو انگلی سے چھوتا ہوا بڑی ملائمت سے کہنے لگا۔

خضرا نے بے حد ناپسندیدگی سے پھر اس کے ہاتھ جھٹکے اور ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھے جانے دیں۔''

''کہاں جانے دوں؟'' وہ جھک کر اپنا چہرہ اس کے برابر لے آیا۔

خضرا کی خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ماں ابھی تک نہیں لوٹی تھی اور عمر دراز کی آنکھوں میں سہا دینے والی غلیظ چمک بڑھتی جا رہی تھی جو اس کے سارے وجود میں کپکپی سی بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ اس کے گداز رخسار پر ہلکی سی چٹکی لے کر پوچھ رہا تھا۔

''کہاں جانے دوں تمہیں...... بولو، بتاؤ۔''

خضرا نے اس کا ہاتھ نفرت سے پرے ہٹایا اور قدرے درشت لہجے میں بولی۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

''اگر میں وہاں بھی آ جاؤں تو پھر......؟'' اس نے خبیث ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

خضرا نے گھبرا کر عجلت میں کہا۔ ''پلیز......نہیں......'' اور اس میں نہ جانے اتنی ہمت

کہاں سے آگئی کہ پوری قوت سے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ کمرے میں گھس گئی اور ہانپتے ہوئے بدحواسی میں دروازہ بند کر کے کنڈی لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

عمر دراز نے دوسری طرف سے کواڑ دھکیلا، کنڈی اٹکنے کے بجائے کواڑ آدھا کھل گیا۔

خضرا خوفزدہ ہو کر دروازہ بند کرنے کی کوشش میں نڈھال ہو گئی۔ عمر دراز نے اپنی ٹانگ دونوں کواڑوں کے بیچ رکھ دی اور پٹ کو دھکا دیا تو خضرا زور سے لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور ہسٹریائی انداز میں زور سے چیخی۔

''چلے جائیں...... چلے جائیں...... آپ چلے جائیں یہاں سے...... دفع ہو جائیں...... میرے قریب نہ آئیں...... چلے جائیں۔''

عمر دراز تیزی سے اس کی طرف لپکا اور پوری قوت سے اسے جھنجھوڑ کر بولا۔

''ہوش میں آؤ خضرا...... یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟...... ہوش میں آؤ بیوقوف۔''

خضرا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ نوچ لیا اور اس کی دیوانگی بڑھ گئی۔

''چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو کمینے...... ذلیل...... میں تم سے نفرت کرتی ہوں، تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں تم نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے...... دفع ہو جاؤ ذلیل آدمی...... دفع ہو جاؤ...... مجھے ہاتھ نہ لگانا۔''

''بند کرو یہ بکواس۔'' عمر دراز نے غرا کر گالی بکی اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پے در پے کئی تھپڑ اس طرح لگائے کہ خضرا کا منہ پھر گیا۔ ''اگر تم نے آواز نکالی تو مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دوں گا۔'' اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

خضرا چکرا کر رہ گئی۔ اب کچھ دیر پہلے کی جرأت کافور ہو گئی۔ خوف کی شدت سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک عمر دراز کی مضبوط گرفت میں اس طرح بندھے ہوئے تھے جیسے وہ قیدی ہو۔ اس کی سرخ آنکھیں اسے بری طرح سے گھور رہی تھیں۔ اس کے سر پر خون سوار نظر آتا تھا۔ خضرا پوری جان سے کانپ گئی۔ اس میں اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ اسے اپنی سسکیوں پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

عمر دراز نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دینے والے انداز

میں بولا۔

''پگلی نہ ہو تو کہیں کی...... مجھے سختی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ابھی تک مجھے سمجھی ہی نہیں۔ یقین کرو میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم تو ایسی دیوانی ہو گئی تھیں کہ سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا بیوقوف۔ اپنے حواسوں میں رہا کرو۔ چلو چپ ہو جاؤ شاباش! تمہاری ماں آئے گی تو کیا کہے گی۔ شاباش، شاباش چپ ہو جاؤ بالکل...... اب مت رونا۔''

خضرا اپنے آنچل سے آنسو پونچھتی اس سے دور ہٹ گئی۔

''اچھا اب یہ سب کچھ اپنی ماں سے نہ کہنے بیٹھ جانا ورنہ تم تو جانتی ہی ہو۔'' اس نے دانت بھینچ کر باقی بات کہی۔ پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''چلو چل کر منہ ہاتھ دھو لو اور مجھے چائے کی ایک پیالی بنا کر دو...... جلدی کرو۔''

خضرا نے اپنے آنسو پونچھے اور کسی معمول کی طرح غسل خانے میں گھس گئی۔

✿......✿

راستے میں ایک بار پھر عمار سے سامنا ہو گیا۔ وہ بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ اس نے بالکل قریب آ کر موٹر سائیکل روکی۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور اس کے گھنگھریالے بال پھول کر ٹوکرا سا بنے ہوئے تھے۔ اس نے خوش مزاجی سے 'ہیلو' کیا اور سیاہ چشمہ اتار کر چمکیلی بھوری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے اسے اپنے پیچھے بیٹھنے کے لئے کہا۔

خضرا گھبرا سی گئی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے گرد و پیش دیکھا اور اس کے قریب جا کر عجلت میں بولی۔

''پلیز آپ جائیں...... میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔''

''ارے یہ دو دن میں کیا انقلاب آ گیا ہے...... آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟'' وہ موٹر سائیکل سے اتر آیا۔

خضرا نے پھر دزدیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور جان چھڑانے کے انداز میں بولی۔ ''کوئی بات نہیں...... بس آپ جائیں۔''

''کوئی بات تو ضرور ہے۔ بھئی مجھے بتاؤ تو سہی۔ ورنہ میرا سارا دن اسی الجھن کی نذر

ہو جائے گا۔'' اس نے اصرار کیا۔

اب بس سٹاپ پر کھڑے ہوئے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہونے لگے۔ خضرا کو عمر دراز کا خوف بھی دامن گیر تھا۔ اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے...... بس آپ جائیں۔''

''اس طرح تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا...... ہاں تم جتنی جلدی بتا دو گی اتنی جلدی چلا جاؤں گا بلکہ فوراً چلا جاؤں گا۔'' وہ قطعی لہجے میں کہنے لگا۔

خضرا کو جان چھڑانے کے لئے بتانا پڑا۔

''اس روز انکل نے دیکھ لیا تھا۔ بہت ناراض ہوئے تھے۔ انہوں نے آئندہ کے لئے منع کر دیا ہے۔''

''انکل کی ایسی کی تیسی۔'' اس نے دانت پیسے۔ ''انہیں کیا حق ہے تمہیں منع کرنے کا۔ کچھ کہنا ہے تو تمہاری امی کہیں۔ ان کا کیا مطلب ہے تم پر ناراض ہونے کا۔ میرا خیال ہے میں تمہاری امی سے خود آ کر بات کروں۔''

''نہیں، نہیں...... پلیز...... اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس آپ جائیں۔'' خضرا نے تیزی سے کہا اور اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر پیچھے سے آتی ہوئی بس کی طرف بڑھ گئی۔

○......○

وہ گھر پہنچی تو فضا غیر معمولی تھی۔ گھر کی آرائش میں نئی زیبائش نمایاں تھی۔ ڈرائنگ ام کی ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ صوفوں پر نئے کشن رکھے تھے اور گلدانوں میں تازہ پھول جے تھے۔ باورچی خانے سے ایسی لذیذ خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں جیسے کوئی بڑا اہتمام ہو رہا ۔ خضرا کو حیرت ہوئی۔

ماں نے شاید اس کی آہٹ سن لی تھی۔ وہ باورچی خانے میں سے ہی پکاری۔

''خضرا...... خضرا، آ گئی ہے تُو...... یہاں آؤ۔''

خضرا نے باورچی خانے میں جھانکا۔

''شکر ہے تُو آ گئی ہے...... میں تو کام کر کر کے تھک گئی ہوں۔ تیرے انکل نے کسی ں دعوت کی ہے۔ تُو کھانا وغیرہ کھا کر ذرا میرا ہاتھ بٹا دے۔ ابھی بھی بہت سارا کام پڑا ہے۔'' ماں نے ایک ہی سانس میں تمام تفصیل سمجھاتے ہوئے کہا۔

خضرا بے انتہا بیزار ہوئی۔ اسے نہ انکل سے دلچسپی تھی نہ اس کے مہمانوں سے۔ وہ تو ی تھکی ہوئی آئی تھی۔ عمار سے بے رخی برتتے پر وہ ذہنی طور پر پریشان اور الجھی ہوئی ی۔ عمار کی ہلکی پھلکی باتیں، دلچسپ شوخیاں۔ سہانا التفات اور رنگین توجہ...... سبھی کچھ دگی کی بے رنگی، محرومی اور اکتاہٹ میں کچھ دیر کے لئے تھوڑی سی کمی کر دیتے تھے۔ وہ ہ میں مل گیا تھا تو چند لمحے اس کی صحبت میں بیٹھنے کی ننھی منی بے ضرر سی آرزو دل کے ردکوں میں جھانکنے لگی تھی۔ لیکن عمر دراز کے خوف نے اس پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔ ں کی دل میں ہی رہ جانے سے اس کے من میں کڑواہٹ سی بھر گئی تھی۔ وہ کچھ بھی رنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ لیکن ماں نے آتے ہی اس پر ظاہر کر دیا تھا کہ اسے ارے ان چاہے کام کرنے پڑیں گے۔

اس نے کھانا بھی بے دلی سے کھایا اور ماں کے ساتھ رات کی دعوت کی تیاریوں

میں مصروف ہو گئی۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے پہلے تقریباً تمام کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ ابھی باورچی خانے میں ہی تھی کہ عمر دراز پھلوں سے بھرے ہوئے لفافے اٹھائے ہوئے آیا اور انہیں کچن کیبنٹ پر رکھ کر بولا۔

''کیوں زرینہ...... سب تیاری مکمل ہے؟''

''ہاں...... سب تیار ہے...... آج تو دن اسی کی نذر ہو گیا۔'' اس نے اپنے لہجے سے تھکاوٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بڑے کام کا آدمی ہے۔ اگر کوئی بات بن گئی تو سمجھو وارے نیارے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں سے خوش جائے۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''ٹائم تو تقریباً ہو گیا ہے زرینہ! تم اپنا حلیہ تو درست کرو۔ اور خضرا تم بھی۔'' وہ خضرا سے براہِ راست مخاطب ہوا۔ ''ذرا کچھ ٹھیک ٹھاک سے کپڑے پہن لو۔''

''میں ٹھیک ہوں اسی طرح...... میں نے کون سا ملنا ہے۔'' خضرا ماں کی آڑ لے کر منمنائی۔

''کیوں...... تم کیوں نہیں ملو گی......؟'' عمر دراز نے کڑے تیوروں سے سوال کیا۔

''رہنے دیں آپ...... یہ ایسے ہی کہہ رہی ہے۔ بچی جو ہوئی۔'' ماں نے جلدی سے بات سنبھالی۔ ''آپ فکر نہ کریں...... یہ تیار ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے...... وقت پر ہر کام ہو جانا چاہئے۔ میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ کچھ رہ گیا ہے یا تم میں سے کوئی تیار نہیں۔'' وہ درشت لہجے میں کہتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ ماں نے خضرا کی طرف دیکھا اور سرزنش کے لہجے میں بولی۔

''خضرا! کچھ دھیان رکھا کر تو بھی۔ اپنے انکل کا کہنا نہ ٹالا کر اچھا، ہم لوگ ان سے بگاڑ نہیں سکتے۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ چل جا...... اب منہ ہاتھ دھو کر کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہن لے۔''

خضرا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی اٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ بہت دیر تک الجھی ہوئی سی رہی۔ اس کا دل بغاوت پر آمادہ تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف نہ تیار ہونا چاہتی تھی نہ مہمانوں سے ملنا چاہتی تھی مگر وہ سب کچھ صرف سوچ سکتی تھی، اس پر عمل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے کہ ماں

نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

''خضرا...... خضرا...... تیار ہو گئی ہے یا نہیں...... جلدی کر، مہمان آنے والے ہیں۔''

خضرا نے بے دلی سے لباس تبدیل کیا، کمر پر پڑتے سیاہ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی گوندھ رہی تھی کہ ماں اندر آئی۔ خضرا کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ لمحے بھر کو وہ ماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی کہ اس جیسی نوجوان لڑکی کی ماں معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے جدید تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں کو ایک خوبصورت جوڑے کی شکل دی تھی اور بڑی احتیاط سے کئے گئے میک اپ میں اس کا چہرہ اس کی عمر سے کہیں کم اور معمول سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ ماں نے اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو قدرے جھینپ گئی۔ شانے سے ڈھلکتا دوپٹہ سنوارتے ہوئے جیسے اپنی جھینپ مٹانے کو بولی۔

''خضرا دیکھنا، میں ٹھیک لگ رہی ہوں؟ تمہارے انکل کو بہت فکر ہے...... وہ اپنے مہمان پر بہت اچھا امپریشن ڈالنا چاہتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک لگ رہی ہیں۔'' خضرا نے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا اور چوٹی گوندھ کر پشت پر ڈالی۔

ماں نے ایک تنقیدی نگاہ اس کے سراپے پر دوڑائی۔

''خضرا! تم سے کہا بھی تھا کہ کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہننا۔''

''ٹھیک تو ہیں امی......'' خضرا نے ناگواری سے جواب دیا۔

''ٹھیک کہاں ہیں...... تم کوئی میرا سوٹ پہن لو ناں......'' ماں نے پیش کش کی۔

''نہیں، نہیں...... میں آپ کے کپڑے نہیں پہنوں گی۔'' خضرا نے گھبرا کر انکار کیا۔

''کیوں......؟'' ماں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

خضرا گڑبڑا گئی۔ ''نہیں، نہیں...... وہ بہت شوخ ہیں...... میں نہیں پہنوں گی۔''

ماں اس کے لہجے پر جھینپ گئی اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

موٹی توند اور اڑے ہوئے بالوں والا مہمان جسے عمر دراز ٹھیکیدار صاحب کہہ رہا تھا تقریباً اسی کا ہم عمر تھا۔ اس کے بالوں سے بھرے ہوئے بھدے ہاتھ پر سونے کی موٹی سی انگوٹھی بے حد عجیب لگ رہی تھی۔ وہ بات بات پر بلند آہنگ قہقہے لگانے کا عادی تھا۔

اس کے دانتوں کی قطار میں چمکتا ہوا سونے کا دانت اس کی ہنسی میں ایک خوفناک سی چمک جگا دیتا تھا جو سرد کر دینے والی تھی۔ عمر دراز مسلسل اس کی جی حضوری میں لگا ہوا تھا۔

کھانے کی میز پر ماں بھی اٹھ اٹھ کر اس کی طرف مختلف ڈشیں بڑھاتی رہی۔ وہ خاصا خوش خوراک معلوم ہوتا تھا اور بڑی بے تکلفی سے کھاتے ہوئے بے ہنگم قہقہے لگا رہا تھا۔ خضرا میز کے ایک سرے پر بیٹھی ہوئی بڑی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس کا ذہن، اس کا دل اور اس کا سارا وجود بیزاری اور اکتاہٹ سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا وقت وہ بالکل چپ بیٹھی رہی۔ ان کی ہنستی ہوئی محفل میں اس کی ایک مسکراہٹ بھی شامل نہیں تھی۔

ٹھیکیدار کی گوشت میں دھنسی ہوئی تیز آنکھیں کئی بار اس پر مرکوز ہوئیں لیکن اس نے براہ راست اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زیادہ تر ماں سے ہی گفتگو کرنے میں مصروف رہا اور اس کے غیر معمولی التفات کے جواب میں اس کے پکائے ہوئے کھانے اور گھر داری کے سلیقے کی تعریف کرتا رہا۔

کہیں رات گئے وہ جانے کے لئے اٹھا۔ عمر دراز اور بیٹھنے پر اصرار کرنے لگا لیکن وہ نہیں رکا۔ ماں اور عمر دراز اسے دروازے تک چھوڑنے گئے۔ خضرا زینے کی اوپر والی سیڑھی پر اکتائی ہوئی سی کھڑی تھی۔

☆......☆

یہ لمحہ اس کی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ آیا تھا۔ خوشی کا وہ سہانا لمحہ جسے اس نے خود تراشا تھا...... جو اس کا اپنا تھا...... جو اس کے لئے آس اور امید کی ایک نئی کرن لے کر آیا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ آسانی سے سانس لے سکتی ہے، جیسے اسے جینے کا کوئی جواز مل گیا ہے۔ وہ بس اسٹاپ پر کھڑی بہت دیر تک بہت کچھ سوچتی رہی۔

گھر کی طرف جانے والی بس اسٹاپ پر رکی لیکن وہ اس میں سوار نہیں ہوئی اور قریب ہی کھڑے ہوئے ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ نہ جانے کس احساس نے اسے اتنی جرأت سکھا دی تھی کہ نہ وہ خوفزدہ تھی نہ متوحش نہ فکر مند۔ گہرے اطمینان کی ایک آسودہ کیفیت اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

اس نے رکشے سے اتر کر اطمینان کیا کہ دروازے پر تالا تو نہیں...... اور پھر کواڑوں ہلکی سی دستک دے ڈالی۔ دوسری دستک کے جواب میں دروازہ کھل گیا۔ کواڑ وا ہوئے عمار کا وجیہہ چہرہ ایک خوشگوار حیرت سے کھل اٹھا۔

"زہے نصیب...... زہے نصیب...... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں...... جاگتی آنکھوں کا یہ خواب کتنا دلفریب ہے...... آؤ ناں، اندر آجاؤ۔" اس نے بڑی گرمجوشی سے کہتے ہوئے دروازے سے ہٹ کر اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ خضرا کو اس کے اس تپاک نے محجوب سا کر دیا۔ اس نے قدرے جھینپ کر اپنے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبا لیا۔

عمار کا کمرہ اسی طرح کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر کرسی گھسیٹ کر اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ خضرا کچھ سمٹی ہوئی سی بیٹھ گئی تو وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر بڑی تعظیم سے جھکا۔

"شکریہ...... میرے سب سے سہانے خواب کو حقیقت بنانے کا۔"

خضرا شرما کر اپنی فائل پر یونہی انگلیاں پھیرنے لگی۔ اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کس طرح بات شروع کرے، کیا کہے اور کیونکر کہے؟ نہ جانے کس جذبے کے زیر اثر وہ یہاں تک چلی تو آئی تھی لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صورت حال کا کس طرح مقابلہ کرے۔

عمار مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہیٹر آن کیا۔

"خضرا شاید تم کچھ کہنا چاہتی ہو اور تمہیں الفاظ نہیں مل رہے۔ میں تمہارے لئے اچھی سی چائے بناتا ہوں، تب تک تم سوچ لو کہ تمہیں کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا ہے...... دیکھو ہم اچھے دوست ہیں، ہمیں دل کی باتیں ایک دوسرے سے کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے۔"

خضرا کو کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ اپنی مخروطی انگلیاں مسلتے ہوئے کچھ سوچتی رہی۔ عمار چائے بنانے میں لگا رہا۔ پھر خضرا نے مدھم سے لہجے میں آغاز کیا۔

"میرا ٹائپنگ کا کورس مکمل ہو گیا ہے۔"

"ارے......!" عمار نے ایک دم پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ "تو ٹھیک طرح سے

بتاؤ ناں...... تم تو اس طرح بتا رہی ہو جیسے تم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔''

خضرا کو ہنسی آئی۔ ''اور کس طرح بتاؤں؟''

عمار قریب آیا اور خضرا کا بازو پکڑ کر اسے کرسی سے اٹھا کر ایک چکر دیا۔ ''اس طرح...... خوشی کے ساتھ، مسرت سے، مزے سے۔''

''اوہ...... آپ کیا کرتے ہیں؟'' خضرا اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کھل کر ہنسی۔

''کرنا کیا ہے؟...... ہم تمہاری اس پہلی کامیابی کو پوری شان سے منائیں گے۔ ناچ کر، گا کر......'' اس نے پھر خضرا کو دائرے میں گھما دیا۔

خضرا کو محسوس ہوا کہ خوشی اس کے اندر سے پھوٹی ہے۔ ہنسی اس کے لبوں پر بے ساختہ آئی۔ اس نے عمار سے بازو نہیں چھڑایا اور اس کے ساتھ لہراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اے میڈم!...... اب شہزادی بن کر کرسی پر نہ بیٹھو۔ یہاں آ کر یہ چائے بناؤ، پیالیوں میں ڈالو۔ میں بیکری سے کیک لے کر ابھی آیا۔ آج ہم تمہاری کامیابی کا جشن منائیں گے۔'' عمار نے پیروں میں چپلیں اٹکاتے ہوئے چٹکی بجائی۔

''یہ آپ کیا تکلف......'' خضرا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''چپ...... بکواس وغیرہ نہیں چلے گی۔'' وہ رعب جھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

جب تک خضرا نے چائے بنا کر پیالیوں میں ڈالی تب تک وہ ہاتھ میں کیک کا ڈبہ اٹھائے ہوئے آ گیا۔ اس نے ڈبہ کھول کر ایک چھوٹی تپائی پر رکھا، اپنے کاٹھ کباڑ کو اٹھا پٹخ کر ایک چاقو برآمد کیا، اسے کھول کر رومال سے پونچھا اور خضرا کے ہاتھ میں تھماتا ہوا بولا۔

''خضرا یہ تمہاری پہلی خوشی کے نام ہے۔''

خضرا کے دل میں خوشی کی ننھی منی کلیاں چٹکنے لگیں۔ مسرت کی پھوار میں اس کی روح تک بھیگ گئی۔ وہ ایک پونڈ کا ننھا سا گلابی کیک تھا جس پر سرخ پھول اور مہین مہین سے نقرئی موتی سجے ہوئے تھے۔ خضرا کچھ جھجکی، عمار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کیک کٹوایا، اس کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس نے خضرا کے منہ کی طرف بڑھایا۔

''خضرا...... لو، منہ میٹھا کرو۔''

خضرا محجوب سی ہو کر پیچھے ہٹی اور اس نے کیک لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ عمار نے ں کا ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ''نہیں، منہ کھولو۔''

خضرا ہچکچائی۔ عمار نے اصرار کیا۔ ''کھولو منہ...... کھولو۔''

خضرا اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کا مطالبہ نظر انداز نہیں کر سکی۔ عمار نے اس کے منہ کیک کا ٹکڑا رکھا اور سچے لفظوں میں بولا۔

''خضرا میں بہت خوش ہوں کہ تم اپنا راستہ خود بنا رہی ہو۔''

خضرا نے خوشی کو اپنے بہت قریب محسوس کیا۔ اس نے چائے کی پیالی اٹھا کر عمار کی ف بڑھائی۔

''واہ...... بڑی خود غرض ہو تم خضرا۔'' اس نے پیالی پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا منہ بھی ا نہیں کروایا۔''

خضرا جھینپ گئی۔ اس نے چاقو سے کیک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹا اور اٹھا کر اس کی میں رکھنے لگی۔ عمار نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جھک کر اس کے ہاتھ سے وہ کا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال لیا۔ خضرا کی دراز پلکیں اس کے گلابی رخساروں پر سایہ نے لگیں۔

عمار ایک اسٹول پر اس کے مقابل بیٹھ گیا اور کیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹتے ہوئے بولا۔

''خضرا! تم سکول سے آ رہی ہو اور میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ ہم یہ کیک سارا کا را ختم کر کے چھوڑیں گے۔''

خضرا مسکرائی۔ ''میری تو بھوک اُڑ گئی ہے خوشی میں۔''

''کوئی بات نہیں...... کیک کھانے کے لئے کون سی بھوک کی ضرورت ہوتی ہے۔'' نے ہنستے ہوئے کیک کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر خضرا کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''خضرا، میں بہت فخر محسوس کر رہا ہوں کہ تم نے مجھے اپنی خوشی میں شریک کیا ہے۔ نے آج محسوس کیا ہے کہ کسی عزیز ہستی کی خوشی اپنی خوشی سے زیادہ پیاری اور مسرور دینے والی ہوتی ہے۔''

خضرا خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ عمار کے خلوص اور لگاؤ اور اس کی آنکھوں کی پسندیدگی میں چائے پینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نہ کوئی خوف تھا نہ کسی کی پرواہ۔ وہ کچھ دیر اسی آسودگی میں سانس لیتی رہی۔ پھر رک رک کر بولی۔

''آپ میری تھوڑی سی مدد کردیں گے؟''

''زہے نصیب! خضرا! تم حکم کرو، اس طرح ڈر ڈر کر پوچھو نہیں۔'' وہ زوردار لہجے میں کہنے لگا۔

''میں کہنا چاہتی تھی کہ مجھے تھوڑے دنوں میں ڈپلومہ مل جائے گا۔ تب تک شاید رزلٹ بھی آجائے۔ میں نے اپنی ٹائپ کی اسپیڈ کافی اچھی کرلی ہے۔ میرے لئے کہیں ملازمت کا بندوبست ہوسکتا ہے؟ دراصل میں...... میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں۔ انکل کے احسان سہارنا اب مشکل ہوتا جارہا ہے۔'' خضرا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خضرا! تمہارا یہ جذبہ قابل تعریف ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم کس قسم کے حالات میں رہنے پر مجبور ہو۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہارے لئے پوری کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ انتظام ہوجائے گا۔ بس ذرا تمہارا رزلٹ آجائے، تب تک تم اپنی اسپیڈ میں اور روانی پیدا کرو۔'' عمار نے یقین دلایا۔

خضرا کو تسلی سی ہوگئی۔ اس نے قدرے بیتابی سے استفسار کیا۔

''کب تک کوئی انتظام ہوسکے گا؟''

''جلد ہی...... سمجھو، یہ میرا اپنا کام ہے۔'' عمار نے اعتماد سے کہا۔

''بہت احسان ہوگا آپ کا۔'' خضرا نے اظہار ممنونیت کیا۔

''اور اگر مجھ سے ایک جھانپڑ پڑ گیا تو کیا ہوگا؟'' عمار نے برجستہ کہا۔

خضرا نے پریشان ہوکر اس کی طرف دیکھا۔

''خضرا کی بچی اپنوں کے لئے کچھ کرنا احسان ہوتا ہے بھلا؟'' وہ خفگی سے کہنے لگا ''فوراً اپنے یہ ربی لفظ واپس لو۔ میرا تو دم الجھنے لگا ہے۔''

خضرا شگفتگی سے ہنسی۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''خالی خولی ڈرو ہی نہیں، اپنے الفاظ بھی واپس لو۔'' عمار نے آنکھیں نکالیں۔

''کسی کو یوں ڈرانا کوئی اچھی بات ہے کیا؟'' خضرا نے مصنوعی خوفزدگی سے کہا۔

''اور اپنوں سے غیریت برتنا کوئی اچھی بات ہے کیا؟'' عمار نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

خضرا نے خاموش ہنسی میں اس کی بات کا جواب دیا اور اٹھتے ہوئے بولی۔

''بس اب میں چلوں گی...... آج تو بہت دیر ہوگئی ہے۔''

عمار بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ ''خضرا آج تم نے خیال نہیں کیا کہ کوئی تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھ بھی سکتا ہے۔''

خضرا کے دل میں خوف کا ایک بگولہ سا اٹھا۔ اسے عمر دراز کی غصے میں سرخ آنکھیں یاد آئیں لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''میں اب اس حصار سے نکلنا چاہتی ہوں جس میں سانس لینا بھی دوبھر ہے۔''

گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا۔ اس نے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ گالیوں، چیخوں اور زہریلی آوازوں کا لاوا سا بہتا ہوا نیچے آنے لگا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ ٹھٹک کر وہیں سیڑھیوں میں ہی رک گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شور سے اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ میں عمر دراز کی دھاڑ سنائی دی۔

''آوارہ، بدچلن، حرافہ...... تیرے شوہر نے کچھ دیکھ کر ہی تیرے منہ پر طلاق کی کالک ملی تھی اُلو کی پٹھی...... بلاّ اور عبدالستار یہاں کیوں آتے ہیں؟ وہ بدمعاش رؤف تیرا کیا لگتا ہے...... اور وہ بابو...... تُو کیا سمجھتی ہے کہ میں اندھا ہوں، کچھ نہیں دیکھتا، کچھ نہیں سنتا...... مجھے تیری ایک ایک حرکت کا پتہ ہے...... میں نے سوچا تھا کہ تجھے سب کچھ دوں گا تو تُو سدھر جائے گی...... پر تیرے منہ کو خون لگ گیا ہے۔ میں تیرا قصہ ہی ...ل کردوں گا...... دیکھتا ہوں کون تیرا ہوتا سوتا تجھے چھڑانے آتا ہے۔''

عمر دراز کی غراہٹ کے ساتھ ماں کی چیخیں، بھاگنے دوڑنے کی آوازیں، چیزوں کے پھینکنے اور برتن ٹوٹنے کا شور خضرا تک آیا۔ وہ سہم کر سیڑھیوں کے بیچ دبکی رہی۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... اس کے سر پر خون سوار ہے...... یہ مجھے مار دے گا...... بچاؤ، بچاؤ......'' ماں کی لرزہ خیز چیخیں مسلسل سنائی دینے لگیں۔ مدد کی اس پکار اور شاید ماں کے رشتے کی کسی کشش کا اثر تھا کہ یکایک خضرا غیر ارادی طور پر سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آئی

اور عمر دراز کے ہاتھوں سے ماں کی چوٹی چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی چلائی۔

''چھوڑ دو میری ماں کو...... چھوڑ دو...... اسے مت مارنا۔''

عمر دراز نے زور سے اسے دھکا دیا۔''دفع ہو جاؤ...... جیسی ماں ویسی بیٹی...... میں اس کے ساتھ تمہارا قصہ بھی تمام کردوں گا۔''

خضرا لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی۔ ماں نے دہائی دی۔

''خضرا...... خضرا...... جا چلی جا...... جا محلے داروں کو اکٹھا کر، کسی کو بلا کے لا...... یہ پاگل ہوگیا ہے، اس کے سر پر خون سوار ہے...... جا، تُو چلی جا...... جا......''

خضرا نے دیکھا عمر دراز کے ہاتھ میں باورچی خانے میں استعمال ہونے والی چھری تھی اور اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ خضرا دیوانگی سے پھر آگے بڑھی۔

''مت مارنا میری ماں کو...... چھوڑ دو...... چھوڑ دو...... مت مارو۔''

عمر دراز نے ماں کے بال چھوڑ دیئے اور خضرا کی طرف پلٹ کر اس کا بازو جھنجھوڑ کر بولا۔''میں تمہارے کہنے پر آج اسے چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن اس کی ذمہ داری تم پر ہے کہ اس گھر میں کوئی لفنگا، بدمعاش قدم نہیں رکھے گا۔ یہ کہیں آوارہ گردی کرنے نہیں جائے گی، اپنے یاروں سے نہیں ملے گی۔ بولو، تم اٹھاتی ہو اس کی ذمہ داری؟ بولو......'' وہ غصے سے تنے ہوئے نقوش کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا۔

یہ بات خضرا کے دل پر جا لگی۔ اس کا اندر باہر نفرت سے کھول اٹھا۔ یہ کیسی دنیا تھی؟ یہ سب کیسے رشتے تھے جن میں نہ اعتبار تھا نہ احترام...... وہ بیٹی تھی لیکن اسے ماں کا نگران بنایا جا رہا تھا اور اس کی ماں ممتا کے مقدس منصب سے اتر کر ایک عام عورت کی طرح مجرم بنی کھڑی تھی اور وہ شخص جس سے اس کا رشتہ باپ کا تھا، اپنا گھناؤنا کردار چھپائے ماں کے کردار کی ضمانت مانگ رہا تھا۔

''بولو...... دو جواب...... لیتی ہو اس کی ذمہ داری؟'' وہ کڑے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چھری دبی ہوئی تھی۔

خضرا نے اس کا ہاتھ اپنے بازو پر سے جھٹک دیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی...... یہ آپ کا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ خود ہی اسے طے کریں۔ لیکن اس طرح نہیں۔'' وہ بات مکمل کرتے کرتے شدتِ جذبات سے رو پڑی۔

عمر دراز نے فوراً ہی چھری پھینک دی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''ٹھیک ہے خضرا...... یہ تم کہہ رہی ہو تو میں درگزر کرتا ہوں...... لیکن اس آوارہ عورت کو بتا دو کہ آئندہ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گا۔''

خضرا کیا کہتی۔ اس کے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا۔ نہ اعتماد، نہ یقین، نہ دعویٰ۔

وہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کامیابی کی خوشی، نیا راستہ تراشنے کی آس اور عمار کے ساتھ گزارے ہوئے خوشی کے لمحے...... سب کچھ اس واقعہ کی پراگندگی نے خود میں جذب کر لیا تھا۔ سنگین وقت کے دہکتے ہوئے لاوے نے اس کی ساری خوشیوں کو چاٹ لیا تھا۔ وہ شام تک کمرے میں بند رہی۔ گھر کی فضا میں ایک تناؤ سا جھلکتا رہا۔

ماں سے نہ اس کا سامنا ہوا نہ ہی وہ کمرے سے باہر نکلی۔ بس اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ماں اور عمر دراز میں کشیدگی بہت دنوں تک برقرار رہے گی۔ لیکن ابھی گہری رات بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان دونوں کے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں اس تک پہنچنے لگیں۔ اس کے اندر ابال سے اٹھنے لگے۔ اسے ماں کوئی غیر عورت لگنے لگی۔ کچھ دیر پہلے گزرنے والا سارا واقعہ محض ڈرامہ معلوم ہونے لگا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر الجھتی رہی کہ کیا حقیقت ہے اور کیا دکھاوا؟

✿......✿

اگلی صبح بھی وہ اپنے کمرے میں بند ہی رہی۔ ناشتہ کرنے بھی نہیں نکلی۔

عمر دراز چلا گیا تو ماں نے دستک دی۔ خضرا کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ اٹھ گئی۔ الٹا سیدھا ناشتہ کر کے وہ تیار ہو رہی تھی کہ ماں اس کے کمرے میں آ گئی۔

''خضرا...... کیا کر رہی ہو؟'' ماں کا لہجہ کچھ نیا نیا اور محتاط تھا۔

خضرا نے جواب نہیں دیا اور چوٹی پشت پر ڈالتے ہوئے آئینے کے سامنے سے ہٹ آئی۔ ماں نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا اور ذرا قریب آ کر بولی۔

''خضرا! تُو نے یہ اخبار دیکھا ہے؟''

''نہیں......'' خضرا نے نفی میں جواب دیا۔

''یہ لے...... دیکھ لے۔'' اس نے تہہ کئے ہوئے اخبار کے پہلے صفحے پر ایک خبر کی

طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہے امی؟" خضرا نے اخبار لیتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

"تُو خود ہی دیکھ لے۔" ماں نے اس طرح کہا جیسے خود نہ بتانا چاہتی ہو۔"

خضرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کی طرف دیکھا...... وہ آنکھیں جھپکنا بھول گئی۔ اس نے بے یقینی سے پھر دیکھا، نگاہوں کے سامنے جو صفحہ، جو سطریں اور جو تصویریں تھیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

یہ کیا ہو گیا تھا؟...... کاش آج کا اخبار اس نے نہ دیکھا ہوتا...... کاش یہ سب کچھ ایک جھوٹ، ایک فریب ہوتا۔ اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے جلی سرخیاں تھیں۔

"جیل میں قتل کے ملزموں میں تصادم......"

ہلاک ہونے والوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ باپ اور نظام کی نمایاں تصویریں صاف پہچانی جا رہی تھیں۔ وہ ایک ٹک دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ خاموش اپنے جذبات کو اندر ہی اندر کچلتی ہوئی، درد کی ٹیس چپ چاپ سہتی ہوئی بے خیالی میں ہونٹ چباتی ہوئی۔

جو رشتہ اس کی زندگی میں ہو کر بھی نہیں تھا اس کے ٹوٹ جانے پر وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی اسی طرح کھڑی تھی جیسے کچھ بھی نہ دیکھ رہی ہو۔ ماں جو اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اس کے ہاتھ سے اخبار لیتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

"مجھے پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا یہی انجام ہونا تھا...... پر اس نے کبھی میری سنی ہی نہیں۔ کبھی میری بات پر کان نہیں دھرا۔

خضرا اب بھی خالی الذہن اسی طرح چپ کھڑی تھی جیسے گرد و پیش سے بے خبر ہو۔ ماں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"خضرا...... خضرا...... اس طرح کیوں کھڑی ہے...... کچھ بول...... کچھ کہہ تو سہی...... اپنے دل کو بات نہ لگا۔"

خضرا نے چونک کر سر جھٹکا۔

"کوئی بات میرے دل کو نہیں لگتی...... کوئی نہیں۔"

ماں نے گہرا سانس لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"اس نے تو تم لوگوں کو بھی باپ بن کر نہیں دکھائی۔ میں اپنی بات تو کیا کروں، تمہارے لئے بھی اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ اب اس مرے کے پیچھے میں کیا کہوں......؟" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

خضرا نے بے تاثر چہرے کے ساتھ ماں کا ہاتھ ہٹا کر اپنی فائل کو ترتیب دیا اور کمرے میں یہاں وہاں دیکھ کر کرسی کی پشت پر سے اپنی چادر اٹھائی۔ ماں اس دوران چپ کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ خضرا نے چادر کھول کر اوڑھی اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔

"بات سن خضرا......" ماں نے پھر اسے مخاطب کیا۔

خضرا نے رک کر سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"دیکھ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا، کسی کو نہ بتانا کہ قتل ہونے والا تیرا باپ تھا۔ تیرے حق میں اچھا نہیں ہے بیٹی! لوگ سو طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ نام دھرتے ہیں۔ تُو اس بات کو یہیں چھوڑ دے۔ اس طرح جیسے اخبار میں جس کی تصویر چھپی ہے تُو اسے نہیں جانتی، اس سے تعلق ظاہر کر کے خود کو مجرم کی بیٹی نہ بنانا۔ وہ خود تو مر کر مٹی ہو گیا ہے لیکن اس کا جرم تیرے ساتھ ساتھ رہے گا۔"

ماں نے گویا اسے نصیحت کی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اپنے ساتھ اخبار بھی لے گئی۔

خضرا وہیں کھڑی تاسف سے سوچتی رہی کہ وہ کس رشتے سے تعلق جوڑ لے اور کس سے توڑ لے۔ باپ کا رشتہ اپناتی ہے تو مجرم کی بیٹی کا طعنہ ملتا ہے۔ ماں سے تعلق رکھتی ہے تو اس سے منسوب کہانیاں اس کے نام لگ جاتی ہیں۔ لوگوں کی آنکھوں کے شکوک اس کے وجود سے لپٹ جاتے ہیں۔ وہ تو ایسی بیٹی تھی جس کے پاس نہ ماں کا رشتہ تھا نہ باپ کا۔ وہ کسی کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ نہیں لگا سکتی تھی۔

ماں اس کے روبرو ہو کر بھی ماں نہیں لگتی تھی اور باپ کے ہونے کا احساس نہ کبھی تھا نہ اب ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا رشتہ تھا جس نے اسے خوف اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں دیا

تھا۔ اب جبکہ وہ اس کی زندگی سے نکل گیا تھا تو نہ جانے کیوں غیر محفوظ ہونے کا احساس اندر ہی اندر گہرا کیوں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی تھی اور دل میں کہیں بہت دور چپکے چپکے آنسو گر رہے تھے۔

✿......✿

''خضرا...... خضرا......'' عمر دراز کی آواز پر وہ پریشان سی ہوگئی۔ اس نے کبھی اسے اس طرح سے نہیں پکارا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ کچھ گھبرائی، کچھ جھجکی اور متذبذب قدم اٹھاتی اپنے کمرے سے باہر آئی۔

عمر دراز برآمدے میں اخبار لئے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے بلند آواز میں کہا۔

''خضرا یہ دیکھو...... تمہارا رزلٹ نکل آیا ہے۔ اپنا رول نمبر بتاؤ جلدی سے۔ تمہارا نتیجہ دیکھیں۔''

''ہاں خضرا...... اپنا رول نمبر بتاؤ انکل کو۔ خدا کرے تم اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہو۔'' ماں بھی قریب آئی۔

خضرا کی گھبراہٹ قدرے کم ہوئی۔ اس نے اپنا رول نمبر بتایا۔ عمر دراز گزٹ کے مختلف کالموں میں نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس کی نگاہوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ خضرا کا سانس اوپر تلے ہونے لگا۔ جیسے جیسے اسے رول نمبر ڈھونڈنے میں دیر ہوتی تھی، خضرا کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا تھا۔ ماں بھی مشتاق آنکھوں سے عمر دراز کی نگاہوں کی جنبش کو دیکھ رہی تھی۔

''ارے واہ...... ویل ڈن...... یہ تو بہت اچھے نمبر ہیں......'' ایک جگہ انگلی رکھ کر عمر دراز نے بے ساختہ کہا۔ خضرا کی جان میں جان آئی۔ ماں نے خوش ہو کر اس کا شانہ تھپکا۔

''شاباش خضرا...... بہت اچھے......'' عمر دراز نے گزٹ میں اسے اس کا رول نمبر دکھاتے ہوئے کہا۔ خضرا کا دل اطمینان سے بھر گیا خوشی نے اس کی روح کو چھوا لیکن اس کا اظہار محض اس کے گلابی لبوں کی مسکراہٹ ہی بن سکا۔ نہ ماں، نہ عمر دراز دونوں میں سے کوئی بھی اتنا قریب نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اپنی خوشی بانٹ سکتی۔ اس نے

وب ہو کر کسر نفسی سے سر جھکا لیا۔

''مان گئے بھئی تمہاری بیٹی کو......'' عمر دراز نے ماں سے کہا۔

''میری بیٹی بہت قابل ہے...... آپ نے کیا یونہی سمجھا ہوا تھا؟'' ماں نے تفاخر سے کہا۔ خضرا خاموش رہی اور گزٹ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''خضرا...... تم کہاں چل دیں؟'' عمر دراز نے پوچھا۔

''میں استانی جی کی طرف جا رہی ہوں۔'' خضرا نے اطلاع دی۔ ایک وہی تو تھیں جن کے ساتھ یہ خوشی بانٹ کر کئی گنا بڑھ سکتی تھی۔

''بالکل نہیں...... استانی جی کی طرف تو تم کل جاؤ گی۔ اس وقت تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔ اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہو، تمہیں تحفہ لے کر دیں گے۔'' عمر دراز نے قطعی لہجے میں کہا اور ماں سے مخاطب ہوا۔ ''زرینہ! تم بھی تیار ہو جاؤ...... آج ہماری بیٹی جو کہے گی ہم اسے لے کر دیں گے۔ ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔'' عمر دراز نے گردن اکڑا کر کہا۔

''سن لے خضرا دھیان سے...... آج تُو نے اس کی ساری جیب خالی کروا کے چھوڑنی ہے۔'' ماں نے خوش دلی سے خضرا کو مخاطب کیا۔

''نہیں امی! بھلا اس کی کیا ضرورت ہے...... اور پھر میں پہلے استانی جی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ ان کی وجہ سے ہی تو میرے اتنے اچھے نمبر آئے ہیں۔'' خضرا نے رکھائی سے کہا۔

''اچھا بھئی...... نہیں تو نہ سہی۔ تمہاری بیٹی ہمیں اتنا ہی غیر سمجھتی ہے تو ٹھیک ہے، اس کی مرضی۔'' عمر دراز نے تیوری پر بل ڈال کر لہجہ بدلا۔

ماں اس کی ناراضگی سے گھبرائی۔ ''نہیں نہیں...... یہ بھلا کیوں نہیں جائے گی۔ آپ تو ذرا سی بات پر اپنا موڈ خراب کر رہے ہیں۔''

''موڈ خراب نہ کروں تو اور کیا کروں۔ تمہاری یہ بیٹی تو مجھے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ میری ت تو اس طرح ٹالتی ہے جیسے میں اس کا دشمن ہوں۔'' وہ اور درشت ہوا۔

خضرا چور سی بن گئی۔ ماں اور گھبرائی۔ ''چھوڑیں بھی ناں...... وہ تو بچی ہے، بس ذرا جھجکتی ہے آپ سے۔''

"کتنی دفعہ چھوڑوں...... اس کا تو یہی وطیرہ ہے۔ مجھے خیال نہیں آتا، سارے فرائض پورے کرتا ہوں، ہر طرح خیال رکھتا ہوں۔ کبھی کچھ کہا سنا نہیں پھر بھی اس گھر میں میری یہ عزت ہے یہاں سوتیلا پن نہیں جاتا۔" اس کا پارہ اور چڑھا۔ "ابھی سوتیلے رشتے دیکھے نہیں ہیں، اچھوں سے سابقہ ہوا ہے ناں...... اسی لئے مزاج نہیں ملتے۔" وہ لفظ چبا کر بولا۔

ماں کو اس کی خفگی نے پریشان کر دیا۔ خضرا بدل جانے والی صورت حال کو سراسیمگی سے دیکھ رہی تھی۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے وہ یوں کھڑی تھی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ عمر دراز کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی اور لفظ سخت ہوتے جا رہے تھے۔

ماں خوشامدیں کر کر کے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خضرا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہیں مجرم بن کر کھڑی رہے یا عمر دراز کی غصے سے سرخ آنکھوں سے پرے ہٹ جائے۔

ماں نے اسے مخاطب کیا۔

"چل خضرا...... کپڑے بدل اور جا اپنے انکل کے ساتھ۔ کچھ خدا کا خوف کیا کر۔ وہ تیرا اتنا خیال رکھتے ہیں اور تیرے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے۔ چل تیار ہو جا جلدی سے۔ دو منٹ لگا بس۔"

"نہیں...... بس کوئی ضرورت نہیں۔" عمر دراز بگڑ کر بولا۔

"جانے بھی دیں...... خوشی کا موقع ہے۔ اب ناراضگی ختم کر دیں۔" ماں نے خوشامد کی اور عمر دراز کی نظر بچا کر خضرا کی طرف آنکھیں نکالیں کہ وہ تیار ہونے کے لئے کیوں نہیں جاتی۔ خضرا کو بادل نخواستہ چلنا پڑا۔

تھوڑی ہی دیر میں ماں نے دروازہ بجایا۔ خضرا نے پریشانی سے اپنی چادر اٹھا کر اوڑھ لی اور دروازہ کھول کر باہر آئی۔

"خضرا، کچھ خیال کیا کر تُو بھی...... ہمیشہ تیرا یہی وطیرہ ہے۔ کچھ تجھے احساس ہے کہ نہیں، انہوں نے ہی تو تیرا بوجھ اٹھا رکھا ہے اور کبھی منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ایک تیرا سگا باپ بھی تو تھا جس نے کبھی ایک پیسہ لا کر نہیں دیا کہ لے میرے بچوں کے منہ

میں کچھ ڈال دے۔" ماں نے قریب آ کر دبی زبان سے سرزنش کی۔

خضرا چھلنی چھلنی ہو گئی۔ باپ کا وجود اس کی زندگی میں نہ محبت بن کر رہا تھا، نہ رشتہ بن کر۔ لیکن ایک طعنہ بن کر اسے کچوکے دیتا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی، آنسو پیتی باہر آئی تو عمر دراز یوں اخبار پڑھ رہا تھا جیسے جانے کا ارادہ نہ ہو۔

"اب اٹھیں ناں...... خضرا تیار ہو کر آ گئی ہے۔" ماں نے خوشامدانہ لہجے میں اسے متوجہ کیا۔

اس نے اخبار رکھ کر گہری نگاہ سے دونوں کی طرف دیکھا اور خفگی سے بولا۔

"اگر اس کا دل نہیں چاہتا تو کوئی زبردستی نہیں۔"

"چھوڑیں بھی نا بس۔ اب اپنا موڈ ٹھیک کر لیں۔" ماں نے جیسے منانے کو کہا۔

اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور ماں سے بولا۔ "تم بھی چلو۔"

"نہیں...... آپ خضرا کو ہی لے جائیں۔ اسکوٹر پر آرام سے چلے جائیں گے۔ میں ساتھ ہوئی تو سواری ڈھونڈنی پڑے گی۔" ماں نے سرسری لہجے میں کہا۔

خضرا کی جان نکل گئی۔ اس نے جلدی سے گھبراہٹ میں کہا۔ "امی آپ بھی چلیں۔"

"نہیں خضرا! تم ہی چلی جاؤ۔ اور دیکھو آج اپنے انکل کی ساری جیب خالی کروانی ہے اچھا۔" ماں نے مسکراتے ہوئے اس کی پشت پر تھپکی دی۔

عمر دراز نے ہنستے ہوئے میز پر سے اسکوٹر کی چابی اٹھائی۔

"سکھاؤ اپنی بیٹی کو...... اچھی طرح سے کرو مجھے کنگال۔"

ایک شاندار ریسٹورنٹ کے علیحدہ کیبن میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"خضرا، تم تو میرے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھیں لیکن دیکھو میں تمہیں لے ہی آیا۔"

خضرا سمٹ کر میز کے دوسری طرف پڑی ہوئی کرسی کی طرف بڑھ گئی۔ بیرا میز پر آرڈر سجانے لگا۔ خضرا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی سی ایک ہی انداز میں وہیں بیٹھی تھی۔

"خضرا، آرام سے بیٹھو......" عمر دراز نے اس کے دلکش چہرے پر گھبراہٹ کی تحریریں پڑھتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔" خضرا کان کے پیچھے بال سمیٹتی ہوئی مدھم لہجے میں بولی۔

"کہاں ٹھیک ہو...... تم تو یوں بیٹھی ہوئی ہو جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جاؤ گی۔" عمر دراز نے ہنس کر کہا۔

خضرا چپ بیٹھی نیپکن کو یونہی الٹتی پلٹتی رہی۔ عمر دراز نے میز پر ٹکے ہوئے اس کے چھوٹے سے ملائم ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

"خضرا گھر پہ میں نے جو باتیں غصے میں کی تھیں تم نے ان کا برا تو نہیں مانا؟"

خضرا نے اپنے ہاتھ کو اس کے کھردرے ہاتھ کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

عمر دراز نے اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔

"دراصل وہ باتیں تو میں نے یونہی تمہاری ماں کو سنانے کے لئے کی تھیں ورنہ تم...... تمہارے بارے میں تو میں اس طرح سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس کی نگاہیں چبھنے لگیں۔

خضرا کا دم الجھنے لگا۔ اس نے ایک بار میں ہی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے علیحدہ کر لیا اور ہمت کر کے بولی۔

"آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔"

"کس طرح نہیں کرنا چاہئے؟" وہ دلچسپی سے اس کی جانب تکنے لگا۔

خضرا جز بز ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بیرا کچھ اور ڈشیں رکھنے اندر آیا۔ عمر دراز نے اسے کھانا شروع کرنے کا اشارہ کیا اور اسے ایک ایک ڈش کے بارے میں بتانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی پلیٹ کو کھانوں سے بھرتا رہا۔

خضرا کو چینی کھانے کھانے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اسے ان کا ذائقہ کچھ عجیب اور نامانوس سا معلوم ہو رہا تھا۔ عمر دراز کی موجودگی، اس کی نگاہوں کے زاویئے اور ذائقے کی نامانوسیت...... کچھ بھی تو اسے کھانے نہیں دے رہا تھا۔

عمر دراز نے بے تکلفی سے کھاتے ہوئے کہا۔ "کھاؤ ناں خضرا...... تم تو تکلف میں بیٹھی ہوئی ہو۔"

"جی اچھا......" خضرا اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"آگے کیا خیال ہے تمہارا...... کس کالج میں داخلہ لو گی؟" عمر دراز نے پوچھا۔

"استانی جی سے بات کروں گی...... ان سے پوچھوں گی۔" خضرا نے دبی زبان سے اب دیا۔

"کیوں...... استانی جی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے جس سے تم بات کرو...... جس ے تم پوچھو، مشورہ لو۔" اس کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

خضرا نے سر جھکا کر خود کو کھانے میں مصروف ظاہر کیا اور اس کی بات کا جواب نہیں ا۔ وہ چند لمحے شاید اس کے جواب دینے کا انتظار کرتا رہا پھر اپنی بات پر زور دیتا ہوا لا۔

"جواب نہیں دیا تم نے؟"

"کیا جواب دوں؟" خضرا نے لاجواب سی ہو کر اسی سے سوال کیا۔

"یہی کہ استانی جی کے علاوہ تم کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھتیں؟" اس کڑے تیوروں سے استفسار کیا۔

"آپ غلط سمجھے ہیں...... میرا یہ مطلب نہیں۔" خضرا نے پریشان ہو کر بات بھالی۔

"ہاں...... میں غیر جو ہوا، میرا تو کسی پر کوئی حق ہی نہیں۔" اس کے انداز میں شکوہ ۔

خضرا الجھ سی گئی۔ "میں نے تو نہیں کہا۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں ادھوری بات کی تھی کہ بیرے کی دستک سنائی دی۔

عمر دراز نے بل چکایا اور خضرا سے پوچھنے لگا۔

"آئس کریم منگواؤں تمہارے لئے؟...... تم نے اچھی طرح کھانا نہیں کھایا۔"

"نہیں، نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔" خضرا نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا اپنی چادر درست کرنے لگی۔

عمر دراز بھی جیب میں پرس رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دو تین قدم بڑھ کر خضرا کی کرسی کی ت پر ہاتھ رکھ کر کرسی کو پیچھے ہٹایا۔ خضرا سمٹ کر ایک جانب ہو گئی۔ عمر دراز نے اس چادر کا پلو کھینچ کر اسے قریب کیا اور بھاری لہجے میں بولا۔

"خضرا...... میں تو تمہارا اتنا خیال رکھتا ہوں اور تم مجھ سے اس طرح کتراتی ہو جیسے میں تمہارا دشمن ہوں...... کیا میں اتنا ہی برا ہوں؟"

"پلیز...... پلیز، آپ اس طرح نہ کیا کریں...... مت کیا کریں۔" خضرا نے اپنا پلو چھڑاتے ہوئے سراسیمگی سے کہا۔

"یہ تو میری بات کا جواب نہیں ہے۔" اس نے پلو نہیں چھوڑا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"نہیں ہے تو نہ سہی۔" خضرا نے پورا زور لگا کر اپنا پلو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور تلخی سے بولی۔ "میرے پاس ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔"

اور اس نے جرأت سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ اچانک کھل جانے پر باہر سے نظر آنے والے منظر نے یا خضرا کی خلاف توقع غیر معمولی جرأت نے عمر دراز کو خاموش کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔

خضرا اندر ہی اندر خوف کی یخ بستہ کیفیت میں ہچکولے کھا رہی تھی لیکن کمرے سے باہر آ جانے پر رہائی کا احساس خوش کن بھی تھا۔ وہ بغیر کسی طرف دیکھے عمر دراز کے ساتھ باہر کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک باہر کا دروازہ کھلا اور کسی نے بڑے تپاک سے کہا۔

"آہا عمر دراز صاحب...... یہ آپ کہاں؟"

خضرا نے نگاہیں اٹھائیں۔ سگریٹ نوشی کی کثرت سے سیاہ پڑے ہونٹوں کے درمیان دانتوں کی قطار میں سونے کے دانت چمکے۔

"دیکھ لیں ٹھیکیدار صاحب...... آپ کی دعائیں ہیں۔" عمر دراز نے تپاک سے کہا۔

اس نے تیز چمکتی آنکھوں سے خضرا کی طرف دیکھا۔ "واہ عمر دراز صاحب...... تو یہ ٹھاٹھ ہیں آپ کے۔" اس نے ایک آنکھ دبائی اور معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ تو مزے میں ہیں۔"

خضرا کو اس کی غلیظ آنکھ کے واضح اشارے نے خجل کر دیا۔ عمر دراز نے کسی تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ایک انداز تفاخر سے جیسے اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"بس جی...... اللہ کا فضل ہے آپ کی دعا سے۔"

"آئیے کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔" اس نے اپنے سونے کے دانت چمکاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ٹھیکیدار صاحب...... اس وقت نہیں بیٹھ سکتے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ ب یہ خضرا کو شاپنگ بھی کرانی ہے۔" عمر دراز نے جیسے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے کہا۔

"اچھا...... اچھا......! میں سمجھتا ہوں۔ آپ جائیے...... جائیے بڑے شوق سے۔" ں نے پھر نگاہوں میں کوئی مفہوم بھر کر بلند قہقہہ لگایا جس کی پذیرائی کے لئے عمر دراز نے اپنے قہقہے کو اس کے قہقہے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا اور اس سے ہاتھ ملا کر خضرا کے براہ باہر نکل آیا۔ خضرا کے لئے ایک ایک سانس دوبھر تھی۔

استانی جی اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوئی تھیں۔ عمر دراز نے مٹھائی کا ڈبہ لا کر دیا تھا تاکہ وہ استانی جی کو دے آئے۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا اور اس کی پشت محبت سے تھپکتی ہوئی بولیں۔

"دیکھ بچی! محنت کا دامن نہ چھوڑنا۔ تجھے اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کی نسبت جلدی پاؤں پر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔ اللہ تیری حفاظت کرے۔"

استانی جی کی شفقت میں کوئی ایسی بات تھی کہ خضرا چند لمحے ان کے سینے سے لگی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نمی جھلکی لیکن وہ ضبط کر گئی۔

"خضرا بیٹی!...... اللہ نے تجھے ذہن دیا ہے۔ تیرے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ تُو اپنے لئے راستہ خود بنانا...... جہاں تُو سر اٹھا کر چل سکے۔" استانی جی نے بظاہر عام سے سرسری لہجے میں اسے گہری بات سمجھانے کی کوشش کی۔

خضرا کو ندامت سے پسینہ آ گیا۔ ماں کے بارے میں محلے میں جو چہ میگوئیاں ہوتی تھیں وہ استانی جی سے چھپی نہیں تھیں۔ ٹیوشن پڑھنے والی اس کی ہم عمر لڑکیاں اور ان کے ہمراہ آنے والی ان کی ماؤں کی آنکھیں جو کچھ کہتی تھیں وہ خضرا سے مخفی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ لڑکیاں اس سے راہ و رسم بڑھانے سے کیوں ہچکچاتی ہیں۔ اسی لئے وہ بالکل خاموشی سے استانی جی کے یہاں آتی اور پڑھ کر چپ چاپ واپس چلی جاتی۔

اس وقت بھی استانی جی کی بات کے جواب میں اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ انہوں نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر اس کے ہاتھوں میں دیا اور بولیں۔

"یہ لے خضرا...... اپنے پاس ہونے کی خوشی میں سب کا منہ میٹھا کروا۔"

خضرا نے اٹھ کر وہ ڈبہ ایک ایک کے سامنے رکھتے ہوئے سب کو مٹھائی دی اور استانی جیسے رخصت ہوئی تو وہ بولیں۔

"خضرا جتنی جلدی ہو سکے نئی کتابیں منگوا کر پڑھائی شروع کر دے بیٹی۔ لڑکیوں کا یور علم ہی ہے۔ یہ ان پر بجتا بھی ہے اور برے بھلے وقت میں کام بھی آتا ہے۔"

"جی اچھا......" خضرا نے سعادت مندی سے کہا اور باہر آ گئی۔

گھر کی طرف جانے والی گلی میں اسے موٹر سائیکل کے متوجہ کرنے والے ہارن نے نکایا۔ اس نے غیر ارادی طور پر رخ پھیر کر دیکھا، اس کی دلنشین آنکھوں میں چمک سی ئی۔ اس نے یکبارگی اپنے اندر ایک انبساط آمیز ہیجان محسوس کیا۔ عمار نے مسکرا کر ٹوپی اری اور گردن کو ہلکا سا خم دے کر اسے دور ہی سے آداب کیا۔

خضرا نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟ گلی میں کوئی نہیں ا۔ عمار موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے اس کے پاس آیا اور دبی زبان میں بولا۔

"ذرا اسٹاپ تک آؤ...... تمہارے لئے بہت اچھی خبر ہے۔" وہ اتنا کہہ کر گلی میں یدھا نکل گیا۔

خضرا دھک کرتے دل کے ساتھ سوچنے لگی کہ وہ خوش خبری کیا ہو سکتی ہے؟ عمار نے اس کے لئے کسی ملازمت کا بندوبست کر لیا تھا۔ یہ تصور اس کے من ں خوشی کی ایک پھوار سی بن گیا اور وہ بغیر یہ خیال کئے کہ کوئی اسے دیکھ بھی سکتا ہے، اسی ن میں گلیوں کی بھول بھلیوں میں سے ہوتی ہوئی بس اسٹاپ پر پہنچی۔ عمار پہلے سے اں موجود تھا۔

لوگوں کی نگاہوں سے دور ایک جانب اوٹ لے کر وہ بغیر کسی پس و پیش کے اس ے پیچھے بیٹھ گئی۔ طویل سڑکوں پر موٹر سائیکل اڑنے لگی۔ خضرا نے خوفزدہ ہو کر اس کے انے پر ہاتھ رکھا اور چلائی۔

"کیا کرتے ہو عمار...... پلیز آہستہ چلاؤ ناں......"

عمار نے جواب میں نہ جانے کیا کہا جو تیز ہوا اور شور میں نہ جانے کہاں غائب ہو یا۔ کیونکہ موٹر سائیکل کی رفتار اور بڑھ گئی تھی۔

خضرا نے مضبوطی سے اس کی جیکٹ پکڑ لی۔

"اوہ عمار...... آہستہ کرو...... مجھے ڈر لگ رہا ہے...... پلیز آہستہ چلاؤ...... آہستہ ؤ......" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں مسلسل کہتی چلی گئی۔

عمار نے موٹر سائیکل کی رفتار کم کرتے کرتے بہت آہستہ کر دی اور پیچھے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"میری کمر میں ہاتھ ڈالو اور مضبوطی سے بیٹھ جاؤ۔ آج بہت خوشی کا دن ہے۔"

خضرا نے سٹ کر اپنا ہاتھ بھی اس کے شانے سے ہٹا لیا اور خفگی سے بولی۔

"اچھا خوشی کا دن ہے کہ آپ مجھے ڈرا ڈرا کر مار دیں گے۔"

"خبردار...... خوبصورت چہروں کو خوبصورت باتیں کرنی چاہئیں...... پھر آج تو میں بہت خوش ہوں۔ میں نے ٹینکی پٹرول سے بھروائی ہے اور سو کلومیٹر کی رفتار سے تمہیں سارا شہر گھماؤں گا۔ بھئی میٹرک پاس کر لیا ہے تم نے اور ایک فرسٹ کلاس فرم میں بطور ٹائپسٹ تمہاری تقرری ہو چکی ہے۔" وہ بہت ہلکی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اس کی طرف سر گھما کر بولا۔

"سچ......؟" خضرا کو یقین نہیں آیا۔

"بالکل سچ......!" عمار نے یقین دلایا۔

خضرا کا دل مسرت و شادمانی سے بھر گیا۔ اسے اردگرد کی متحرک دنیا بڑی حسین معلوم ہونے لگی۔ اپنے لئے اس کے اندر کی حقارت پسندیدگی میں بدلنے لگی۔ وہ خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہ...... آپ کا بے حد شکریہ...... میں بہت خوش ہوں......" اس کے چہرے پر مسرت کی گلابی دمک تھی۔

"لگتا تو نہیں کہ تم خوش ہو۔" عمار نے کہا۔

"ایسے ہی میں تو بہت خوش ہوں......" خضرا نے اپنی بات پر زور دیا۔

وہ ہنسا۔ "اچھا...... واقعی خوش ہو...... تو اس کا مطلب ہے کہ تم نکمی اتنی ہو کہ تمہیں خوشی کا اظہار کرنا بھی نہیں آتا۔"

"اور کیسے کروں خوشی کا اظہار......؟" خضرا نے برا مانتے ہوئے کہا۔

عمار نے مسکرا کر پیچھے دیکھا اور شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

"کم از کم مجھ سے لپٹ ہی جاؤ اور میرے کان میں بتاؤ کہ تم خوش ہو۔"

خضرا نے محجوب ہو کر اس کی گردن پر لہراتے بالوں کی مٹھی بھری اور اس کا سر سامنے

طرف موڑتے ہوئے بولی۔

"بس آپ آگے دیکھیں۔"

عمار کا جاندار قہقہہ دور تک گونجتا چلا گیا۔

وہ گھر آئی تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ عمر دراز برآمدے میں ٹرالی سامنے رکھے کھانا کھا رہا ا۔ ماں نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"خضرا...... بہت دیر لگا دی تم نے استانی جی کے یہاں۔"

خضرا بغیر کوئی جواب دیئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"خضرا...... خضرا...... ادھر آؤ......" عمر دراز کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

لیکن نہ جانے آج کیا بات تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اس کے دل کی ڑکنیں بھی نہیں۔ وہ پلٹ کر ایک دو قدم قریب آئی اور صاف لہجے میں بولی۔

"جی......!"

"کہاں تھیں تم......؟" عمر دراز نے نوالہ نگلتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا۔

"استانی جی کی طرف۔" خضرا نے بغیر اٹکے جواب دیا۔

"اتنی دیر وہاں کیا کر رہی تھیں؟" اس نے ٹرالی ایک طرف دھکیلی اور اٹھتے ہوئے

"ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔" خضرا نے گھبراہٹ کے بغیر جھوٹ بولا۔

عمر دراز نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا بازو سختی سے پکڑا اور اسے ایک جھٹکا دیتے ئے ماں کے قریب لا کر دانت پیستے ہوئے بولا۔

"زرینہ مبارک ہو...... تمہاری یہ بیٹی اب بچی چور نہیں رہی۔ ذرا اس کی دیدہ دلیری و، کیسے آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ یہ آج پھر اس لفنگے کے ساتھ موٹر سائیکل وم رہی تھی اور ہمیں بتا رہی ہے کہ استانی جی کے پاس تھی۔"

"خضرا...... میں یہ کیا سن رہی ہوں؟" ماں نے استعجاب آمیز غصے سے کہا۔

خضرا خود بھی حیران رہ گئی کہ اس نے کس طرح سے جھٹکا دے کر عمر دراز سے اپنا بازو ا لیا اور پوری جرأت سے بولی۔

"ہاں...... ٹھیک سن رہی ہیں آپ۔"

"تجھے شرم نہیں آتی خضرا......" ماں بھنا کر چلائی اور اس نے مارنے کے لئے ساختہ ہاتھ اٹھایا۔ خضرا تیزی سے پیچھے ہٹی۔

"مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا امی......" اس نے قطعی لہجے میں سختی سے کہا۔ "یہاں اور کس کا شرم ہے جو مجھے آئے۔" وہ بغیر ان کی طرف دیکھے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ماں دم بخود کھڑی اسے دیکھتی رہی اور عمر دراز کی آواز اس کے پیچھے لپکی۔

"یہ لڑکی نہیں......اس کے پیچھے کوئی اور بول رہا ہے۔"

✿......✿

خضرا کے لئے دفتر کا ماحول نیا اور پریشان کر دینے والا تھا۔ اس میں اعتماد کی کمی تھی اور اس کے اندر کا خوف اردگرد کی ہر شے کو ڈراؤنا سا بنا دیتا تھا۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھیں ہر وقت سراسیمہ سی رہتی تھیں اور وہ یوں ڈری ڈری سی رہتی تھی جیسے کوئی غلط کام ہوگیا ہو۔ عمار کی وجہ سے وہ بغیر کسی انٹرویو کے یہاں ٹائپسٹ تو ہوگئی تھی لیکن اسے خود اس نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی۔

دفتر میں بیشتر عملہ مردوں پر مشتمل تھا۔ جن کی آنکھوں کی بے باکی ہر لمحے جیسے کوئی نہ کوئی سوال پوچھتی رہتی تھی۔ یہاں تین چار لڑکیاں بھی مختلف نشستوں پر کام کرتی تھیں جن میں کچھ تو اتنی ماڈرن تھیں کہ وہ خضرا جیسی سیدھی سادھی لڑکی کے ساتھ راہ و رسم رکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایک کارکن ادھیڑ عمر تھیں جو اکثر اپنے شوہر کے گلے شکوے اور بچوں کی بیماریاں ہی بیان کرتی رہتی تھیں۔ البتہ ٹیلیفون آپریٹر روبی نے اسے اپنائیت کا احساس دلایا تھا۔ وہ اس کی ہم عمر تو نہیں تھی لیکن دوستانہ مزاج رکھتی تھی۔ اس سے علیک سلیک دوستی کی طرف بڑھی تھی۔

ماں نے اس کے سروس کر لینے پر خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید وہ بھی چاہتی تھی کہ وہ عمر دراز کی زیر بار نہ رہے۔ اور پھر اس کی اس روز کی جرأت نے ماں کے رویے کو تبدیل کر دیا تھا۔ اب وہ اس سے محتاط لہجے میں بات کرنے لگی تھی اور بے جا رعب نہیں جماتی تھی۔

عمر دراز بھی اس اطلاع پر خاموش ہی رہا۔ لیکن ایک روز اسے تنہا پا کر اس نے شکوہ کر ہی دیا۔

"خضرا......تم نے سروس کیوں کر لی ہے؟ کیا یہاں تمہیں کوئی کمی تھی؟"

"جی نہیں......لیکن میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں۔" خضرا نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

"میں نے تمہیں کبھی بوجھ نہیں سمجھا۔ پھر تمہیں یہ احساس کیوں ہے؟......" وہ رسان سے کہنے لگا۔ خضرا نے اس کی بات نظر انداز کر کے وہاں سے ٹل جانا چاہا لیکن اس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

"مجھے جانے دیں......" خضرا نے ناپسندیدگی سے اس کا بازو جھٹکا۔

عمر دراز نے غصیلی نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں تمہیں یہ سروس کرنے سے روک بھی سکتا ہوں۔ اگر میں تمہیں اجازت نہ دوں تو میں دیکھتا ہوں کہ تم کس طرح یہ ملازمت کرتی ہو......؟" وہ اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے بولا۔

خضرا کے رگ و پے میں خوف کی سرد کر دینے والی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے نہیں روک سکتے۔"

"اچھا......تو اب تمہیں زبان چلانی بھی آ گئی ہے۔" عمر دراز نے اس کا بازو اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ خضرا کو محسوس ہوا جیسے اس کے شانے کی ہڈی اکھڑ جائے گی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پیچھے کون بولتا ہے۔ تمہیں کس کی شہ ہے۔ تمہارے منہ میں کس کی زبان ہے۔ اُس اُلو کے پٹھے کو تو میں دیکھ لوں گا۔ اور تم...... تمہیں بھی مجھے سیدھا کرنا آتا ہے۔ بہت پر پُرزے نکال لئے ہیں تم نے۔" وہ اسے مسلسل جھٹکے دیتا ہوا دانت کچکچا کر بولا۔ "میں تمہیں روک سکتا ہوں سمجھیں...... میں تمہیں روک سکتا ہوں۔"

خضرا روہانسی ہو کر چلائی۔ "آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے؟"

"بکواس بند کرو۔" عمر دراز کے ایک ہی تھپڑ نے اس کا منہ بند کر دیا۔ "بتاؤں میں تمہیں میں کون ہوتا ہوں...... پوچھو اپنی آوارہ ماں سے جسے میں نے گھر میں رکھا ہوا ہے کہ میں کون ہوں؟...... اور تمہیں بھی پال رہا ہوں، غیر کی اولاد کو۔ ابھی میں کون ہوں۔ یہ نہیں کیا سوچ کر چپ ہوں۔ تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔"

خضرا کا سارا اندر غصے اور ذلت کے احساس سے سلگ رہا تھا۔ وہ اس کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں سے جھانکنے والے درندے نے اسے خوف سے مفلوج سا کر دیا۔ گھر میں اس وقت ماں بھی نہیں تھی۔ اگر وہ کچھ اور کہتی تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ غصہ اور بے بسی اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر رخساروں پر بہنے لگے۔

"اوہو...... روتی کیوں ہو......" عمر دراز نے لہجہ بدل کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

"میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا...... خدا کی قسم میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کروں...... لیکن تم مجھے مجبور کر دیتی ہو...... خوامخواہ غصہ دلا دیتی ہو۔ اچھا چلو معاف کر دو۔ تم سروس کرنے میں خوش ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے بس تمہاری خوشی چاہئے۔"

خضرا نفرت سے اس کے ہاتھ جھٹک کر اس سے علیحدہ ہوئی لیکن ٹھٹھک کر رہ گئی۔ عمر دراز بھی گڑبڑا گیا۔ ماں بڑی عجیب نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ چبانے کے انداز میں رقابت کا تناؤ تھا۔

خضرا کا جی چاہا کہ دوڑ کر ماں کے گلے سے لگ جائے اور اسے سب کچھ بتا دے لیکن اس کے چہرے پر برستی اجنبیت نے اس کی ہمتوں کو پست کر دیا۔ اس کی نگاہوں کی ملامت اسے ایک مجرم کی طرح دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ماں کی بجائے صرف ایک ایسی عورت کا چہرہ تھا جو اپنی رقیب کو سنگسار کر دینا چاہتی تھی۔

عمر دراز بھی کچھ چکرایا لیکن پھر بات بناتے ہوئے بولا۔

"تم کب آئیں زرینہ؟"

"شاید میں غلط وقت پر آ گئی ہوں۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

عمر دراز کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔ "یہ تو تم ہی جانو کہ یہ غلط وقت تھا یا نہیں۔"

ماں نے پھر کوئی زہر میں بجھا ہوا تیر چھوڑا لیکن خضرا اسے سنے بغیر اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں امنڈے چلے آتے تھے اور اسے ہر شے سے گھن آ رہی تھی۔

✿......✿

گھر کی فضا کاٹنے کو دوڑنے لگی۔ ایک ایک لمحہ عذاب ہو گیا تھا۔ ماں کی سرگرمیاں اور اس کی شکوک سے تپتی آنکھیں، عمر دراز کی پیش دستیاں اور اس کی نگاہوں کی بے باکیاں ناقابل برداشت ہو چلی تھیں۔ ملازمت چھٹ جانے کی وجہ سے اسے اپنا آپ ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ زیادہ وقت استانی جی کے یہاں گزارتی۔ اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اس ماحول سے، اس فضا سے، گرد و پیش سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی وہ اس ماحول سے اس فضا سے ہمیشہ کے لئے بہت دور چلی جانا چاہتی تھی جہاں نہ کوئی آشنا ہو نہ شناسا...... جہاں ماں کی بدنامیاں اس کے شفاف آنچل پر دھبے نہ لگا سکیں۔ جہاں عمر دراز کی بری نیت اسے لحظہ لحظہ پگھلاتی نہ رہے۔

اپنے اندر کی کھولتی ہوئی نفرت کی تسکین کے لئے اس نے روبی سے بات کی۔ اسے ساری صورتحال بتائی تو اس نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"خضرا چھوڑ دے اس گھر کو...... اس جگہ کو...... ان لوگوں کو...... تُو میرے ساتھ چل...... ہم وہاں اکٹھے رہیں گے، خوب کمائیں گے اور اپنی پسند کی زندگی گزاریں گے۔"

"لیکن روبی...... یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہے؟" خضرا نے بے چارگی سے کہا۔

"پرواہ نہ کر خضرا...... یہ روبی کس لئے ہے۔ پھر ہم جس کمپنی کے ذریعے جائیں گے وہ ویزے کے ساتھ ٹکٹ بھی دے گی۔ تُو تیاری کر لے۔ مجھے یقین ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" روبی نے وثوق سے کہا۔

"بہت مشکل سی بات لگتی ہے روبی...... مجھے ڈر لگتا ہے...... میں نے ہر طرف اتنا دھوکا، فریب، جھوٹ اور مکاری دیکھی ہے کہ اب مجھے کسی پر اعتبار نہیں آتا۔" خضرا نے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔

"لو...... بھلا ہم یوں ہی تو نہیں چل پڑیں گے۔ پورا اطمینان کر کے جائیں گے۔ خضرا تمہارا ساتھ ہونے سے مجھے بڑا آسرا رہے گا۔ ہم اکٹھے رہیں گے۔" روبی نے جیسے تصور ہی تصور میں مستقبل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں گل نواز سے بات کروں گی کہ وہ تمہارے لئے بھی ویزے کا انتظام کر دے۔ وہ میری بات نہیں ٹالے گا۔"

"یہ گل نواز کون ہے؟" خضرا نے استفسار کیا۔

روبی کے خوبصورت لبوں پر ایک دلآویز تبسم چمکا۔

"وہ ریکروٹنگ ایجنٹ ہے۔"

"ریکروٹنگ ایجنٹ ہے یا کچھ اور بھی ہے......؟" خضرا نے اس کے رخساروں میں جھلکتی ہوئی گلابی رنگت کو پہچان کر کہا۔

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" روبی کا لہجہ صاف چغلی کھا رہا تھا کہ ایسی بات ہے۔

"پھر تو وہ ویزے کا انتظام نہیں کرے گا۔" خضرا کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"کیوں......؟" روبی حیران ہوئی۔

"اس کا دل کیسے مانے گا کہ تم اس سے اتنی دور چلی جاؤ؟" خضرا نے شرارت آمیز لہجے میں اسے چھیڑا۔

روبی محجوب سی ہو کر ہنس پڑی۔ چند لمحے کسی تصور میں کھوئی رہی پھر پُر خیال لہجے میں بولی۔

"خضرا...... میں نے بہت غریبی، بہت تنگی، بہت محرومی دیکھی ہے۔ میں اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جب میں ایک نئی زندگی شروع کروں تو میرے پاس ہر آسائش ہو۔ گل نواز بھی یہی کہتا ہے۔ ہم دونوں نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے کہ ہم اسی وقت ایک گھر بنائیں گے جب ہم اس کے لئے تمام آسائش خریدنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یوں روتے بسورتے زندگی گزارنے کا کیا مزہ؟" اس کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

"اچھا...... تو یہ بات ہے۔ اور اتنی آگے جا چکی ہے۔ اور تم نے کبھی مجھے بتایا ہی نہیں۔" خضرا نے اس کے رخسار پر چٹکی لے کر کہا۔

"اب جو بتا دیا ہے۔ میں کسی دن تمہیں اس سے ملوانے لے جاؤں گی۔ تم اسے دیکھنا وہ کتنا اچھا ہے۔" اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور محبت کا اعتبار اس کے چہرے کی دلکشی بن گیا۔

......

خضرا کو بس اسٹاپ پر کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے قریب ہی موٹر بائیک کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ اس نے غیر ارادی طور پر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ عمار فٹ پاتھ پر

یک پاؤں ٹکائے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے اسے آنے و کہا۔ خضرا نے سر ہلا کر رخ پھیر لیا۔

وہ اس کی آنکھوں سے خود کو دیکھ چکی تھی۔ وہ اس کے دل میں اپنا مقام جان چکی تھی۔ ہ اس کے لئے وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اسے موٹر سائیکل اسٹارٹ نے کی آواز سنائی دی۔ اسے اطمینان ہوا کہ وہ مایوس ہو کر جا رہا ہے۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس کا موٹر سائیکل بالکل اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے اس کا بازو ہلا کر اسے متوجہ کیا اور نسبتاً بلند آواز میں بولا۔

"اوہو، بھئی آخر ایسا کیا غضب ہو گیا ہے۔ صرف آدھا گھنٹہ ہی دیر ہوئی ہے نا۔"

وہ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا قریبی عزیز ہے۔ اس کی اس جرأت نے خضرا کو اس کے پیچھے خاموشی سے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

لی سڑک پر موٹر سائیکل مدھم رفتار سے چلاتے ہوئے وہ ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے

"خضرا تم تو مجھ سے بالکل ہی ناراض ہو گئی ہو۔ کہیں نظر ہی نہیں آتیں۔ بہت دنوں سے تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

"کیوں......؟" خضرا نے روکھائی سے پوچھا۔

"اس میں کیوں کا کیا سوال...... بھلا ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کوئی وجہ ہونا ی ضروری ہے؟" موٹر سائیکل کے چھوٹے آئینے میں سے اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

خضرا نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے اس کے کان کے قریب کہا۔

"آپ مجھے گھر چھوڑ دیں...... آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"اور اگر میں یہ مہربانی نہ کروں تو؟" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"تو پھر مجھے یہیں اتار دیں......" خضرا نے برجستہ مطالبہ کیا۔

"اور اگر میں یہ بھی نہ کروں تو؟" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو مجھے چھلانگ لگانی پڑے گی۔" خضرا نے اپنے ہاتھ سے اس کے شانے پر دباؤ

"بڑے شوق سے...... اپنی ہی ٹانگیں تڑواؤ گی۔" اس نے چہرہ ایک جانب جھکا کر

اپنے شانے پر رکھے ہوئے اس کے ملائم ہاتھ کو رخسار تلے دبا لیا اور موٹر سائیکل کی رفتار یکدم پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی۔ خضرا نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچا اور خفگی سے بولی۔

''آہستہ چلائیں ناں......''

عمار نے نہ جواب دیا نہ موٹر سائیکل کی رفتار ہی کم کی۔ موٹر سائیکل کے چھوٹے آئینے میں اس کی تیوری چڑھی دکھائی دیتی رہی۔ خضرا کے لئے مجبوراً خاموش رہنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ موٹر سائیکل کی غیر معمولی رفتار سے اسے خوف آ رہا تھا۔ اپنا توازن برقرار رکھنے کو اسے بار بار اس کی جیکٹ تھامنی پڑ رہی تھی۔ اونچی نیچی سڑک پر لگنے والے جھٹکوں سے وہ کئی بار اس سے ٹکرائی اور کئی بار گرتے گرتے بچی۔

''آہستہ چلائیں...... پلیز آہستہ چلائیں......'' وہ اس کے دونوں شانوں کو جھنجھوڑتی ہوئی چیخی لیکن عمار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ خضرا خوفزدہ سی اس کے پیچھے دبکی رہی۔

ایک دور دراز نسبتاً کم آباد علاقے کے نامکمل گھر کے سامنے اس نے یکدم بریک لگائے۔ موٹر سائیکل شدید جھٹکے سے رکی تو خضرا بڑے زور سے عمار کی پشت سے ٹکرائی۔

عمار موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر کے اس کی طرف پلٹا۔

''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟''

''اپنے غریب خانے پر...... اور کہاں...... آج کل یہاں ڈیرہ لگایا ہوا ہے۔ اس ناہنجار مالک مکان نے زبردستی کمرہ خالی کروا لیا۔'' وہ موٹر سائیکل لاک کرتے ہوئے بولا۔

''چلو آؤ......'' اس نے بے کواڑ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دراصل یہ اپنے ایک جاگیردار دوست کی کوٹھی بن رہی ہے۔ جب تک بنتی رہے گی ہم یہاں ٹھاٹھ سے قیام فرمائیں گے۔ اس لئے آپ بے فکر ہو کر اندر تشریف لے آئیں...... شکریہ۔''

''نہیں...... مجھے دیر ہو جائے گی۔ آپ مجھے چھوڑ کر آئیں۔'' خضرا نے ناگواری سے کہا۔

''کوئی دیر وغیرہ نہیں ہو گی۔ تم چلو تو سہی۔'' وہ اس کا بازو تھام کر اسے زبردستی اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

''کیا مصیبت ہے......'' خضرا نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ''کہہ رہی ہوں کہ مجھے دیر ہو

جائے گی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں کافی دیر کی گھر سے نکلی ہوئی ہوں۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

عمار نے اپنی جیب سے موٹر سائیکل کی چابی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولا۔

''یہ لو...... تم موٹر سائیکل لے جاؤ۔ کہیں تمہیں دیر نہ ہو جائے۔''

خضرا چڑ گئی۔ ''آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟''

عمار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ملائمت سے بولا۔

''خضرا...... میں تمہیں تنگ نہیں کر رہا اور تم اندر چل کر آرام سے بیٹھو تو سہی۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہارے لئے ایک جاب تلاش کی ہے اور تم ہو کہ اس کا موقع ہی نہیں دے رہیں۔ مجھے لگتا ہے تم مجھ سے بہت بدگمان ہو۔''

خضرا بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گئی۔ بے پلستر کے کمرے میں ابھی تک کھڑکیاں دروازے بھی نہیں لگے تھے۔ یہیں عمار نے اپنا سارا تام جھام جمایا ہوا تھا۔ اس نے کرسی کھینچ کر اسے بٹھایا اور خود لکڑی کے ایک بکس پر بیٹھ گیا۔

''چائے بناؤں......؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ......'' خضرا نے انکار کر دیا۔

''اس کا مطلب ہے ابھی ناراضگی دور نہیں ہوئی۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا اور آہستگی سے بولا۔ ''اچھا بھئی...... تمہاری مرضی۔''

خضرا اسی طرح چپ بیٹھی رہی تو اس نے خود ہی پہل کی۔

''خضرا...... میں نے تمہاری سروس کے لئے ایک جگہ بات کی ہے۔ کام تقریباً پکا ہی سمجھو۔ بس تمہیں انٹرویو دینا پڑے گا۔ لیکن گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ یہ یونہی فارمیلٹی ہے۔''

''آپ نے بڑی زحمت کی۔'' خضرا نے دبی زبان سے کہا۔ ''لیکن اب میں ایسا کوئی جاب نہیں کروں گی۔ پہلا تجربہ ہی بہت کافی ہے۔''

''اوہو خضرا...... تم تو یونہی ہمت ہار بیٹھی ہو۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور پھر جاب تو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں اپنے پیروں

پر کھڑا ہونا ہے۔ ابھی سے چھپ کر بیٹھ جاؤ گی تو دنیا سے مقابلہ کس طرح کرو گی؟'' وہ اسے سمجھانے لگا۔

خضرا بے چینی سے اپنی انگلیاں مسلتی رہی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ روبی نے اسے جو نیا راستہ سمجھایا تھا اس نے اس کے دل میں ایک نئی جوت جگا دی تھی۔ وہ اس ماحول سے اوب گئی تھی۔ یہاں جو دنیا اس کے چاروں طرف تھی اس سے مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ وہ فرار چاہتی تھی۔ ان سارے اذیت ناک رشتوں اور ان کے ساتھ وابستہ تہمتوں کو اپنی زندگی سے نکال پھینکنا چاہتی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر عمار کی طرف دیکھا اور قطعی لہجے میں بولی۔

''اب میں کسی دفتر میں جاب نہیں کروں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''تمہاری مرضی ہے...... ویسے میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ چانس نہیں گنوانا چاہئے۔ سب لوگ ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔'' عمار نے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

خضرا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیر ہو گئی ہے...... بس اب آپ مجھے چھوڑ آیئے۔''

''خضرا تم نے چائے بھی نہیں پی۔'' عمار نے کہا۔

''پھر کبھی سہی۔'' خضرا نے رسمی انداز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

عمار چند قدم قریب آیا اور اس کے شانوں کے گرد بازو لپیٹ کر اس کا رخ اپنی جانب پھیر لیا۔

''خضرا...... کچھ دیر تو رک جاؤ...... تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

خضرا کانپ گئی۔ اسے اس کی آنکھیں عمر دراز کی آنکھیں معلوم ہوئیں۔ وہ گھبرا کر اسکے بازو کی لپیٹ سے نکلی اور تقریباً دوڑ کر بے کواڑوں کے دروازے میں سے باہر آ گئی۔ وہ وہاں بھی نہیں رکی۔ تعمیرات کے بکھرے ہوئے سامان، سیمنٹ، کی بوریوں، اینٹوں کے ٹکڑوں اور بجری کے ڈھیروں کو پھلانگتی وہ عمارت سے باہر نکل کر درخت کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی جہاں عمار نے موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔

عمار بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''خضرا...... خضرا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے پاس آ کر بڑی حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس آپ مجھے چھوڑ آئیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' وہ مدھم سے لہجے ں بولی۔

عمار چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

راستہ خاموشی سے کٹتا رہا۔ نہ خضرا نے کوئی بات کی اور نہ عمار نے ہی مخاطب کیا۔ لہ کافی تھا اسی لئے سفر کچھ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ خاموشی اور تناؤ نے اسے اکتاہٹ سے دیا تھا۔

شہر کی رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ عمار نے موٹر سائیکل ایک پٹرول پمپ پر ا۔ جتنی دیر وہ پٹرول ڈلواتا رہا خضرا کچھ دور کھڑی رہی۔ وہ فارغ ہو کر خضرا کے قریب اور خضرا ابھی اس کے پیچھے بیٹھ ہی رہی تھی کہ پٹرول پمپ میں ایک چھوٹی سی کار ل ہوئی اور سیدھی ان کے پاس آن رکی۔

''ہیلو عمار......!'' اسٹیئرنگ پر بیٹھی ہوئی ایک ماڈرن لڑکی نے عمار کو مخاطب کیا۔

عمار بری طرح گڑبڑایا اور بوکھلا کر کہا۔ ''ہیلو تارا...... کیا حال ہے؟''

سیاہ قیمتی چشمے سے جھانکتی ہوئی خوبصورت آنکھوں کا تنقیدی زاویہ خضرا کے سراپے کو نے لگا۔ اس نے ابرو اچکائے اور عمار سے بولی۔

''بڑے ٹھاٹھ ہیں۔''

عمار یوں سٹپٹایا ہوا معلوم ہو رہا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ وہ جھینپے ئے انداز میں جلدی سے موٹر سائیکل پر سے اترا اور کار کی کھڑکی میں سے جھانک کر کے ساتھ اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے اپنی صفائی پیش کر رہا ہو۔ اس نے شاید اس ات سننے سے انکار کر دیا اور گاڑی بڑھا کر لے گئی۔

عمار گاڑی کے جھٹکے سے بچنے کے لئے اچھل کر پیچھے ہٹا اور چند لمحے کھڑا گاڑی کو ل پمپ کے احاطے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا پھر کچھ متاسف، کچھ الجھا ہوا ں آیا۔

خضرا اپنے آپ میں ہی خجل ہو رہی تھی۔ اسے بے طرح اپنی توہین کا احساس ہوا۔ کے لئے اس نے کوئی جذبہ تو اپنے دل میں نہیں جگایا تھا لیکن پھر بھی اس کے

التفات میں ایک انجانی تسکین کا سامان تھا۔ کبھی کبھی اس کی والہانہ چاہتوں پر یقین کر لینے کو بھی جی چاہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا لگاؤ دل کا آسرا ہو جاتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اسے دجل کی طرح فریب کار اور دغاباز معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی ہی نگاہوں میں حقیر ہوئی جاتی تھی۔ وہ اس صورت حال میں یوں پشیمان سی کھڑی تھی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

عمار متغیر چہرے کے ساتھ قریب آیا اور بغیر کچھ کہے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بے حد الجھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ خضرا چپ کھڑی رہی۔ نہ اس نے کچھ پوچھا نہ عمار نے ہی کوئی وضاحت کی۔ موٹر بائیک پر بیٹھتے ہوئے اس نے چہرہ خضرا کی طرف گھما کر کہا۔

''آؤ بیٹھو۔''

''نہیں...... مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔'' غیر ارادی طور پر خضرا کے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

''کیا ہو گیا ہے خضرا...... آؤ نا۔'' اس کے انداز میں ہلکی سی جھلاہٹ تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے اس کا ذہن کہیں اور ہے۔

''بہت کچھ ہوا ہے...... آپ کے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔'' خضرا نے درشتی سے کہا اور پیدل ہی چل پڑی۔

وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے اس کے پیچھے آیا اور جھنجلا کر بولا۔

''کیا فضول ضد ہے خضرا...... چلو بیٹھو۔''

خضرا ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی اور قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو ٹھہرا کر اس میں بیٹھ گئی۔

✿......✿

اسی ہفتے روبی استانی جی کے یہاں اس سے ملنے آئی۔ خضرا نے کبھی کسی کو گھر نہیں بلایا تھا۔ اس کا گھر، گھر تھا ہی کہاں جو وہ کسی کو مدعو کر لیتی۔

روبی مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے خوشی سے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان بولی۔

''خضرا...... کام بن گیا ہے۔''

''سچ مچ......؟'' خضرا کو یقین نہیں آیا۔

''بالکل سچ...... گل نواز کل خود گھر پر آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ دونوں ویزوں کا نظام ہو گیا ہے۔ جو پچیس ویزے آئے ہیں کچھ نرسیں اور کچھ اسٹینو بھی جا رہی ہیں۔ اور ب کی سب لڑکیاں۔ سارا گروپ اکٹھا جائے گا اس ہفتے۔ بس تو تیاری مکمل کر اور گھر الوں کو پہلے سے بتا دے۔ ایسا نہ ہو کہ عین موقعے پر کوئی......'' وہ جوش اور مسرت سے یک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

''مجھے ڈر سا لگتا ہے روبی...... کہیں کوئی فراڈ نہ ہو۔'' خضرا نے اپنے اندیشوں کا ظہار کیا۔

''نہیں خضرا...... گل نواز ایسا نہیں ہے۔ مجھے خود سے بھی زیادہ اس پر اعتبار ہے...... ر تو......'' اس نے گلابی لب کا اک گوشہ دانتوں تلے دبا لیا اور آنکھوں کے اعتماد سے ت مکمل کی۔

''خضرا...... خضرا! یہ تم کیا کھڑی کھڑی باتوں میں لگی ہوئی ہو۔ اپنی سہیلی کو یہاں لے ؤ نا۔ بٹھاؤ اسے......'' استانی جی نے انہیں کھڑے دیکھ کر پکارا۔

''جی اچھا...... آ رہی ہوں......'' خضرا نے جلدی سے جواب دیا اور روبی سے بولی۔ آؤ روبی بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

''نہیں...... اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آگئی تھی ہ کل انٹرویو ہے شام پانچ بجے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گل نواز کہہ رہا تھا کہ وہ ب کچھ سنبھال لے گا۔ تم میرے گھر آ جانا، اکٹھے چلیں گے۔'' اس نے جلدی جلدی یا۔

''کس قسم کا انٹرویو ہے یہ؟'' خضرا نے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں...... گل نواز کہہ رہا تھا کہ کمپنی والے ذرا اپنا اطمینان کرنا چاہتے ے۔ پھر اخبار میں بھی تو اشتہار دینا پڑتا ہے نا۔ اس لئے یہ بوگس انٹرویو بھی ہوتے ں۔ لیکن ہمیں کیا پرواہ ہے...... ہم نے تو جانا ہی جانا ہے۔'' روبی نے اطمینان دلایا۔ اور دیکھو تم چار بجے تک میری طرف پہنچ جانا اچھا، یاد سے۔'' روبی اسے تاکید کرتی ہوئی احافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔

وہ رات خضرا نے خواب بُنتے گزاری۔ سپنوں کو سنوارتے، نئی زندگی کے تصورات میں رنگ بھرتے۔ وہ خود سے باتیں کرتی رہی۔ امید کا ایک چراغ روشن ہو گیا تھا، اس کی کلیاں چٹکنے لگی تھیں۔ ناپسندیدہ لوگوں اور مسموم فضا سے نکلنے کا ایک راستہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ گننے لگی کہ اس موہوم امید کو یقین میں بدل سکے۔ دور سے اپنی جھلک دکھانے والی منزل کا سراغ پا سکے۔

اگلے روز وہ روبی کے ساتھ مطلوبہ پتے پر پہنچی تو کچھ گھبرا رہی تھی۔ لیکن روبی بالکل مطمئن تھی۔ وہ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان کا کام بن جائے گا۔

ایک ہوٹل کے سامنے ان کا رکشہ رکا تو روبی نے اسے بتایا کہ کمپنی نے اپنا عارضی دفتر یہاں قائم کیا ہے۔ یہیں پر تمام انٹرویو ہوں گے۔

خضرا ہوٹل کی شان و شوکت دیکھ کر مرعوب ہوئی اور روبی کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"ہائے روبی...... میرا تو حلق خشک ہو رہا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں...... انٹرویو سے پہلے تمہیں کولڈ ڈرنک پلائیں گے۔ گل نواز کاؤنٹر پر ہی ہو گا۔" روبی نے بے فکری سے اسے تسلی دی۔ دربان نے دروازہ کھولا اور وہ اس کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ کاؤنٹر پر ریسپشنسٹ کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔

خضرا نے روبی کو ٹہوکا دیا۔ "گل نواز کہیں نظر آیا؟"

"فی الحال تو نظر نہیں آ رہا۔" روبی نے متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ہو گا؟" خضرا فکر مند ہوئی۔

"ہونا کیا ہے...... کاؤنٹر سے اس کے کمرے میں فون کر کے اسے بلوا لیں گے۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔ اور وہ نہ بھی ملا تو کوئی ہمیں پکڑ کر بٹھا نہیں لے گا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ خضرا کو بھی اطمینان ہوا۔ روبی کاؤنٹر کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اس کی نگاہ ہال میں اترنے والے زینے پر پڑی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ خوشی سے چہکی۔

"اوہ...... گل نواز آ گیا ہے...... وہ دیکھو زینے پر۔"

خضرا نے اس کی نگاہ کے تعاقب میں دیکھا اور ساکت سی ہو کر دیکھتی کی دیکھتی رہ

گئی۔ اس کی تمام حسیں جیسے آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔

وہ پہلے کی نسبت کافی لمبا، وجیہہ اور خوبصورت ہو گیا تھا...... لیکن وہ اسے بخوبی پہچان سکتی تھی...... وہ تو اسے ہزاروں چہروں میں سے بھی شناخت کر سکتی تھی...... وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اس کا نام لیتی ہوئی وہیں کھڑی رہ گئی۔

روبی چند قدم آگے بڑھی۔ گل نواز زینہ طے کر کے نیچے آیا اور روبی کے ساتھ خوش دلی سے ملا۔ خضرا ابھی تک ٹھٹھک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ روبی اس کے ہمراہ اس کی طرف بڑھی اور گل نواز نے بھی خضرا پر نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ سے نگاہ ملتے ہی خضرا بے ساختہ آگے بڑھی۔

"خرم...... خرم...... تُو کہاں چلا گیا تھا؟"

بے تابی سے کہتے ہوئے خضرا نے اس کے گلے سے لگ جانا چاہا لیکن اس نے فوراً ہی اس کا بازو پکڑ کر اسے دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

"آپی! یہ تم یہاں کہاں آ گئی ہو؟......" یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے دیکھ کر سخت گھبرا گیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلتا ہوا اسے ہوٹل سے باہر لے گیا۔ روبی بھی کچھ حیران کچھ الجھی ہوئی سی ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"بس اب فوراً چلی جاؤ یہاں سے اور آئندہ اس طرف کبھی مت آنا۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا تیزی سے بولا۔

خضرا کی آنکھوں سے آنسو آپ سے آپ بہے جا رہے تھے۔ اس نے پریشانی سے اس کی آستین گھسیٹ لی۔

"خرم کیا ہو گیا ہے تمہیں...... بتاتے کیوں نہیں کہ تم کہاں چلے گئے تھے۔ تم نے کوئی خبر تک نہیں لی۔ میں تمہارے لئے اتنی پریشان تھی۔" وہ ایک ہی سانس میں کہتی گئی۔

خرم نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ اِدھر اُدھر یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی کے دیکھ لینے کا خوف ہو۔ وہ اسے تقریباً کھینچتا ہوا ہوٹل کی عقبی گلی میں لے گیا جہاں آمد و رفت بہت کم تھی۔ وہ عجلت میں بولا۔

"خضرا آپی...... تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ سارا فراڈ ہے۔ ایسے ہی چکر چلایا ہوا

ہے۔ میری بات دھیان سے سنو، میں تمہیں پھر کہہ رہا ہوں کہ اب کبھی یہاں مت آنا۔ شکر ہے میں نے تمہیں باہر ہی دیکھ لیا ورنہ......" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری ہی چھوڑ کر چلنے لگا۔ خضرا نے اس کا دامن پکڑا۔

"خرم...... کہاں جا رہے ہو تم؟...... کچھ بتاؤ تو سہی...... یہاں کیا ہو رہا ہے...... تمہارا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے...... بتاؤ خرم...... بتاؤ!"

خرم کو مجبوراً پلٹ آنا پڑا۔

"مجھے چمن اپنے ساتھ لے گیا تھا آپی! یہ سارا چکر اسی نے چلایا ہوا ہے۔ میں ان لوگوں کے جال میں اس طرح پھنس گیا ہوں کہ اب مر کر ہی نکل سکوں گا۔ میں نے انہیں گھر کا، تمہارا کچھ پتہ نہیں چلنے دیا۔ بس اب تم جاؤ۔ کہیں وہ لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھ ہی نہ لیں۔" وہ افراتفری میں پھر چلنے لگا۔

"کبھی ملو گے خرم......؟" خضرا نے آنسو بھری آنکھوں سے پوچھا۔

"اللہ جانے......" وہ اتنا کہہ کر دوڑتا ہوا ایک دوسری گلی میں گھس گیا۔

خضرا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب سا امنڈ آیا...... وہ دم بخود کھڑی اس رستے کی طرف دیکھتی رہی جہاں ابھی ابھی خرم اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا تھا۔

روبی نے اس کا شانہ ہلایا تو اس نے چونک کر روبی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ویسا ہی جل تھل کا سماں تھا جیسا ساون اس کی اپنی آنکھوں میں امنڈا ہوا تھا۔ اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"روبی! یہ میرا بچھڑا ہوا بھائی خرم تھا۔"

"خضرا! یہی میرا گل نواز بھی تھا۔" روبی نے ایک دل شکن حسرت سے کہہ کر سر جھکا لیا۔

وہ غم سے نڈھال بوجھل قدموں سے گھر پہنچی تو اس کا دل رنج سے پھٹا جا رہا تھا۔ خرم سے اس کی ملاقات نے اس کی امیدوں کے سارے چراغ ایک پھونک سے بجھا دیئے تھے۔ اسے ساری دنیا سے وحشت ہو رہی تھی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا تھا جو اس کے رگ و پے میں زہر کی طرح سرایت کر رہا تھا۔ خرم سے جدائی کا زخم پھر ہرا ہو گیا تھا۔ اب تو اس سے ملنے کی آس ہی دم

ڑ گئی تھی۔ اس کی پریشانی اور تفکرات میں اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ زینہ چڑھ کر اوپر آئی تو عمر دراز حسب معمول برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ضرا سلام کر کے آگے بڑھ گئی۔

"کہاں سے آ رہی ہو خضرا اس وقت؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"ایک سہیلی کی طرف گئی تھی۔" خضرا نے لاتعلقی سے جواب دے کر آگے بڑھ جانا ہا۔

"سنا ہے تمہیں نوکری سے جواب مل گیا ہے۔" اس نے بے موقع سوال کیا۔

خضرا بے حد بیزار ہوئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اسے جواب دینا پڑا۔

"میں نے استعفیٰ دے دیا۔"

"کیوں......؟" اس نے دلچسپی سے استفسار کیا۔

"ماحول کچھ ٹھیک نہیں تھا۔" خضرا نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ کرسی سے اٹھا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اس نوکری کے جھنجھٹ میں نہ پڑو۔ آرام سے لج میں داخلہ لے لو۔ لیکن تم نے پرواہ ہی نہیں کی۔"

"میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔" خضرا نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"کون کہتا ہے کہ تم بوجھ ہو۔ بولو، میں نے کبھی ایسا سمجھا ہے، کبھی احساس دلایا ہے ہیں؟" وہ چند قدم قریب آ کر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے۔" وہ اس کی طرف بڑھا۔ "تمہیں معلوم نہیں ہو گا تو ے معلوم ہو گا۔ میں نے تو پتہ نہیں تمہارے لئے کیا سوچ رکھا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ گھر میں تمہارا کیا مقام ہے؟" اس کا لہجہ معنی خیز ہوا۔

خضرا الجھ کر پیچھے ہٹی اور اس کے اندر کا دکھ تلخی اور ناآسودگی یک بہ یک ایک لاوا سا ر پھوٹ پڑی۔

"نہیں ضرورت ہے مجھے معلوم کرنے کی، نہیں ہے...... بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا یہ ر۔ مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا۔ سب کمینے اور ذلیل

ہیں..... سب ذلیل ہیں.....سب.....!''

''کیا ہو گیا ہے خضرا تمہیں؟'' عمر دراز نے اسے خاموش کروانے کو ایک جھٹکا دیا۔ لیکن وہ ہسٹریائی انداز میں چیختی چلی گئی۔

''میں پاگل ہو گئی ہوں..... میرا دماغ پھر گیا ہے.....تم نے مجھے پاگل کیا ہے... تم نے میری ماں چھینی ہے.....تم نے میرا بھائی چھینا ہے.....تم نے ہمارا گھر برباد کر دیا ہے۔تم درندے ہو.....تم حیوان ہو..... میں تم سے نفرت کرتی ہوں کمینے..... مجھے تمہاری گندی نظروں نے زندہ درگور کر دیا ہے۔تم نے میری زندگی عذاب بنا دی ہے..... میں تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں، تمہارے گھر پر تھوکتی ہوں۔''

تیزی سے زینہ اترتی ہوئی ماں چھت سے نیچے آئی۔

''کیا ہو رہا ہے..... یہ کیا شور ہے..... خضرا کو کیا ہوا ہے.....؟'' وہ پریشانی سے اس کی طرف بڑھی۔''خضرا..... خضرا..... ہوش کرو..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟..... ہوش کرو بیٹی۔''

''چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو.....'' خضرا دیوانگی سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے چلائی۔

''تم ماں نہیں ہو.....تم ڈائن ہو..... آوارہ عورت.....تم نے ہماری زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔تم نے ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا.....تم نے ہمارا گھر اجاڑا ہے.....تم نے باپ کو گھر سے نکالا کہ اس درندے کو گھر میں لا سکو.....تم نے ہمارے لئے زندگی میں کچھ نہیں رہنے دیا.....تم ماں نہیں ڈائن ہو.....تم اپنے ہی بچوں کو کھانے والی ناگن ہو۔'' وہ منہ سے کف گراتے ہوئے زہر اگلنے لگی۔

عمر دراز نے دانت پیستے ہوئے اس کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹ کر اندر پلنگ پر زور سے پٹخ دیا۔

''بند کرو اپنی یہ بکواس..... اگر تم نے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔'' وہ قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

لیکن خضرا اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھی اور کمرے کی چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹختے ہوئے چیخی۔

''کھینچ لو میری زبان..... گھونٹ دو میرا گلا..... میں جینا نہیں چاہتی۔ میں اس طرح

جینا نہیں چاہتی۔تم آوارہ، کمینے، بدمعاش.....تم نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ تمہاری بری نیت نے مجھے مار دیا ہے۔ میں اب چپ نہیں رہوں گی۔ میں سب کو بتاؤں گی کہ تم میرے باپ کی جگہ ہو کر.....''

یہ بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔عمر دراز نے آگے بڑھ کر اس کے بال کھسوٹے اور تین چار زوردار تھپڑ پے در پے لگائے۔خضرا پاگلوں کی طرح چیخنے اور ہاتھ پیر مارنے لگی۔اس نے عمر دراز کا گریبان پھاڑ دیا، اس کا منہ نوچ لیا اور اپنا آپ اس سے چھڑانے کو اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔

عمر دراز نے پورے زور سے اسے اٹھا کر فرش پر پھینکا اور ایک ٹھوکر لگائی۔ ماں دہائی دیتی ہوئی دوڑی اور عمر دراز کو دھکا دے کر دوسری ٹھوکر لگانے سے روکنے کی کوشش کی۔لیکن وہ ایک مرتبہ پھر اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ مار چکا تھا۔

ماں حواس باختہ ہو کر عمر دراز کو روکنے لگی۔

''خدا کے لئے بس کرو.....اس کی جان لے کر چھوڑو گے؟'' وہ آگے بڑھ کر خضرا پر الرسی پڑی تا کہ عمر دراز اسے کچھ اور نہ کہہ سکے۔خضرا نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے سارے جسم پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔

ماں گھبرا کر عمر دراز کو کوسنے لگی جو ابھی تک کھڑا پھنکار رہا تھا۔

''تم جلادوں سے بھی بدتر ہو..... ہائے میری پھول سی بچی کا کیا حال کر دیا..... آخر ایسا کیا کہہ دیا تھا اس نے جو تم دیوانے ہو گئے تھے۔ خدا نہ کرے اس کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔''

''زیادہ بکواس نہ کرو..... پانی کے دو چھینٹے مارو۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ رعونت سے بولا۔

ماں بدحواس سی ہو کر خضرا کے گال تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ اسی طرح بے سدھ پڑی رہی۔ وہ پریشان ہو کر عمر دراز کی طرف متوجہ ہوئی۔

''خدا کے لئے کچھ کرو..... دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے..... اسے اٹھا کر پلنگ پر تو ڈالو

......کسی ڈاکٹر کو بلاؤ......لڑکی تو مر رہی ہے۔"

"خوامخواہ جان نہ کھاؤ میری...... کچھ نہیں ہوا اسے...... مکر کر رہی ہے...... پانی لے کر آؤ۔ ابھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔" وہ اکھڑ پنے سے بولا۔

ماں دوڑ کر پانی لے آئی۔ عمر دراز نے دو تین چھینٹے خضرا کے منہ پر دیئے تو اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ ماں اس کی پیشانی بار بار چوم کر کہہ رہی تھی۔

"خضرا...... خضرا...... ہوش کر بیٹی...... ہوش کر۔"

✿......✿

خضرا کی ذہنی حالت ٹھیک ہوتے ہوتے دو تین دن لگ گئے۔ اس دوران ماں اس سے قریب رہی۔ بار بار اس کی طبیعت کا پوچھتی رہی لیکن خضرا کو اس کی یہ توجہ، یہ محبت اور التفات مصنوعی سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب بھی قریب آتی، کوئی بات کرتی تو اسے محسوس ہوتا جیسے دکھاوا کر رہی ہے۔ وہ اس کے لئے فکر مندی کا اظہار کرتی تو اسے لگتا کہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ اس کی توجہ سے اسے چڑ سی ہونے لگی۔ اس کی ممتا کے اظہار سے اسے گھن آتی۔ اس کی محبت اس کے لئے کراہت بن گئی۔

جیسے جیسے اسے خرم کا خیال آتا، وہ گھر کو باپ سے خالی دیکھتی، عمر دراز کا نفرت انگیز وجود اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان سا بپا ہو جاتا۔ اس کے روئیں روئیں میں نفرت کا زہر گھل جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ ماں کی صورت کبھی نہ دیکھے۔ وہی تو ان حالات، ان محرومیوں کی ذمہ دار تھی۔ وہ اس ماحول سے، اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے نکل جانا چاہتی تھی جہاں ہر طرف ماں کا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ جہاں ہر جانب سے عمر دراز کی مکروہ آواز سنائی دیتی تھی۔

اسے بستر پر پڑے نہ جانے کتنے دن ہو چلے تھے۔ عمر دراز نے ایک بار بھی کمرے میں نہیں جھانکا تھا۔ وہ خود بھی اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے دل میں پرورش پانے والی نفرت میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی کہ ایک روز وہ اچانک اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کی ماں بھی تھی۔ خضرا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"کیا حال ہے تمہارا...... اب ٹھیک ہو نا......؟" وہ دوسری طرف بیٹھتا ہوا بولا۔

"بھئی تمہاری ماں تو مجھ سے سخت ناراض ہے کہ میں نے اس روز تم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

مجھے خود بھی اس کا بہت افسوس ہے مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر میں تم پر ہاتھ نہ اٹھاتا تو تمہارے ذہن کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ دماغ پر زور پڑنے کی وجہ سے خدانخواستہ برین ہیمرج ہو سکتا تھا۔ مجھے مجبوراً تم پر ہاتھ اٹھانا پڑا ورنہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے تو ابھی تک اس کا افسوس ہے۔ مگر اس میں تمہاری ہی بھلائی تھی۔ پر تمہاری ماں مانتی ہی نہیں۔ بھئی کچھ تم ہی سمجھاؤ اس کو۔"

وہ اتنے ہلکے پھلکے انداز میں بولا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

خضرا اپنے اندر کھولتی ہوئی نفرت کو دباتی بالکل چپ رہی۔ عمر دراز نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اچھا بس...... اب بستر کو چھوڑو نکلو اپنے کمرے سے۔ آج ٹھیکیدار صاحب نے دعوت کی ہے۔ تمہاری ماں اور تمہیں دونوں کو بلایا ہے۔ بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" خضرا نے درشتی سے کہا۔

"لو بھلا، کیوں نہیں جاؤ گی؟ اکیلی گھر میں پڑی کیا کرو گی؟ زرینہ تم کہو بھئی اس سے۔ ٹھیکیدار صاحب برا محسوس کریں گے کہ بلایا اور آئی نہیں۔" وہ جیسے حکم دے کر چلا گیا۔ ماں قریب آئی۔

"چلی چلو خضرا بیٹی! ذرا تمہارا دل ہی بہل جائے گا۔"

"نہیں...... میں نہیں جاؤں گی۔" خضرا نے ضدی پن سے کہا۔

"ضد نہ کرو بیٹی...... تمہارے انکل بھی کہہ رہے ہیں۔ پھر ٹھیکیدار صاحب بھی برا مانیں گے۔ تمہیں تو پتہ ہے وہ تمہارے انکل کے پارٹنر ہیں۔ ایسے لوگوں سے تو بنا کر رکھنی پڑتی ہے نا۔" ماں اسے سمجھانے لگی۔

"میں نے کہہ جو دیا ہے کہ میرا دل نہیں چاہ رہا۔" خضرا نے پھر انکار کیا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو خضرا...... ہمیں تمہارے انکل کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔ مجبوری جو ہوئی۔ کوئی شخص یونہی تو پرائی اولاد کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ اس کے بدلے میں کچھ اس کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کی زیادتیاں تمہاری وجہ سے برداشت کر لیتی ہوں۔ اسلئے بھی تو اس کی پناہ...... اس کا نام ہمارے پاس رہے۔ ورنہ زمانہ بہت خراب ہے بیٹی...... اور عورت مجبور، بے بس...... چل شاباش...... چلنے کے لئے تیار ہو جا۔ تیری

طبیعت ہی بہل جائے گی۔ سارا دن کمرے میں پڑی رہتی ہے۔''

ماں اسے بہت دیر تک سمجھاتی رہی، اصرار کرتی رہی۔ اس کی بات مان لینے کے سوا چارہ نہیں تھا کہ چاروں طرف سے راستے بند ہو چکے تھے اور وہ بند گلی میں گھر گئی تھی۔

عمر دراز نے ایک پرانی گاڑی خرید لی تھی۔ وہ اسی میں ٹھیکیدار کے یہاں پہنچے۔ کئی کنال پر پھیلا ہوا ان کا بنگلہ بے حد شاندار تھا۔ لیکن آرائش سے امارت کا بے جا اظہار اور گوار پن ٹپکتا تھا۔ تیز رنگوں کا استعمال آنکھوں پر بار ہو رہا تھا۔ ٹھیکیدار صاحب نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔

''واہ، واہ...... آج تو ہماری بھابی اور خضرا بھی آئی ہیں۔'' انہوں نے سونے کے دانت کی نمائش کرتے ہوئے بالوں سے بھرا ہوا ہاتھ دھپ سے خضرا کے سر پر رکھا۔

''بیٹھیں نا بھابی...... تشریف رکھیں...... خضرا تم بھی بیٹھو...... کوئی تکلف والی بات نہیں، اپنا ہی گھر ہے۔'' وہ خود بھی ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں بھائی سناؤ عمر دراز...... کیسی گزر رہی ہے؟'' انہوں نے سلسلۂ گفتگو اس کی جانب بڑھایا اور بلند آہنگ اور بے ہنگم قہقہوں کے درمیان ان کی نہ ختم ہونے والی کاروباری باتیں شروع ہو گئیں۔

ٹھیکیدار صاحب کے افرادِ خانہ میں سے کوئی بھی ڈرائنگ روم میں نہیں آیا۔ ماں اور خضرا چپ بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہیں۔ ماں کو تو ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی تھی۔ وہ بعض مقامات پر ان کی گفتگو میں شریک بھی ہو جاتی، ان کی ہنسی میں بھی ان کا ساتھ دیتی۔ لیکن خضرا سخت بوریت محسوس کر رہی تھی۔ وقت گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اکتا کر اس نے کتابوں کے ریک میں سے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو خضرا نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا تو سہی۔

کھانے کی شاندار میز خوش رنگ کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ ٹھیکیدار صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بھابھی! آپ تو خود اتنا لذیذ کھانا پکاتی ہیں۔ آپ کو بھلا یہ کھانا کہاں پسند آئے گا؟''

''نہیں، دیکھنے میں تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' ماں نے بھری میز پر ایک نگاہ ڈالی۔

''مگر اس میں آپ کے ہاتھ کی لذت تو نہیں ہے نا۔'' ٹھیکیدار صاحب نے بلا مقصد قہقہہ لگایا۔

''یہ تو آپ کی عنایت ہے ٹھیکیدار صاحب......'' ماں نے ناز آمیز تفاخر سے کہا۔

''چلئے بسم اللہ کریں۔'' ٹھیکیدار صاحب نے ڈشیں ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

خضرا برائے نام ہی کھاتی رہی۔ وہ بے حد اکتا گئی تھی۔ اسے وہ ماحول، ان کی باتیں، بے تکلف قہقہے کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا تو قہوہ آ گیا۔ بہت دیر تک قہوے کا دور چلتا رہا۔

''خضرا تو شاید بہت بور ہو رہی ہے۔'' ٹھیکیدار صاحب نے اس کی اکتاہٹ پہچانتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے چپ چپ سی ہے۔'' ماں نے اس کی لرف سے گویا وضاحت کی۔

''بھئی ہم خضرا کو بور نہیں ہونے دیں گے۔'' ٹھیکیدار صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کسی ملازم کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔

ملازم اندر آیا تو ٹھیکیدار صاحب نے اسے کسی ملازم کو بلانے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر میں ایک اونچی لمبی دیہاتی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

''جی مینڈا سائیں......'' اس نے مستعدی سے کہا۔

''شادو...... بی بی کو ساتھ لے جا۔ ذرا کوٹھی بھی دکھا دے اور چڑیا گھر کا ایک چکر بھی لگوا دینا۔'' ٹھیکیدار صاحب نے حکم دیا۔

''جو حکم مینڈا سائیں۔'' وہ مؤدب لہجے میں بولی اور خضرا کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے اٹھنے کی منتظر ہو۔

خضرا نے پس و پیش کرنے کو ماں کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی ٹھیکیدار صاحب کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں بیٹی جاؤ...... تم کوٹھی وغیرہ دیکھ آؤ، پھر چلتے ہیں۔''

خضرا کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ شادو اس کو ساتھ لئے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر آ گئی۔ کوٹھی خاصی وسیع و عریض تھی۔ پیچ در پیچ کمروں والی نت نئی اشیاء سے پُر۔

خضرا شادو کے ساتھ ساتھ سارے کمروں میں گھومتی رہی۔ کچھ نوکر چاکر تو کئی جگہ نظر آئے لیکن گھر کا کوئی فرد کہیں نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا یہاں ٹھیکیدار کے علاوہ کوئی اور نہیں رہتا۔ اس نے یوں ہی شادو سے پوچھا کہ ٹھیکیدار صاحب کے گھر کے باقی لوگ کہاں ہیں تو اس نے بتایا کہ ٹھیکیدار صاحب کا تمام خاندان زمینوں پر ان کے آبائی گھر میں رہتا ہے۔ یہ کوٹھی گویا ان کا مہمان خانہ ہے۔ وہ یہاں کاروباری معاملات طے کرتے ہیں یا ان کے دور دراز سے آنے والے مہمان یہاں ٹھہرتے ہیں۔

خضرا کوٹھی کی سیر کرنے میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ لیکن یہ ڈرائنگ روم کی فضا میں ٹھیکیدار صاحب اور عمر دراز کے بے ہنگم قہقہے سننے سے پھر بھی بہتر تھی۔ شادو نے اسے کوٹھی کا ملحقہ باغ بھی دکھایا۔

رات خاصی بھیگ گئی تھی اور چاند نکل آیا تھا۔ پھولوں کے تختوں اور گھاس کے قطعوں پر چاندنی بچھی جا رہی تھی۔ ہوا خنک اور خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ رات کی رانی کی اداس مہک نے فضا میں سوگواری سی بکھیر رکھی تھی۔ خضرا کو ماحول کی خاموشی، مہک، خنکی اور چاندنی نے موہ لیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے اپنے اندر گھلی ہوئی تلخیاں بھول گئی۔

شادو نے اسے چونکایا۔ وہ اسے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''اس طرف چڑیا گھر ہے۔''

''چڑیا گھر......؟'' خضرا نے تعجب سے پوچھا۔

''ٹھیکیدار صاحب جانور پالنے کے بڑے شوقین ہیں۔ انہوں نے تو پورا چڑیا گھر یہیں پر بنالیا ہے۔'' شادو نے تفاخر سے بتایا۔ ''آؤ......آپ کو دکھاؤں۔''

خضرا نے اردگرد چھائی ہوئی رات کو دیکھا۔

''رات ہو گئی ہے......اس وقت کیا نظر آئے گا...... جانور تو سو گئے ہوں گے۔''

''تو کوئی بات نہیں......ششکار کر جگا لیں گے۔ وہاں روشنی کا انتظام ہے۔'' شادو نے اطلاع دی۔

''نہیں...... اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔'' خضرا نے ٹالا۔ ''تھوڑی دیر باغ میں ہی

ٹھہرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی......اس کا مطلب ہے آپ کو باغ پسند آیا ہے۔'' شادو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خضرا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور دیر تک چپ کھڑی رہی۔ شادو اپنے طور پر ہی باتوں میں لگی رہی لیکن خضرا نے دھیان نہیں دیا۔

خاصی دیر بعد شادو نے اسے احساس دلایا کہ انہیں خاصی دیر ہو گئی ہے۔ اس کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں اور وہ بار بار جمائیاں لے رہی تھی۔ خضرا نے اس کی طرف دیکھا اور پلٹتے ہوئے بولی۔

''ہاں آؤ واپس چلتے ہیں۔ گھر بھی تو جانا ہے۔''

وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا سوائے ٹھیکیدار صاحب کے جو چاندی کے منقش حقے کی نے منہ میں دبائے صوفے پر نیم دراز تھے۔ خضرا نے دیکھا وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ خضرا نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''امی اور انکل کہاں ہیں؟''

''کوئی مرگ ہو گئی ہے، اس پر گئے ہیں۔ آتی دفعہ تمہیں لے جائیں گے۔'' انہوں نے جیسے اطلاع دی۔

خضرا پریشان ہو گئی۔ ''کس کا انتقال ہو گیا ہے؟''

''عمر دراز کا کوئی قریبی دوست تھا۔ ابھی ابھی فون پر ہی اطلاع ملی ہے۔'' ٹھیکیدار صاحب نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے تفصیل سے بتایا۔

خضرا کو کچھ اوپرا اوپرا سا لگا۔ ''وہ مجھے کیوں نہیں بتا کر گئے؟'' اس نے خفگی سے کہا۔

''دراصل جلدی میں تھے۔ اور پھر عمر دراز کو صدمہ اتنا تھا کہ اسے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ لیکن تم کون سا غیروں میں ہو۔ اپنا گھر ہے، آرام سے بیٹھو۔ ابھی گھنٹے آدھے گھنٹے تک وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں۔'' ٹھیکیدار صاحب نے بے تکلفی سے کہا۔

خضرا بیٹھی نہیں تھی۔ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آپ شادو کو بلا دیں۔ میں اس کے ساتھ باغ میں چلتی ہوں۔''

''شادو کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے...... چلو آؤ میں تمہیں باغ میں لے چلتا ہوں۔''

ٹھیکیدار صاحب نے حقے کی نے منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں......آپ تکلیف نہ کریں۔" خضرا گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

لیکن ٹھیکیدار صاحب اپنی جگہ سے اٹھ چکے تھے۔ وہ اس کے قریب آ کر بولے۔

"چلو آؤ۔"

"نہیں......نہیں......آپ شادو کو بلا دیں۔" وہ شانے سکیڑ کر بغیر ان کی طرف دیکھے بولی۔

"میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے؟" وہ بھاری آواز میں بولے اور اپنا بالوں سے بھرا ہوا بھدا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"چلو اب اٹھو۔"

خضرا نے سونے کی انگوٹھی والے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ اٹھی اور ٹھیکیدار صاحب کی نگاہ سے ٹکرائی۔ ان کی مسکراہٹ میں سونے کے دانت کی چمک کی طرح ایک سرد کر دینے والا مفہوم واضح تھا۔ خضرا کانپ گئی۔ نچلا ہونٹ چباتے ہوئے اٹک کر بولی۔

"نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ شادو کو میرے پاس بھیج دیں۔"

"شادو بھی آ جائے گی۔ تم آؤ تو سہی، باہر باغ میں کھلی ہوا ہے۔" ٹھیکیدار صاحب نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی جگہ سے اٹھا دیا۔ خضرا پریشان سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اگر تم اپنا بازو مجھے نہیں پکڑانا چاہتی تو پھر خود بخود میرے ساتھ چلو۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

خضرا کو وقت کی سنگینی کا پتہ چلا۔ عمر دراز اور ماں کا اسے بتائے بغیر چلا جانا بے سبب نہیں تھا۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی دھاری سی بہتی محسوس ہوئی۔ انجانا خوف اس کے رگ و پے میں بجلی کی رو کی طرح دوڑ گیا۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور کچھ سوچ کر اپنی گھبراہٹ کو چھپاتی ان کے ساتھ چل پڑی۔

وہ ایک دوسرے راستے سے باغیچے تک پہنچ گئے۔ یہ باغ کا کوئی اور گوشہ تھا جو شادو نے اسے نہیں دکھایا تھا۔ رات بھی اب گہری اور پراسرار تھی۔ چٹکی ہوئی چاندنی کچھ اور بھی اُجلی اور نقرئی ہو گئی تھی۔ چاند چاندی کے ایک بڑے تھال کی طرح سروں کے عین اوپر درختوں میں اٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا ہوا کے جھونکوں میں خنکی تھی۔ رات کی رانی کی

خوشبو سے فضا بوجھل ہو چکی تھی۔

ٹھیکیدار صاحب کے ساتھ سکڑ سمٹ کر چلتے ہوئے خضرا کو ہر شے سے خوف آ رہا تھا۔ اسے چاروں طرف غیر مرئی ہیولے سے اپنی جانب بڑھتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ باغ کے اس حصے میں بت سی سجاوٹیں، فوارے اور سنگ مرمر کے حوض میں رنگ برنگی مچھلیاں بھی تھیں۔ ایک گوشے میں سبز بیلوں سے ڈھکی ہوئی سرخ چھت والی ہٹ تھی۔ لیکن خضرا کو کسی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ ہوش۔ وہ دل ہی دل میں اس لمحے کا تجزیہ کر رہی تھی جو اچانک اس پر آن ٹوٹا تھا۔

❁.....❁

"عمر دراز مجھ سے اکثر تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے...... تم بہت خوبصورت ہو۔ تمہاری ماں تو تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔" ٹھیکیدار نے اسے متوجہ کیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" خضرا نے ناگواری سے کہا۔

ٹھیکیدار صاحب ہنسے۔

"میں نے تو بالکل سیدھی سی بات کی ہے اور اس زبان میں جو سب سمجھتے ہیں۔"

خضرا نے موضوع بدلنے کو جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"پتہ نہیں امی کب آئیں گی؟"

"تم کون سا کہیں باہر بیٹھی ہو...... اپنے گھر میں ہی تو ہو۔" انہوں نے چہرہ اس کے قریب لا کر کہا۔

تاریکی میں کھلی ملی چاندنی میں ان کے سیاہ ہونٹوں میں سے سونے کا دانت چمکنے لگا۔

خضرا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ چند قدم دور ہٹ گئی۔

"کھانے پینے کے لئے کچھ منگواؤں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں، شکریہ......" خضرا نے عجلت میں انکار کیا۔

"بھئی تم تو بہت ہی تکلف کرتی ہو۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تم نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا۔" انہوں نے کمال بے تکلفی سے کہا۔

"جی نہیں، شکریہ...... مجھے بھوک نہیں تھی۔" خضرا نے دھیرے سے کہا۔

"آؤ اندر چل کر بیٹھیں۔" انہوں نے ہٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر ہلکی نیلی روشنیاں جل اٹھیں۔

"جی نہیں...... یہاں کھلی ہوا ہے۔" خضرا نے پسینے پسینے ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ، تم آؤ تو سہی...... اندر اے سی لگا ہوا ہے۔" انہوں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں، نہیں...... میں یہاں پر ہی ٹھیک ہوں۔" خضرا نے پس و پیش کی۔

"اب یہ نہ نہ چھوڑ بھی دو۔" وہ تقریباً اسے گھسیٹ کر اندر لے گئے۔

خضرا نے گھبرائی ہوئی تیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا...... وہ ایک پُر آسائش بیڈ روم تھا۔ اس نے اپنا بازو ان کا ہاتھ جھٹک کر چھڑانا چاہا لیکن ٹھیکیدار صاحب نے نہیں چھوڑا اور اسے ایک صوفہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولے۔

"یہاں بیٹھ کر آرام سے بات چیت کرو...... تم نے تو اس وقت سے نہیں نہیں کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ بس اب جانے دو اس نہ نہ کو اور کوئی بات کرو۔"

خضرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "میں زیادہ باتیں نہیں کرتی۔"

"چلو زیادہ باتیں نہیں، تھوڑی باتیں تو کرو۔" انہوں نے بلا سبب ہنستے ہوئے کہا۔

خضرا نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مسلیں۔

"آپ پتہ کریں پلیز۔ شاید امی آ گئی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں تو آؤ تھوڑی دیر آرام کر لو۔" ٹھیکیدار صاحب نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا اور ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہے ہوں۔

خضرا چڑ گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر خفگی سے بولی۔

"آپ مجھے خوامخواہ پریشان کر رہے ہیں...... آپ پتہ تو کریں، امی اور انکل آ گئے ہوں گے۔"

ٹھیکیدار صاحب بھی اس کے ساتھ ہی اپنی نشست سے اٹھے۔ ان کی ہنسی کی مکروہ آواز میں ان کے سونے کے دانت کی چمک شامل ہوئی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور جیسے مذاق اُڑاتے ہوئے بولے۔

"بہتیری ہو گئی لاڈو...... میرا خیال ہے اب تجھے اصلی بات بتا ہی دوں تا کہ تجھے چین تو پڑے۔ تیرا انکل تو اب صبح ہی تجھے لینے آئے گا۔ وہ مجھے سب کچھ بتاتا رہتا ہے۔ تُو اس کی تو بہت مانتی ہے۔ آج اس کی جگہ مجھے سمجھ لے...... کیا حرج ہے۔"

خضرا ہکا بکا ہو کر پیچھے ہٹی۔

"بکواس کرتے ہیں آپ...... جھوٹ بولتے ہیں۔"

"یہ تو تمہیں آپ ہی پتہ چل جائے گا کہ کون جھوٹ بولتا ہے اور کون بکواس کرتا ہے۔" ٹھیکیدار صاحب نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

خضرا کا رنگ فق ہوگیا۔اس کی سہمی ہوئی نگاہ ٹھیکیدار کی غلیظ نگاہ سے ملی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔اس کے گال کو ہلکے سے تھپتھپا کر بولے۔

"پگلی ہو تم بھی...... بھلا اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔سمجھو تم اپنے ہی گھر میں ہو۔ شاباش۔"

خضرا الٹے قدموں پیچھے ہٹتی ہوئی سختی کے ساتھ بولی۔

"میں ابھی اور اسی وقت اپنے گھر جاؤں گی۔"

"کیسے؟" وہ تمسخر سے بولے۔"کوئی جانے دے گا تو جاؤ گی۔" انہوں نے ایک بار میں ہی اس کا بازو کھینچ کر اسے بیڈ پر گرا دیا۔خضرا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔وہ سنبھل کر اٹھتے ہوئے حواس باختگی سے چلائی۔

"خدا کے لئے...... خدا کے لئے اس طرح نہ کریں...... پلیز...... پلیز......"

"گھبراؤ نہیں...... گھبراؤ نہیں...... کوئی ایسا پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑا تم پر...... تمہارا یہاں آنا جانا رہے گا ہی۔تمہارے انکل کے ساتھ مفت میں شراکت تو نہیں کر لی۔" انہوں نے احسان جتایا۔

"وہ آپ کا اور انکل کا معاملہ ہے...... مجھے بیچ میں مت لائیں۔" خضرا روہانسی ہوگئی۔

"ہے پگلی نہ ہو تو......" وہ ہنسے۔"تمہاری وجہ سے ہی تو سارا معاملہ ہوا ہے...... پھر تمہیں بیچ میں کیسے نہ لائیں؟"

بے بسی خضرا کی آنکھوں میں آنسو بن گئی۔اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا۔ٹھیکیدار صاحب نے اس کے گھنے بال سہلا کر جیسے تسلی دی۔

"بس بس...... اب رونا مت...... میرا دل بہت کمزور ہے...... میں عورت کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

خضرا لرز گئی۔اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"چلو اب پونچھ دو یہ آنسو...... کوئی فائدہ نہیں اس رونے دھونے کا۔" انہوں نے اس

کے شاداب رخسار پر بہتے ہوئے شفاف آنسو کو اپنی انگلی کی جنبش سے جیسے ہوا میں اُڑا دیا۔ خضرا ان کی پہنچ سے دور ہونے کے لئے پیچھے ہٹی۔

اچانک اس کی نگاہ سامنے پڑی۔دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔اس نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لئے بھی نہیں سوچا اور اتنی تیزی کے ساتھ دوڑ کر دروازے میں سے نکلی کہ شاید لمحے بھر کو ٹھیکیدار صاحب کو بھی پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔وہ بغیر کسی سمت کا تعین کئے اندھا دھند سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔اونچے پھل دار درختوں، پھولوں اور تختوں اور سنگ مرمر کے فواروں کے درمیان سے راستہ بناتی وہ مسلسل بھاگ رہی تھی...... یہ سوچے یا خیال کئے بغیر کہ ٹھیکیدار صاحب کی اونچی دیواروں والی قلعہ نما کوٹھی کے ملحقہ باغ میں وہ کتنی دور تک دوڑ سکتی تھی۔

رات کی تاریکی میں چاندنی کی آمیزش اور اِکا دُکا مصنوعی روشنی میں گرد و پیش تھوڑا بہت تو نظر آتا تھا لیکن گھنے درختوں کے سائے جگہ جگہ چاندنی کا راستہ روکے کھڑے تھے۔لیکن خضرا کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔وہ ہر صورت میں ٹھیکیدار صاحب کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔خواہ اس کو تمام رات اس وسیع باغ میں آنکھ مچولی ہی کیوں نہ کھیلنی پڑے۔

خضرا کو ہر طرف سے تعاقب کرنے والے قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔اس کا سانس پھول گیا تھا۔اس کے حلق میں کانٹے تھے۔وہ درختوں کی اوٹ لے کر گرتی پڑتی بھاگ رہی تھی۔باغ کی حدود ختم ہو رہی تھی۔اس سے آگے سبزیاں کاشت کی گئی تھیں...... وہ کیاریاں پھلانگتی، مٹی میں پھسلتی آگے بڑھی۔لوہے کے جنگلے پر چڑھی ہوئی باڑ اس وسیع و عریض باغ کے اختتام کا اعلان کر رہی تھی خضرا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اپنا سانس ہموار کرنے لگی۔اس کا سانس سے سانس نہیں مل رہا تھا۔کسی کے آ جانے کا خوف سے بدحواس کر رہا تھا۔کتوں کے بھونکنے کی آواز نہ جانے کس طرف سے آ رہی تھی۔لیکن خضرا کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ باغ کے ہر کونے سے آ رہی ہے۔

وہ جانتی تھی کہ ٹھیکیدار اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر آرام سے نہیں بیٹھا ہوگا۔وہ اپنے ہی گھر کے باغ میں اسے تلاش کرنے کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتا تھا۔یہی سوچ سوچ کر اس کی جان نکل جاتی تھی۔لیکن اب تک کوئی یہاں نہیں پہنچا تھا۔وہ چند

لمحے وہیں کھڑی اپنے اعصاب کو معمول پر لاتی رہی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

وہ دیکھ بھال کر باڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی کہ کوئی ایسی جگہ نظر آ جائے جہاں سے وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس نے کئی جگہ باڑ کی شاخوں کو ہلا کر دیکھا لیکن وہ اتنی مضبوطی کے ساتھ آپس میں الجھی ہوئی تھیں کہ معمولی سا سوراخ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

خضرا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے سارے وجود میں خوف کی ٹھنڈک اپنے پنجے گاڑنے لگی۔ رات کی وحشت اس کے روئیں روئیں میں اتر رہی تھی۔ باڑ کے ساتھ ساتھ چلتے اور باہر جانے کا راستہ تلاش کرتے وہ ایک کچی چار دیواری کے قریب رکی جس پر ٹین کا چھپر تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ یہاں کوئی ہو بھی سکتا ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کی آواز نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

"کرم دین...... یہاں تم نے کسی کو دیکھا ہے؟"

وہ وہیں دیوار سے چپک گئی۔ اس کی ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت باقی نہیں رہی۔

وہ آہستہ آہستہ ایک جھاڑی نما پھولدار پودے کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔

"نہیں ٹھیکیدار جی...... اس طرف تو کوئی نہیں آیا۔" کسی ملازم پیشہ شخص کی اونگھتی ہوئی بوڑھی آواز سنائی دی۔

"اچھا، ہاں سن...... کوئی اس طرف آئے تو بٹھا لینا۔ ہلنے نہ دینا سمجھے۔ ہاں تیرا کتا موتی کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ خضرا سُن سی ہو گئی۔

"ہائے ہائے...... مر گیا بیچارا...... ٹرک کے نیچے آ گیا تھا۔" وہ آہ بھر کر بولا۔

"وہ ہوتا تو اچھا تھا...... دوسرے کتے ذرا خطرناک ہیں۔" ٹھیکیدار نے جیسے خود سے کہا۔

"ٹھیکیدار صاحب! کون ہے؟" کرم دین نے سوال کیا۔

اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا، صرف ٹھیکیدار کے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ خضرا کے سارے جسم سے جیسے جان نکلنے لگی۔ وہ سانس روکے وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے کچھ دور ٹارچ کی روشنی کے دائرے گھومتے ہوئے دیکھے اس پر خوف سے کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے کبوتر کی طرح خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہو گیا...... وہ سولی پر چڑھی ہوئی نہ جانے کتنی دیر جھاڑی کی اوٹ میں زمین سے لگی ہوئی

بیٹھی رہی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ روشنی کے وہ دائرے کہیں نہیں تھے۔ قدموں کی چاپ معدوم ہو چکی تھی۔ البتہ اسی چار دیواری کی جانب سے بلغمی کھانسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ ایک ہی انداز میں بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں سُن ہو گئیں۔ وہ ہمت کر کے آہستہ آہستہ اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی پھر آگے بڑھی۔ وہ کچی دیوار کے ساتھ ساتھ چلی لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ کہیں نہیں تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس ڈراؤنے باغ میں قید ہو گئی ہے۔ وحشت سے اسے ہول آنے لگے۔ اگر ساری رات بھی یہاں بھٹکتی پھرتی تو اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل سکتا تھا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے کسی نے للکار کر کہا۔

"اوئے کون ہے تُو...... ہوشیار ہو جا...... ہوشیار......"

خضرا دھک سے رہ گئی۔ وہ افراتفری میں پلٹی۔ دیہاتی لباس میں ایک ادھیڑ عمر آدمی ہاتھ میں لاٹھی لئے کھڑا تھا۔ شاید وہ کرم دین تھا۔ خضرا بری طرح سے خوفزدہ ہو گئی۔ اسی خوفزدگی کی شدت میں وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور منت بھرے لہجے میں بولی۔

"خدا کے لئے مجھے کچھ مت کہنا...... میں پہلے ہی بڑی مصیبت میں ہوں...... میں بھی چلی جاؤں گی۔ مجھے باہر نکلنے کا کوئی راستہ بتا دو۔" اتنا کہنے میں ہی اس کا گلا بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کاکی! تُو ہے کون......؟" اس نے دیہاتی لہجے میں حیرت سے سوال کیا۔

"مجھ سے کچھ مت پوچھو...... مجھے صرف اس جگہ سے باہر جانے کا راستہ بتا دو...... مجھے یہاں سے باہر نکال دو۔" خضرا نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا تو ٹھیکیدار صاحب تجھے ہی ڈھونڈ رہے تھے؟" وہ بولا۔

خضرا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ "اگر تم نے مجھے ٹھیکیدار کے حوالے کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

بوڑھے نے ایک گہری سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑایا اور چند قدم اس کی طرف بڑھ کر آہستگی سے بولا۔

"تُو جو کوئی بھی ہے اس وقت یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی؟"
خضرا کی ڈھارس بندھی...... اسے قدرے امید ہوئی کہ بوڑھا اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس نے بے تابی سے کہا۔
"تم مجھے اس بھیڑیئے کے چنگل سے نکال دو...... میں چلی جاؤں گی۔"
"کیسے چلی جائے گی تُو؟ تجھے پتہ نہیں رات ہوتے ہی بھیڑیئے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ یہاں تو ایک ہی بھگیاڑ ہے۔ باہر پتہ نہیں کتنے ہوں گے۔" اس نے سرزنش کے انداز میں کہا۔
خضرا کو وقت کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ یہاں سے نکلنے کی دھن میں یہ فراموش کر بیٹھی تھی کہ باہر چھائی ہوئی سیاہ رات میں لپٹی بری آنکھوں اور غلیظ ارادوں سے محفوظ رہنا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا یہاں سے بچ کر نکلنا۔ وہ پریشانی سے رو پڑی۔
"تو پھر میں کروں......؟" اس نے سسکیوں کے درمیان کہا۔
"اب رو نہ کا کی......" بوڑھے کی آواز میں شفقت تھی۔ "تُو یہیں بیٹھی رہ۔ اذان کے وقت میں تجھے یہاں سے نکال دوں گا۔ آگے تُو جانے اور تیرا کام۔"
"اگر ٹھیکیدار پھر آ گیا تو؟" خضرا نے اندیشوں سے لرز کر کہا۔
"آ گیا تو میں سنبھال لوں گا۔ تُو بس دم گھونٹ کر بیٹھی رہنا۔" بوڑھے نے اطمینان دلایا۔

ایک ایک لمحہ صدیوں کا ہو گیا۔ کالی رات اور ڈراؤنی ہو گئی۔ خوف اور اندیشوں نے اسے کھا لیا۔ اس کے اعصاب چور چور ہو گئے۔ اسے کوئی اپنا، کوئی ساتھی نظر نہیں آتا تھا۔ سارے رشتے جھوٹے ہو گئے تھے۔ سارے تعلق فریب بن گئے تھے۔ ساری قرابتیں محض ایک دھوکا تھیں۔

وہ خوف اور وحشتوں کے درمیان گھری ہوئی بے خوابی کی اذیت جھیلتی رہی۔ ہر آہٹ پر چونکتی، ہر چاپ پر ہولتی رہی اور رات کی طوالت بڑھتی ہی رہی۔ پھر نہ جانے وہ اونگھ گئی یا اس کی آنکھ لگ گئی۔ چونکی تو بابا اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"آرام سے کا کی...... آرام سے......" بوڑھے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "چل آ میرے ساتھ۔"

خضرا نے آنکھ مل کر دیکھا، رات تو ابھی تک باقی تھی لیکن ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ پرندوں کے بیدار ہونے، پَر پھڑپھڑانے اور چہچہانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دور کہیں سے اذان کا کوئی کوئی لفظ سماعت میں اتر رہا تھا۔ خضرا کو صبح کے طلوع کا یقین ہو گیا۔

وہ احتیاط سے قدم دھرتی بوڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھکی ہوئی ایک کنج پر پہنچا اور اپنی لاٹھی کی مدد سے سوکھی ہوئی گھاس اور درختوں کی ٹوٹی شاخوں کو ہٹایا۔ خضرا نے دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا راستہ نظر آ رہا تھا...... شاید کسی زمانے میں یہاں کوئی ٹیوب ویل تھا جسے بند کر دیا گیا تھا اور اس جانب سے اسے جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔
بوڑھے نے جھک کر اس تنگ سی جگہ میں سے دوسری طرف جھانکا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھتا رہا پھر سیدھا کھڑا ہوا اور خضرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"کا کی دل تو چاہتا ہے کہ تجھے تیرے گھر پہنچا کر آؤں...... پر کیا کروں، مجبوری ہے۔ اللہ کا نام لے کر چلی جا...... خدا کوئی نیک سبب کر دے گا۔"
"اچھا بابا...... خدا حافظ...... تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔" خضرا نے سچائی سے کہا۔
"اچھا اللہ بیلی کا کی...... ذرا احتیاط میں قدم رکھنا، زمانہ بہت خراب ہے۔" بوڑھے نے اس کی پشت تھپتھپائی۔
خضرا دھک دھک کرتے دل پر قابو پاتی ہوئی اپنی ہمتوں کو مجتمع کرتی جھک کر اس تنگ راستے سے دوسری نا معلوم دنیا میں داخل ہو گئی۔ سوکھے پتے، ٹوٹی ہوئی شاخیں اور جھاڑ جھنکاڑ اس کے پیروں تلے چور چور ہونے لگے۔ اس نے اپنے بالوں اور کپڑوں پر اٹکے ہوئے گھاس کے تنکے اور چرمرے پتے جھاڑتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔
صبح صادق کا صبیح چہرہ رات کے ستاروں بھرے گھونگھٹ میں سے جھانک رہا تھا۔ ذانوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ بیداری کی آہٹیں اور زندگی کا شور انگڑائی لے کر جاگنے لگا تھا۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہ کسی گھر کا عقبی حصہ معلوم ہوتا تھا جہاں سبزیاں وغیرہ کاشت کی گئی تھیں۔ غالباً نگرانی نہ ہونے کے باعث سبزیوں کی بیلیں ایک دوسرے

سے الجھی ہوئی بے ترتیبی کے ساتھ زمین پر اس طرح بچھی ہوئی تھیں کہ پاؤں رکھنے کی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔

خضرا کو انجانا خوف ڈرا رہا تھا۔ وہاں سے نجات پائی تھی تو یہ اندیشے ستانے لگے تھے کہ وہ یہاں سے کیسے باہر نکلے گی...... اگر اس گھر کے مکینوں میں سے اسے کسی نے دیکھ لیا تو وہ اپنی صفائی میں کیا کہے گی؟...... یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی؟ گھر اب اس کے لئے عافیت کا گہوارا نہیں رہا تھا، ایک نیلام گھر بن گیا تھا جہاں کاروبار میں شراکت کے عوض اس کا سودا چکایا گیا تھا...... ماں کے رشتے کا اعتبار لٹ گیا تھا۔ عمر دراز کسی بھیڑیئے کی طرح تاک لگائے بیٹھا تھا۔

وہ اس دہلیز پر قدم نہیں رکھنا چاہتی تھی جہاں نہ تحفظ تھا نہ چھاؤں۔ وہ اس گھر میں واپس نہیں جانا چاہتی تھی جہاں رشتوں کا تقدس باقی نہیں رہا تھا۔ یہ خیال اسے بار بار پریشان کر رہا تھا کہ وہ کہاں جائے؟...... وہ صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی کہ کہیں صبح ہوتے ہی ٹھیکیدار اسے تلاش کرنا نہ شروع کر دے۔ لیکن کوئی ایسی پناہ گاہ، کوئی سائبان نظر میں نہیں تھا جہاں وہ خود کو محفوظ کر لیتی۔

اسے عمار کا خیال آیا لیکن اس کے دل نے خود ہی اس کو رد کر دیا۔ اس نے استانی جی کے بارے میں سوچا لیکن وہ تو اسی محلے میں رہتی تھیں۔ عمر دراز یا ماں اسے زبردستی وہاں سے لے جا سکتے تھے۔ وہ بے حد پریشان ہوئی۔ ایک پل میں جیسے اسے سارے شناسا چہرے یاد آئے جن میں صرف روبی ہی ایسی تھی جس کے یہاں وہ چند روز پناہ لے سکتی تھی۔ وہ اپنی نانی کے ساتھ تنہا رہتی تھی۔ اس کے یہاں وہ محفوظ رہ سکتی تھی۔

اس خیال نے اسے تقویت دی۔ اس نے دل کو مضبوط کیا اور اپنی ہمتوں کو یکجا کر کے زمین پر بچھی ہوئی بیلوں میں سے بڑی دقت سے راستہ بناتی آگے بڑھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر اس گھر کے کسی مکین نے اسے دیکھ لیا تو وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے گی۔ اس خیال نے اس کا خوف زائل کر دیا اور اس کے تنے ہوئے اعصاب معمول پر آنے لگے۔

✿......✿

صبح کی روشنی ابھی ملگجی تھی لیکن گرد و پیش صاف نظر آتا تھا۔

پھونک پھونک کر قدم رکھتے اس نے کچھ فاصلہ طے کیا۔ آگے سبزیوں کو سیراب کرنے

کے لئے بنایا گیا نالا تھا جو خشک پڑا تھا۔

خضرا نے قریب جا کر اس میں جھانکا تو اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ دم بخود کھڑی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ نالے کے بیچ ایک انسانی جسم اوندھے منہ پڑا تھا...... کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے...... خضرا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے سارے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔

نہ جانے وہ کون تھا؟...... زندہ تھا یا مر چکا تھا...... نہ جانے کون اسے یہاں بے دردی سے پھینک گیا تھا۔ نہ معلوم گھر میں اس وقت کون موجود تھا۔ کہیں وہ مفت میں کسی اور مصیبت میں ہی نہ پھنس جائے۔ سو طرح کے خیالات نے اسے چکرا دیا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

صبح کے پرندوں کے چہچہانے کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خضرا نے سوچا کہ اسے خاموشی کے ساتھ یہاں سے جتنی جلد ممکن ہو نکل جانا چاہئے۔ اسی میں اس کی بہتری تھی۔ اس خیال سے وہ پھر خشک نالے کے کنارے پر آئی تا کہ نالا پھلانگ کر عبور کرے۔ لیکن ابھی وہ اس کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اس کے جسم میں خفیف سی حرکت ہوئی اور ایک کرب آمیز کراہ سنائی دی۔

خضرا پوری جان سے کانپ گئی...... خوف سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ زخمی جسم میں پھر لرزش ہوئی اور کراہنے کی ہلکی سی آواز ڈوبنے ابھرنے لگی۔ خضرا بے طرح پریشان ہوئی۔ وہ اس کراہتے ہوئے بے بس انسان کے برابر سے بے حس بن کر بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ اور اس کے پاس جاتے ہوئے اسے خوف آ رہا تھا۔ اوندھے منہ پڑے ہونے کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اسے کراہتے ہوئے سن سکتی تھی جس میں ہر لمحہ کراہ کی آمیزش خضرا کو برابر سے چپ چاپ نکل جانے سے روک رہی تھی۔ اس کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے دل میں ہمدردی کا احساس خوف اور اندیشوں پر غالب آ رہا تھا۔

وہ نالے کے کچے کنارے پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ اندر اتری اور ڈرتے ڈرتے اس زخمی جسم کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔

''آہ......''

اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ خضرا نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں سے تھوڑا سا پانی مل جائے تو وہ اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرے۔ لیکن گرد و پیش پانی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ پھر اس پر جھک گئی اور اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں ہانپ گئی۔

وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس کی کنپٹیاں سفید اور بال سلیٹی مائل تھے...... غیر ارادی طور پر خضرا نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے ان کا چہرہ صاف کیا تو اس کی آنکھوں کے پپوٹے لرزے اور ان کی بڑبڑاہٹ کی آواز سنائی دی لیکن کوئی لفظ واضح نہیں تھا۔

''ہوش میں آیئے پلیز......'' خضرا نے ان کا شانہ تھپک کر انہیں ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔

''ہوں...... ہوں......'' ان کے ہونٹوں سے کچھ بے معنی صدائیں نکلیں۔

''ہوش میں آئیں...... آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' خضرا نے انہیں پھر مخاطب کیا۔

انہوں نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں۔ ان کی نگاہیں بے معنی اور سپاٹ تھیں۔ ان کی پلکیں لرز رہی تھیں اور پپوٹے بار بار بند ہو جاتے تھے۔ ان کی نگاہیں بے سمت تک رہی تھیں۔ پھر ان کے ہونٹوں نے ''پانی'' کا لفظ کہا۔

خضرا پریشان ہوئی۔ دور اسی گھر کا عقبی برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے کواڑ چوپٹ کھلے تھے۔

''پانی...... پانی......'' اسے پھر ایک پیاسی کراہ سنائی دی۔

وہ ہمت کر کے اٹھی اور ڈرتے ڈرتے رہائش کی طرف بڑھی۔ اس کے دل میں ہزاروں خدشے سر اٹھا رہے تھے۔ وہ کسی مصیبت میں بھی پھنس سکتی تھی لیکن اس وقت اسے خود سے زیادہ اس زخمی کا خیال تھا جو کسمپرسی کے عالم میں پڑا پانی مانگ رہا تھا۔ اگر وہ اسی گھر کا فرد تھا تو وہ گھر والوں میں سے کسی کو مدد کے لئے بلا سکتی تھی۔ شاید وہ اس کی اس ہمدردی کے عوض اسے حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل جانے دے۔ یہی سوچتی ہوئی وہ تیزی سے رہائش کی طرف بڑھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ کھلے ہوئے دروازے میں سے اندر داخل ہوئی۔

سارا گھر الٹا ہوا تھا...... الماریوں کے پٹ کھلے تھے اور اٹیچی کیسوں میں سے سامان

باہر نکلا پڑا تھا۔ خضرا کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں چوری کی واردات ہوئی ہے۔ اس نے جلدی جلدی سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ سنسان گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کہیں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ خضرا کو وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے فرش پر لڑھکتا ہوا پلاسٹک کا ایک برتن اٹھایا، اسے پانی سے بھرا اور واپس لپکی۔

وہ پھر بے سدھ ہو گئے تھے۔ خضرا نے پانی کے چھینٹے ان کے منہ پر مارے اور چلو سے ان کے نیم وا ہونٹوں میں ڈالا جو ان کی باچھوں کے اطراف بہہ گیا۔ شاید کچھ قطرے ان کے حلق میں بھی گئے۔ انہوں نے ایک جھرجھری سی لی اور آنکھیں کھول کر کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ خضرا نے پریشانی سے کہا۔

''آپ کو کیا ہوا ہے......؟''

ان کے ہونٹ ہلے اور ڈوبتی ابھرتی آواز میں بولے۔

''تم...... تم جو کوئی بھی ہو اٹھنے میں میری مدد کرو۔''

خضرا نے بڑی دقتوں سے انہیں اٹھا کر بٹھایا۔ انہوں نے پانی کے برتن کی طرف نقاہت سے اشارہ کیا۔ خضرا نے برتن اپنے ہاتھوں میں تھامے تھامے ان کے منہ سے لگا دیا۔ انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر چند گھونٹ بھرے پھر ایک لمبا سانس لیا اور کمزور سی آواز میں بولے۔

''مجھے اندر لے چلو۔''

وہ اونچے لمبے بھاری تن و توش کے مالک تھے۔ خضرا جیسی نازک اندام لڑکی کے لئے ان کا بوجھ سہارنا خاصا دشوار تھا۔ کچھ انہوں نے کوشش کی کچھ خضرا نے اپنی ہمتوں کو یکجا کیا۔ وہ بڑی دقتوں سے اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے اور قدم قدم اس کے سہارے چلتے رہے۔ بار بار دم لینے کو رکتے۔ اندر آئے اور ایک بیڈ پر گر کر بے سدھ ہو گئے۔ خود خضرا بھی بری طرح ہانپ کر قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اپنی سانسیں ہموار کرنے لگی۔

یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا کہ اس گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس سے کوئی تعرض کرتے۔ وہ آسانی سے یہاں رات تک ٹھہر سکتی تھی۔ اندھیرا چھاتے ہی وہ موقع دیکھ کر باہر نکل سکتے تھے۔ اسے امید تھی کہ وہ روبی کے ساتھ چند روز ٹھہر سکتی تھی۔ وہ انہیں بھول کر اپنے ہی جوڑ توڑ میں لگی ہوئی تھی کہ اسے وہ نقاہت آلود صدا سنائی دی۔

وہ چونک کر اٹھی اور دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی کہ اس نے انہیں پوچھا تک نہیں تھا حالانکہ لان سے کمرے تک چلنے کی مشقت نے انہیں جیسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس نے تھوڑا جھک کر ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظوں کو دھیان سے سنا۔

''بیٹی...... بیٹی......''

خضرا کے لئے یہ لفظ، یہ رشتہ کتنا اجنبی اور انجان تھا...... وہ اس کی لذت اور لگاؤ سے اب تک ناآشنا ہی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان جیسے لوگوں نے کبھی اس کے ساتھ تقدس کا یہ رشتہ وابستہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اسی لئے یہ لفظ ان کے ہونٹوں پر کچھ عجیب اور نیا نیا سا معلوم ہو رہا تھا...... ان کا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ خشک۔ آدھ کھلی آنکھوں میں کسی گہری اذیت کے ضبط کرنے کا کرب تھا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن نقاہت کہنے نہیں دے رہی تھی۔ خضرا دوڑ کر پانی لائی اور ایک چمچے سے قطرہ قطرہ ان کے منہ میں ڈالنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ان کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ انہوں نے مدہم سے لہجے میں کہا۔

''بیٹی...... وہ الماری کھولنا ذرا۔''

خضرا نے اٹھ کر الماری کھولی۔ سامنے ہی لکڑی کا ایک بکس رکھا تھا جس پر سرخ مارکر سے فرسٹ ایڈ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کا مقصد سمجھ کر دل ہی دل میں خجل ہوئی۔ اسے پہلے ہی ان کا خیال کرنا چاہئے تھا۔ اس نے ڈبہ الماری سے نکالا، پانی گرم کر کے لائی، ان کے زخم صاف کر کے دوائی لگا دی۔ زخم گہرے یا مہلک نہیں تھے۔ شاید وار اوچھا پڑا تھا یا زخمی کرنے کا مقصد کاری ضرب لگانا نہیں تھا۔

اس نے سامان سمیٹ کر ڈبے میں واپس رکھا تو وہ بڑی کوشش سے بولے۔

''دیکھو سرہانے دوائی رکھی ہے...... مجھے دو۔''

خضرا نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی شیشی اٹھائی اور ان سے پوچھا۔

''اگر گھر میں دودھ ہے تو میں گرم کر کے لا دوں..... اسے خالی پیٹ نہیں لینا چاہئے۔''

''فریج میں دیکھو۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

خضرا کچن میں آئی تو اسے احساس ہوا کہ یہ کسی بھرے پرے گھر کا کچن تھا...... چیزیں ترتیب اور سلیقے سے رکھی تھیں۔ دیواروں پر پھلوں اور کھانے کے رنگین پوسٹرز اور اسٹیکرز

چسپاں تھے...... ایک الماری پر کلریز چارٹ آویزاں تھا۔ دوسرے کیبنٹ پر ڈائٹنگ پروگرام چپکا ہوا تھا۔

اس نے فریج کھولا تو اس میں مختلف برتنوں میں پکے ہوئے کھانے موجود تھے۔ اس نے دودھ کا پیکٹ کھول کر ایک مگ گرم کیا اور تیز قدموں سے کمرے میں واپس آئی۔

دودھ کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے اٹھنے میں ان کی مدد کی۔ وہ پہلے سے بہتر تھے۔ اس نے دو تکیے ان کے پیچھے لگا کر انہیں سہارا دیا۔ دوائی لے کر انہوں نے دودھ کا مگ ہاتھ میں لیا اور گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگے۔ خضرا ان کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

انہوں نے دودھ پی لیا تو خضرا نے خالی مگ ان کے ہاتھ سے لے کر رکھا اور انہیں پھر لیٹنے میں مدد دی۔ وہ کچھ دیر سانس ہموار کرتے رہے پھر اسے اشارے سے قریب بلایا۔

''جی......'' خضرا تھوڑا سا جھکی۔

''جاؤ، کچن میں جا کر ناشتہ کر لو۔'' انہوں نے کمزور آواز میں کہا۔

خضرا جھینپ سی گئی اور تکلفاً بولی۔ ''ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اسے اپنا ہی گھر سمجھو...... تکلف نہ کرو۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔

خضرا کو بھی اپنے خالی معدے کا احساس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے رات بھی کھانا برائے نام ہی کھایا تھا اور اب جب سورج بلند ہو رہا تھا، تفکرات کا بوجھ اور خوف کا غلبہ نسبتاً کم ہوا تھا تو فطرت کے تقاضے نے اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ ان کے اصرار کے باوجود وہ بے باکی سے اٹھ کر جا نہیں سکی۔ ہچکچاہٹ میں بندھی ہوئی اسی طرح بیٹھی رہی۔ انہوں نے پھر کہا۔

''شرماؤ نہیں...... چلو اٹھو...... اٹھو......''

خضرا جھجکتی ہوئی اٹھی، چند قدم چلی پھر ان کی طرف پلٹ کر بولی۔ ''آپ کے لئے بھی ناشتہ بناؤں؟''

''نہیں بیٹی...... بس تم اپنی فکر کرو۔'' انہوں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

خضرا حالات کی بوالعجمی پر حیران ہوتی ہوئی باورچی خانے میں آئی۔ اس نے فریج کھولا۔ مکھن، جام، انڈے، ڈبل روٹی سبھی کچھ موجود تھا۔ اس نے چائے بنائی، سلائس پر جام لگایا اور باورچی خانے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی کھانے کی چھوٹی میز پر بیٹھ کر

ناشتہ کرتے ہوئے گزرے واقعات اس کے تصورات میں کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔

مایوسی کی گرم راکھ سارے وجود پر بکھرنے لگی۔ اسے شدت سے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ بے سائبانی اور عدم تحفظ نے اسے بے چین کر دیا۔ اسے گرد و پیش سے، سارے رشتوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ بہت آہستگی سے توس کھاتے ہوئے وہ آنے والے وقت کو سوچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ کوئی چیز واضح اور صاف نظر نہیں آتی تھی، نہ یقین تھا...... نہ اعتماد نہ کوئی امید نہ توقع...... اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے، کچھ طے کرنے سے عاری تھا...... چائے کی پیالی کب کی خالی ہو چکی تھی۔ وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آنکھیں کھولے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ پہلے سے بہتر نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے کی زردی بھی اب کم ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائے۔

''بہت پیٹو ہو تم...... اتنا لمبا ناشتہ کرتی ہو؟''

ان کے شگفتہ انداز نے خضرا کی پژمردگی قدرے کم کر دی۔ ان کی حالت میں بہتری نے اسے اطمینان دیا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا، ان کے کپڑے گرد آلود اور کہیں کہیں خون کے دھبے بھی تھے۔ وہ اجلے بستر پر لیٹے ہوئے اور بھی پراگندہ معلوم ہو رہے تھے۔ خضرا کو ندامت ہوئی۔ اس وقت وہ تنہا زخمی اور مجبور تھے تو اسے ان کی نیکی اور اچھائی کو لوٹانا چاہئے تھا۔ انہوں نے نہ اس سے کچھ پوچھا تھا نہ کچھ کہا تھا۔ ان کے مہربان رویے نے اسے پریشانی سے بچا لیا تھا۔ وہ اپنائیت اور احسان مندی کے جذبے سے ان کی طرف بڑھی اور محتاط لہجے میں بولی۔

''آپ لباس تبدیل کر لیں...... کپڑے بہت گندے ہو رہے ہیں۔''

''ہاں...... تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی...... جیتی رہو۔'' انہوں نے ممنون لہجے میں کہا۔

خضرا نے انہیں تولیہ گیلا کر کے دیا۔ جب تک انہوں نے چہرہ صاف کیا، خضرا نے ان کے کپڑے نکال دیئے اور خود دوسرے کمرے میں آ گئی۔

اس نے بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھا، الماریاں بند کیں، کھلے ہوئے اٹیچی کیسوں میں سامان واپس رکھ کر انہیں سمیٹ دیا۔ وہ کافی دیر کے بعد کمرے میں آئی تو

انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بالکل بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ صاف لباس اور سلیقے سے جمے ہوئے بالوں نے ان کی وجاہت کو نمایاں کر دیا تھا۔ اس نے ان کے کپڑے اٹھا کر غسل خانے میں رکھے اور ان کی سہولت کے خیال سے پوچھا۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

وہ کھل کر مسکرائے۔ ''خوش رہو بیٹی...... تمہیں تکلیف تو ہو گی، ذرا مجھے ایک گلاس گلوکوز لا دو۔''

خضرا ان کے لئے گلوکوز لائی تو وہ خود ہی پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! آج تمہیں بہت سارے کام کرنے پڑیں گے...... گھبراؤ گی تو نہیں؟''

خضرا نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ انہوں نے خالی گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا اور بولے۔ ''سنو، گیٹ پر سے جا کر اخبار اٹھاؤ۔ ذرا دیکھیں تو سہی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔''

خضرا کچھ گھبرائی...... ٹھیکیدار کا خوف ابھی تک اس کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ٹھیکیدار کی سرخ آنکھیں ہر طرف خود کو تلاش کرتی نظر آتی تھیں...... اس نے پریشانی سے ہونٹ چبائے۔

''اگر تم گیٹ کی طرف نہیں جانا چاہتیں تو کوئی ضروری نہیں...... ہم ریڈیو پر خبریں سن لیں گے۔ اخبار تو ویسے بھی رنگین تصویریں ہی دیکھنے کے کام آتا ہے۔'' انہوں نے جیسے اس کی آنکھوں سے اس کے تذبذب کو پڑھ کر کہا۔

خضرا گھبرائی۔ ''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ بچی! میں جانتا ہوں کہ کوئی ایسی ہی بات ہے۔'' انہوں نے وثوق سے کہا۔ خضرا انہیں جھٹلا نہیں سکی اور غیر ارادی طور پر قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ٹرانسسٹر اٹھایا اور اس کی سوئی گھما کر خبریں تلاش کرنے لگے۔ خضرا گود میں ہاتھ رکھے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ انہوں نے بھی خود سے کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں نیوز ریڈر کی آواز گونجتی رہی جو تمام دنیا کی خبریں سنا رہا تھا۔ لیکن خضرا کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ کبھی اس کے ذہن میں گزرے واقعات ایک ایک کر کے

گردش کرنے لگتے اور کبھی مستقبل کی دھندلاہٹیں اس کی سوچوں کو خوفزدہ کر دیتیں...... جانے وہ کب تک اسی طرح کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔

کلاک نے گھنٹہ بجایا تو اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ بستر میں دراز ابھی تک کسی اور زبان کی خبریں سن رہے تھے۔ خضرا کو رات ابھی تک یہیں ٹھہرنا تھا اسی لئے اس دوران اسے ان کا خیال بھی رکھنا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ان کو مخاطب کیا۔

''آپ دن کو کھانے میں کیا پسند کریں گے...... مجھے بتا دیں تو میں پکا دوں۔''

انہوں نے ٹرانسسٹر کا بٹن دبا کر اسے بند کر دیا اور خضرا کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں بیٹی...... تم کیا کہہ رہی تھیں...... میں نے سنا نہیں۔''

''میں کھانے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں......'' خضرا نے دوہرایا۔

''ابھی تو کھانے کا وقت نہیں ہوا۔'' انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پکانے میں بھی تو کچھ وقت لگے گا...... اس لئے میں نے سوچا پہلے ہی پوچھ لوں۔'' خضرا نے بتایا۔

''بیٹی میں تو پرہیزی کھانا کھاتا ہوں...... وہ فریج میں پکا ہوا رکھا ہے۔ تم اپنے لئے کچھ پکا لو۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں...... میں بھی وہی کھا لوں گی۔'' خضرا نے بہ عجلت جواب دیا۔

''تکلف تو نہیں کر رہی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں......'' خضرا نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر تم یہ کرو کہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھولو اور جا کر آرام کرو۔ تمہاری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے۔'' انہوں نے کمرے میں سے نظر آنے والے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

خضرا جھجک گئی تو وہ اس کی ہچکچاہٹ بھانپ کر بولے۔

''گھبراؤ نہیں...... وہ عینی اور نینا کا کمرہ ہے۔ دروازہ اندر سے لاک کر لو۔ تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ تم بہت تھکی ہوئی نظر آتی ہو...... لگتا ہے رات بھر نہیں سوئیں۔'' ان کے انداز میں دوستانہ اپنائیت تھی۔

ان کے احساس دلانے سے خضرا کو بھی اس پریشان رت جگے کی تھکن کا بوجھ اپنے

انگ انگ پر محسوس ہونے لگا جسے عذاب کی طرح جھیل کر وہ یہاں پہنچی تھی۔ ان کی اپنائیت سے اس کی ہچکچاہٹ دور ہو گئی۔ وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کر اس کمرے میں چلی آئی جسے وہ عینی اور نینا کا کمرہ کہہ رہے تھے اور جس کی ترتیب اس نے ابھی ابھی درست کی تھی۔

وہ دیکھنے میں ہی نوجوان لڑکیوں کا کمرہ نظر آتا تھا۔ شوخ رنگوں اور رنگین پوسٹروں سے سجا ہوا۔ شیلف میں فیشن میگزین اور گانوں کی آڈیو کیسٹس ٹھنسی ہوئی تھیں۔ ایک جانب دو منزلہ پلنگ اور لکھنے کی میز تھی۔ دوسری طرف ایک کونے میں سنہری غالیچہ بچھا ہوا تھا جس پر سرخ کشن رکھے تھے۔ خضرا نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی جس پہ بچھے ہوئے نیلے رنگ کے پلنگ پوش پر بڑی بڑی تصویریں اور کارٹون چھپے ہوئے تھے۔

اس کے دل میں ابھی تک شبہات امنڈ رہے تھے۔ اس کا اعتماد بار بار ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ اسے اب تک اعتبار نہیں آیا تھا کہ اس اجنبی چھت تلے وہ محفوظ ہے۔ ان کا مہربان رویہ اسے بار بار یقین دلاتا تھا لیکن اس کے اندر کا خوف اسے پھر زائل کر دیتا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر دروازے کا لاک دیکھا، کھڑکی میں چٹخنی لگائی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر دوسری طرف کھلنے والے دروازے کو اچھی طرح سے بند کیا اور پوری طرح سے اطمینان کر کے تکیے پر سر رکھا۔

نیند سے اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بستر کی ملائمت نے آغوش میں لیا تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پریشانیاں، تفکرات، خوف اور اندیشے بھی اسے گہری نیند میں کھو جانے سے روک نہیں سکے۔

✿......✿

نہ جانے وہ کتنی دیر وقت اور ماحول کے سارے بندھنوں سے دور نیند کی وادی میں آسودہ رہی۔ پھر ایک مہذب دستک نے اسے ہوشیار کیا۔ اس نے نندا سی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ایک اجنبی گھر میں ہے اور نہ جانے کب سے بے خبر سو رہی ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی، تین بج چکے تھے۔

دروازہ پھر بجا...... وہ تیزی سے اپنے کپڑے درست کرتی، بالوں کو ہموار کرتی دروازے کے قریب پہنچی۔ اس کے ہاتھ لاک کھولنے لگے تو خوف نے اسے روک لیا۔ بند

دروازے کے اس طرف نہ جانے کون تھا۔ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو بیٹی......'' مدھم سی آواز کے ساتھ پھر دستک ہوئی۔

خضرا کی جان میں جان آئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ باہر کھڑے تھے۔ دیوار کا سہارا لئے ہوئے۔

''بہت خوب بیٹی......تم تو گھوڑے گدھے سب کچھ بیچ کر سو گئی تھیں اور یہاں بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ پڑھ کر تھک گئی ہیں۔'' ان کی آواز میں نقاہت تھی۔

''اوہ......آپ یہاں تک کیسے آ گئے......کہیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔''

خضرا نے بے ساختہ سہارا دینے کو ان کا بازو تھام لیا۔

''نہیں......اب تو پہلے سے بہت بہتر ہوں۔'' انہوں نے اس کا سہارا لے کر چلتے ہوئے جواب دیا۔

خضرا انہیں بستر تک لے گئی اور قدرے ندامت سے بولی۔

''مجھے افسوس ہے کہ مجھے نیند میں پتہ ہی نہیں چلا۔ بہت دیر ہو گئی کھانے میں۔ آپ نے مجھے پہلے جگا لینا تھا۔''

''نہیں......میں اب بھی جگانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ تم بہت تھکی ہوئی ہو لیکن اکیلے کھانا کھانا بھی تو اچھا نہیں لگتا......اور پھر عینی اور نینا نے مجھے اتنا بگاڑ دیا ہے کہ بیٹی گھر میں موجود ہو تو میں فوراً ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کوئی کام کرنے کا موڈ ہی نہیں بنتا۔'' وہ خوش مزاجی سے بولے۔

خضرا کے لئے ان کی یہ خوش طبعی اجنبی سی تھی۔ اس نے ان جیسے مردوں کی ہمیشہ تیوری ہی چڑھی دیکھی تھی۔ ان کے ہونٹوں سے گالیاں ابلتیں اور انہیں چنگھاڑتے ہوئے درشت لفظ ہی اگلتے سنا تھا۔ اسے ان کا ملائم اور شگفتہ لہجہ بہت نیا اور انوکھا سا لگا......اس کے اپنے ہونٹوں پر بھی آپ سے آپ مسکراہٹ چمک اٹھی۔ اس نے بڑے لگاؤ سے کہا۔

''نہیں......ابھی تو آپ کو بستر سے نہیں اٹھنا چاہئے۔''

''ہاں......جس بات سے مجھے چڑ ہے وہی میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔'' وہ بولے۔

خضرا نے فریج میں رکھے ہوئے کچھ کھانے نکال کر گرم کئے اور ٹرالی میں سجا کر اسے ان کے بستر کے ساتھ ہی لگا دیا۔ وہ اسے بھی بے تکلفی سے کھانا کھانے کی تاکید کرتے رہے۔

کھانے سے فراغت پاتے، برتن دھو کر خشک کرتے، چائے وغیرہ بناتے خاصا وقت بیت گیا۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ ٹی وی پر کوئی میچ دیکھ رہے تھے۔

خضرا بھی قریب ہی بیٹھ کر میچ دیکھنے لگی۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ بے چینی اسے کسی کل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اس کی نگاہ بار بار کھڑکی سے باہر شفق کے رنگوں پر پڑ رہی تھی جو ہولے ہولے ملگجی شام میں ڈھل رہے تھے۔ رات کی جھکی ہوئی تاریکیاں اسے دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر سکتی تھیں۔

وہ چپ چپاتے یہاں سے نکل سکتی تھی۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ دلچسپی سے میچ دیکھ رہے تھے۔

اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا، سنبھل کر بیٹھی اور کچھ دیر کو اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے تیار کرتی رہی، پھر ہمت کر کے انہیں مخاطب کیا۔

''آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''نہیں بیٹی......شکریہ۔'' انہوں نے ٹی وی سے نگاہ ہٹائے بغیر کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور محتاط سے لہجے میں بولی۔

''میں جانا چاہتی ہوں۔''

''ہیں......کیا، کیا......؟'' انہوں نے رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی......مجھے اجازت دیجئے......میں جا رہی ہوں۔'' خضرا نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے تکیے کے نیچے سے ریموٹ کنٹرول نکال کر ٹی وی بند کر دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں بولو......کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

''وہ جی، میں جا رہی ہوں۔'' خضرا کو پھر دوہرانا پڑا۔

''ذرا بیٹھو......'' انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ خضرا بیٹھ گئی۔

''کہاں جاؤ گی......؟'' انہوں نے پوچھا۔

خضرا اگڑبڑائی لیکن فوراً ہی جھوٹ بول گئی۔ ''گھر......''

''گھر......؟'' انہوں نے دوہرایا۔ ''تم کون سے گھر کی بات کر رہی ہو؟...... کیونکہ میں اتنا تو جانتا ہوں کہ تم اس گھر میں نہیں جاؤ گی جس کو تم چھوڑ چکی ہو۔''

یہ بات خضرا کے دل پہ جا لگی۔ وہ اذیت سے ہونٹ چباتی ہوئی بولی۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں...... میں نے وہ گھر خود نہیں چھوڑا۔''

''نہیں بیٹی...... میں غلط نہیں سمجھ رہا...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ بیٹیاں خود گھر نہیں چھوڑتیں...... انہیں اس پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔'' انہوں نے بردباری سے کہا۔

خضرا کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ اپنے آنسو چھپاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''اچھا...... میں چلتی ہوں...... نہیں تو رات گہری ہو جائے گی۔''

''بیٹی! میری ایک بات سن لو...... پھر جی چاہے تو چلی جانا۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''جی......؟'' خضرا نے پلکیں جھپک کر ان کی طرف دیکھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے ملائمت سے کہا۔ خضرا پھر بیٹھ گئی۔

''بیٹی میں تمہیں شکل سے احمق تو نہیں نا لگتا؟'' انہوں نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

خضرا اسٹپٹائی...... ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں...... مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ میں تمہیں شکل سے احمق تو نہیں لگتا؟'' انہوں نے اصرار کیا۔

''آپ اس طرح نہ کہیں...... آپ بڑے ہیں۔'' خضرا نے جلدی سے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات...... میں بڑا ہوں ناں؟'' انہوں نے کہا۔

''جی......'' خضرا نے ان کی تائید میں ہنکارا بھرا۔

''میرا تجربہ بھی تم سے زیادہ ہے...... چلو تھوڑا ہی سہی۔'' وہ بولے۔

خضرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو گویا میں ہر لحاظ سے تمہیں مشورہ دینے کا اہل ہوں ناں؟'' انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''جی......'' خضرا نے سعادت مندی سے ہنکارا بھرا۔

''تو پھر تم اس طرح کرو بیٹی کہ اگر سب کچھ نہیں تو کم از کم مجھے اپنے بارے میں اتنا بتاؤ کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ تم گھر چھوڑنے پر کیوں مجبور ہوئی ہو اور اس وقت تم کہاں جانا چاہتی ہو؟...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں اچھا مشورہ دوں۔ تمہیں پسند آئے تو بہت اچھی بات ہے اور اگر نہ پسند آئے تو یقیناً اس میں میرا ہی قصور ہو گا کہ میں تمہیں مطمئن نہیں کر سکا۔'' انہوں نے نپے تلے لہجے میں تفصیل سے سمجھایا۔

خضرا نے شدتِ کرب سے اپنے ہونٹ کاٹے۔ یہ سب کچھ کتنا اذیت ناک تھا۔ اپنی ہی ذلت کا اعتراف کس قدر دشوار تھا۔ اسے کوئی لفظ نہیں سوجھ رہا تھا جو رشتوں کے گہنا جانے کا حال کہہ سکے، جو اعتماد کے لٹنے اور عزتوں کے بھاؤ لگنے کی کہانی کہہ سکے۔ حقیقتوں کا تلخ ذائقہ نوکِ زبان پر لانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکایا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بس آپ مجھے جانے دیں۔''

''اچھا...... تم نہیں بتانا چاہتی تو ظاہر ہے اس میں تمہاری کوئی مصلحت ہو گی۔ مگر میں تمہیں اتنا ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تمہارے پاس کوئی محفوظ پناہ گاہ نہیں تو تم پھر انہی حالات میں گھر سکتی ہو جن سے تم گزر کر آئی ہو۔ اور بیٹی! طوفان میں گھر جانے والوں کی سلامتی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''جو گھر کی چھت تلے بھی محفوظ نہ ہو اس کے لئے گھر باہر سب ایک جیسا ہے۔'' خضرا نے دکھی لہجے میں کہا اور ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے چلے ہی جانا چاہئے...... آپ مجھے اجازت دیجئے۔''

''میری طرف سے اجازت ہی اجازت ہے...... لیکن میرا خیال ہے کہ تم جیسی پیاری بیٹی اتنی بے حس تو نہیں ہو سکتی کہ ایک بیمار انسان کو تنہا چھوڑ کر چلی جائے۔'' انہوں نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

خضرا خفیف ہو گئی۔

''آپ کے گھر کے لوگ کب تک آ جائیں گے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' انہوں نے شانے اچکائے۔ ''کیونکہ وہ ناٹی گرلز عینی اور نینا

ہیں نا، انہیں سرپرائز دینے کا بہت شوق ہے...... کوئی عجب نہیں کہ آج ہی دندناتے ہوئے چلے آئیں۔"

"ان کے آنے تک میں یہیں رہوں گی۔" خضرا نے جیسے دل ہی دل میں فیصلہ کر کے کہا۔

"چلو تمہیں مجھ بیچارے پر ترس آ ہی گیا۔" وہ ہنسے اور تکیے کے نیچے سے ریموٹ کنٹرول نکال کر ٹی وی آن کرتے ہوئے بولے۔ "لڑکی! تم نے مجھے باتوں میں لگا لیا، میچ پتہ نہیں کہاں سے کہاں نکل گیا ہوگا۔" وہ پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے اور یوں انہماک سے میچ دیکھنے لگے جیسے گردوپیش سے بے خبر ہوں۔

خضرا کا دل و دماغ بے پناہ تفکرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر عینی اور نینا کے کمرے میں آ گئی لیکن سکون کہیں نہیں تھا۔ وہ کبھی بے چینی سے ٹہلنے لگتی کبھی کوئی کتاب دیکھتی کبھی دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹرز۔ لیکن اس کے ذہن پر چھائے ہوئے خوف اور اندیشے اسے اسی طرح پریشان کرتے رہے۔ سوچوں کی ڈور الجھی ہی رہی۔ مستقبل پر چھائی ہوئی دھند کے پار کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکا۔

نہ جانے بے خیالی میں کتنا وقت گزر گیا۔ وہ گھڑی دیکھ کر چونکی۔ اسے خیال آیا کہ وہ ان کی طرف سے غافل ہی ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور ان کے کمرے میں جھانکا۔

ٹی وی بند تھا اور وہ خاموشی سے بستر میں دراز تھے۔ وہ نپے تلے قدم رکھتی ان کے بستر کے قریب آئی۔

"کھانا گرم کروں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی...... موڈ نہیں ہے۔" ان کی آواز میں نقاہت تھی۔

خضرا نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی سرخی تھی اور آنکھیں کھولنی جیسے دشوار ہو رہی تھیں۔ خضرا کو تشویش ہوئی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بس یونہی کچھ حرارت سی ہو گئی ہے۔" انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

خضرا نے جھجکتے جھجکتے ان کی پیشانی کو چھوا اور پریشان ہوئی۔

"آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔"

"اوں ہوں...... مریض کے سامنے اس کی بیماری کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کرتے۔ اس کے دل پر اثر ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنے لہجے کو شگفتہ بنانے کی کوشش کی۔

"بخار واقعی تیز ہے...... کہیں تھرمامیٹر ہو تو میں دیکھ لوں۔" خضرا نے کہا۔

"تھرمامیٹر یہاں دراز میں پڑا ہے...... اگر وہ شریر لے نہیں گیا۔" انہوں نے بتایا۔

خضرا نے تھرمامیٹر لگایا، حرارت زیادہ تھی۔ وہ فکرمندی سے بولی۔

"کسی ڈاکٹر کو بلا لینا چاہئے۔ آپ کو بخار تیز ہے۔"

"چھوڑو بیٹا...... ڈاکٹر کو کیا تکلیف دینی ہے...... خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا لیکن نقاہت سے ان کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

"نہیں...... اس طرح نہ کریں۔ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ کسی ڈاکٹر کو بلا لینا چاہئے۔ اب مجھے تو کچھ پتہ بھی نہیں۔" خضرا نے فکرمندی سے اصرار کیا۔

"تم مجھے میری دوائی دے دو۔ باقی صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

خضرا نے ان کی دوائی کی شیشی میں سے گولیاں نکالیں اور پانی کا گلاس میز پر رکھ کر انہیں اٹھنے میں مدد دینے کے لئے ذرا سا جھکی۔

"اٹھئے...... دوائی لے لیجئے۔" اس نے کہا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے اور آنکھیں بند کئے اسی طرح تکیے پر سر رکھے لیٹے رہے۔ خضرا نے ان کا شانہ ہلایا۔

"پلیز اٹھیں۔"

ان کی پلکوں میں ایک بار ہلکی سی جنبش ہوئی اور وہ اسی طرح غافل پڑے رہے۔ خضرا گھبرائی۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے...... طبیعت زیادہ خراب تو نہیں؟ پلیز آنکھیں کھولیں...... یہ دوائی لے لیں۔" خضرا نے بار بار کہا۔

وہ صرف ہوں ہاں کر کے رہ گئے۔

خضرا پریشان سی ہو گئی۔ ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بخار کی شدت نے انہیں بے سدھ کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں خالی ویران گھر میں انہیں

اس طرح بے ہوش دیکھ کر خضرا خوفزدہ سی ہو گئی۔ وہ نہ کسی ڈاکٹر کو بلا سکتی تھی نہ کوئی حوصلہ دینے والا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے...... بار بار یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی۔

بخار کی شدت کو کم کرنے کے لئے وہ ان کی پیشانی پر ٹھنڈی پٹیاں رکھنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں دعا بھی مانگ رہی تھی، بار بار انہیں پکارتی تھی کہ شاید وہ ہوش میں آئیں تو وہ انہیں دوائی کھلا دے۔

نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح ان کی پیشانی پر پٹیاں رکھتی رہی۔ بخار کا زور کچھ کم ہوا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں جو بخار کی حدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خضرا نے پھر انہیں پکارا۔ اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ ان کی بگڑتی ہوئی حالت نے خضرا کو بے حد متفکر کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح ان کی تکلیف میں کمی کر دے...... انہیں غافل پڑے دیکھ کر وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اچانک کال بیل کی آواز سارے گھر میں گونج اٹھی۔ خضرا بری طرح چونکی۔ اس وقت دروازے پر کون ہو سکتا تھا؟ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ کہیں ان کے گھر والے تو نہیں؟ اس خیال نے اسے تقویت دی لیکن وہ یہ سوچ کر گھبرا سی گئی کہ وہ اسے یہاں دیکھ کر کیا خیال کریں گے؟ وہ انہیں کیا بتائے گی کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟

نہ معلوم وہ کیسے لوگ ہوں گے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

گھنٹی ایک مرتبہ پھر تیز آواز میں چیخی...... خضرا اچھل پڑی۔ اس نے پریشان ہو کر ان کا شانہ ہلایا۔

"باہر پتہ نہیں کون گھنٹیاں بجا رہا ہے...... مجھے بتائیں میں کیا کروں...... پلیز آنکھیں کھولیں۔"

لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں لیکن ان میں کوئی پہچان نہیں تھی۔

گھنٹی پھر مسلسل آواز میں بجنے لگی۔ خضرا کو اٹھنا پڑا۔ اسے معلوم کرنا ہی پڑے گا کہ

دروازے پر کون ہے...... اگر وہ ان کے گھر کے لوگ تھے تو انہیں بہرحال اندر آنا ہی تھا۔ اسے جلد یا بدیر اس لمحے کا سامنا کرنا ہی تھا جو اسے مشکوک نگاہوں کا ہدف بنانے والا تھا تو پھر اسے ابھی اس کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے تھا۔

اس پر جو گزرنی تھی وہ تو گزرنی ہی تھی...... لیکن شاید اس طرح ان کے لئے کچھ ہو سکتا تھا جو بخار میں بے سدھ پڑے تھے۔

اس نے خود کو آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار کیا اور تیز قدموں سے گیٹ کی طرف چلی گئی۔

"کون ہے......؟" اس نے دروازہ کھولے بغیر بلند آواز میں پوچھا۔

"دروازہ کھولو عینی کی بچی...... میں ابھی تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔" جواباً ایک مردانہ آواز نے بے تکلفی سے کہا۔

خضرا کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ گھر کا کوئی آدمی ہے۔ اس نے دروازے کی کنڈی کھول دی اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتی کمرے میں واپس آ گئی۔ وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خود کو حوصلہ دینے لگی۔

کمرے کی جانب قدموں کی چاپ بڑھی تو وہ پسینے پسینے ہو گئی۔

دروازہ کھلا اور ایک دراز قد وجیہہ نوجوان ہاتھ میں بریف کیس تھامے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کی نگاہ سیدھی خضرا تک آئی۔ وہ وہیں ٹھٹک گیا اور قدرے حیرت سے بولا۔

"آپ کون ہیں......؟"

خضرا غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے اٹھی اور گھبراہٹ میں پھر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے کچھ کہا نہیں تھا کہ اس کی دوسری نگاہ بیڈ پر پڑی۔ اس نے لمحے بھر کو آنکھیں سکیڑیں، غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"یہ پاپا کو کیا ہوا ہے؟"

وہ پُر تشویش لہجے میں کہتا ہوا آگے بڑھا اور پلنگ کے قریب پہنچ کر اس نے ان کی پیشانی کو چھوا۔ پھر دونوں آنکھیں باری باری کھول کر دیکھیں اور خضرا کی طرف پلٹا۔

"انہیں تو بہت تیز بخار ہے...... اور آپ...... آپ کیا نرس ہیں؟"

"جی...... جی نہیں...... جی ہاں!! میں نرس ہوں......" خضرا کو اپنے وہاں ہونے کا معقول جواز خود بخود مل گیا۔

"یہ کس قسم کی نرس ہیں آپ؟ کچھ ہوش ٹھکانے ہیں آپ کے؟ آپ کا مریض بے

ہوش پڑا ہے اور آپ بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی کو بتایا آپ نے ان کی حالات کے بارے میں...... کون سی میڈیسن دے رہی ہیں؟...... ٹمپریچر کب لیا تھا...... کیا ہے ٹمپریچر......؟" اس نے ایک ہی سانس میں کتنے ہی سوالات پوچھ لئے۔

"جی ٹمپریچر تو ایک سو تین ہے...... میں برف کی پٹیاں رکھ رہی ہوں۔" خضرا نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"خاک رکھ رہی ہیں آپ پٹیاں...... ان کی حالت اتنی خراب ہے تو آپ نے ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلوالیا؟ یہ آپ کس قسم کی نااہل نرس ہیں...... یہ ڈاکٹر یزدانی نے کہاں سے آپ کو بھرتی کر لیا ہے...... اُفوہ......!" اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

خضرا روہانسی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے بارے میں کیا بتائے اور کس طرح بتائے...... وہ فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈاکٹروں والا سیاہ بیگ تھا۔ اس نے جلدی جلدی اسٹیتھسکوپ نکالا، معائنہ کیا، ٹمپریچر لیا اور اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

"نرس...... ذرا جلدی سے سرنج وغیرہ بوائل کر کے لاؤ۔"

خضرا کو سرنج کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے بیگ میں جھانکا اور اندازے سے سرنج کی ڈبیہ نکالی۔ کچن میں اسے ابال کر وہ واپس آئی تو وہ سر پکڑے کرسی پر بیٹھا تھا۔

اس کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی اس نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"آخر یہاں ہوا کیا ہے؟...... پاپا زخمی بھی ہیں...... انہیں اس قدر تیز بخار ہے اور آپ خود کو نرس بتاتی ہیں لیکن یونیفارم کے بغیر بڑے مزے سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تماشہ دیکھ رہی ہیں...... باقی سب لوگ کہاں ہیں؟ یہ کیا ہوتا رہا ہے اس گھر میں؟"

"مجھے کچھ زیادہ پتہ نہیں...... لیکن جو کچھ مجھے پتہ ہے وہ میں آپ کو بتا دوں گی۔ مگر پہلے پہلے آپ ان کا تو کچھ کیجئے۔ انہیں کچھ نہ ہو جائے۔ میں ان کے لئے بہت پریشان تھی۔ شکر ہے کہ آپ آ گئے ہیں۔" خضرا نے اٹکتے ہوئے کہا۔

اس نے الجھ کر سر جھٹکا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" اور جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے سرنج لی، انجکشن لگایا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کون سی میڈیسن دیتی رہی ہیں آپ ان کو؟"

"کوئی بھی نہیں۔" خضرا نے گڑبڑا کر کہا۔

"کوئی بھی نہیں...... کیا مطلب؟......" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"دراصل میں کوئی نرس وغیرہ نہیں ہوں...... میں تو...... میں تو کسی وجہ سے یہاں پناہ لینے آ گئی تھی۔ یہ باہر نالے میں زخمی پڑے تھے۔ میں انہیں اندر لے کر آئی تو انہیں بخار چڑھ گیا...... ویسے پہلے تو ٹھیک تھے۔ شاید آپ کے یہاں کوئی چوری ہوئی ہے، بس مجھے اتنا ہی پتہ ہے۔" خضرا نے سچ بول دینے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ جو تم کہانی بیان کر رہی ہو، سچ ہے؟" اس کا لہجہ بے حد کڑوا تھا۔

"جی...... جی ہاں...... میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ اپنے پاپا سے پوچھ لیجئے گا۔ یہ آپ کو بتا دیں گے کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔" خضرا نے اسے یقین دلانے کو کہا۔

لیکن شاید اسے یقین نہیں آیا۔ وہ چند لمحے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ خضرا ایک جانب سہمی ہوئی سی کھڑی دل ہی دل میں ان کے ہوش میں آ جانے کی دعائیں مانگتی رہی۔

خاصی تگ و دو کے بعد بالآخر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ان پر جھکا کھڑا تھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اس کا رخسار چھوا اور نقاہت آلود آواز میں بولے۔

"مثیم بیٹے...... تم کب آئے؟"

"پاپا...... آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ ان سے پوچھنے لگا۔

وہ بڑی کوشش سے مسکرائے۔

"ڈاکٹر تو تم ہو...... تم بتاؤ میری طبیعت کا حال۔"

"آپ پہلے سے بہت بہتر ہیں...... ٹمپریچر بھی کم ہو گیا ہے۔" وہ بڑے لگاؤ سے بولا۔

"تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا آتے ہی میرے سرہانے بیٹھ گئے ہو؟" انہوں نے

پوچھا۔

"آپ میرے کھانے پینے کی فکر نہ کریں اور بس جلدی سے اچھے ہو جائیں۔ اس طرح بیمار پڑے ہوئے آپ بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔" وہ خوش مزاجی سے کہنے لگا۔

"تم آ گئے ہو تو میں ٹھیک کیوں نہیں ہوں گا؟" انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا، پھر تکیے سے سر اٹھا کر کمرے میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس سے بولے۔

"دیکھنا...... کمرے میں ایک اچھی سی لڑکی بھی بیٹھی ہوئی ہے...... اس سے کہو تمہیں کھانا گرم کر دے...... میری فکر نہ کرو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

"آپ میرے لئے پریشان نہ ہوں...... میں خود بھی کھانا گرم کر لوں گا۔" وہ بولا۔

"تم کیوں کھانا گرم کرو گے؟ گھر میں بیٹیاں ہوں تو لڑکے ایسے کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔" انہوں نے اسے ٹوکا۔

خضرا تک بھی ان کی ہانپتی ہوئی آواز پہنچ رہی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور محتاط سے لہجے میں بولی۔

"آپ پاپا کا خیال رکھیں...... میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔"

"نہیں...... اس وقت نہیں۔" وہ پلٹ کر بولا۔ "ہاں چائے کی ایک پیالی مل جائے تو......"

خضرا نے کچن میں آ کر چائے بنائی، برتن ٹرالی میں جما کر وہ کمرے میں آئی تو مثیم پاپا کی پیشانی پر پٹیاں رکھ رہا تھا۔

"آپ کے لئے چائے بناؤں......؟" خضرا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بنا دو...... چینی مت ڈالنا۔" اس نے جواب دیا اور پاپا پر جھک کر بولا۔ "پاپا آپ کچھ لے لیں...... دودھ، جوس وغیرہ۔"

"نہیں، ابھی موڈ نہیں۔" انہوں نے منع کر دیا۔

خضرا نے اپنے لئے بھی چائے بنائی اور مثیم کو اس کی پیالی تھما دی۔ اس نے شکریہ کہہ کر چائے اس کے ہاتھ میں لے لی۔ پاپا پر شاید پھر نقاہت کا غلبہ تھا۔ وہ چپ لیٹے تھے۔ مثیم خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ خضرا بھی چپ تھی۔ کمرے میں تیرتی ہوئی خاموشی کچھ زیادہ بری نہیں لگ رہی تھی۔ خضرا کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ان اجنبی اور انجان لوگوں کے

درمیان غیریت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی کسی طرح کا کوئی خوف ہی اسے دامن گیر تھا۔ وہ اس طرح مطمئن تھی کہ جیسے کبھی اپنے گھر میں بھی نہیں ہوئی تھی۔

مثیم چائے کی پیالی ٹرالی پر رکھتے ہوئے بولا۔

''تم پاپا کا خیال رکھو...... میں ابھی فریش ہو کر آتا ہوں۔''

خضرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ مثیم اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ اٹھ کر پاپا کے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے تھے۔ اس نے ہولے سے ان کی پیشانی چھو کر دیکھی، بخار پہلے کی نسبت بہت کم تھا۔ اس کے دل کو اطمینان سا ہو گیا۔ مثیم کے آجانے سے اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ اب اسے ان کی جانب سے فکرمندی نہیں تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور مثیم اندر داخل ہوا...... وہ نہا دھو کر تازہ دم ہو آیا تھا۔ خضرا نے پہلی بار اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ پاپا سے بہت مشابہ تھا اور انہی کی طرح دراز قد اور وجیہہ تھا۔ وہ قمیض کی آستینیں لپیٹتا ہوا پاپا کے بیڈ کے قریب آیا، ان کی نبض دیکھی اور خضرا کی طرف مڑ کر بولا۔

''تم اب جا کر سو جاؤ...... خاصی رات ہو گئی ہے۔''

خضرا کرسی سے اٹھ تو گئی لیکن کمرے سے باہر جانے کی بجائے وہیں کھڑے کھڑے بولی۔

''آپ آرام کرلیں...... میں ان کا خیال رکھوں گی۔''

''تم ڈاکٹر ہو؟'' اس نے غیر متوقع سوال کیا۔

''نہیں تو......'' خضرا نے شپٹا کر انکار کیا۔

''تو بس پھر جا کر آرام سے سو جاؤ...... پاپا کو ابھی ڈاکٹر کی ضرورت ہے...... انہیں کچھ انجکشن وغیرہ لگنے ہیں۔ پھر میں ان کا ٹمپریچر نارمل تک لانے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے بے حد نرمی سے سمجھایا۔

خضرا قائل ہو گئی۔ چلنے لگی تو پھر سوچ کر رکی۔

''آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''چائے ہے تھرماس میں؟'' مثیم نے پوچھا۔

''جی......'' خضرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس ٹھیک ہے...... تم جاؤ......'' وہ اس کی جگہ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''کوئی ضرورت ہو تو مجھے جگا لیجئے گا۔'' خضرا نے خوش اخلاقی سے کہا۔

مثیم نے سر ہلایا اور خضرا کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے سورج کی بہت ساری شعاعیں جھانک جھانک کر اس کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے کمرے میں پھیلی ہوئی دھوپ ملی روشنی کو دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک ساڑھے آٹھ بجا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ سی ہو گئی۔ غسل خانے میں جا کر جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر اس نے آئینے میں دیکھ کر اپنے بال ہاتھوں سے ہی برابر کئے اور دروازہ کھول کر پاپا کے کمرے کی طرف لپکی۔

ہلکی سی دستک کے جواب میں پاپا کی آواز سن کر اسے ایسی خوشگوار سی مسرت کا احساس ہوا جو اس نے اس سے قبل کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ پاپا پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر انہیں سلام کیا اور پوری سچائی سے بولی۔

''شکر ہے آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔''

انہوں نے ناک پہ رکھی ہوئی سنہری فریم کی عینک پر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آؤ آؤ...... جیتی رہو...... کہو، خوب اچھی طرح سوئیں؟''

''اچھی طرح...... میں تو اتنی دیر تک سوتی رہی ہوں کہ مجھے شرم آرہی ہے۔ آپ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ میں بھی کتنی......'' اس نے اظہار ندامت میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تمہیں شرمانے کی ضرورت نہیں...... میں کچھ نہیں کہہ رہا...... مجھے پتہ ہے تم کل رات کی جاگی ہوئی ہو۔ اتنا تو تمہیں سونا ہی تھا۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔

''اب آپ کیسے ہیں؟'' اس نے بڑے لگاؤ سے پوچھا۔

''خدا کا شکر ہے بھئی...... اب تو کافی بہتر ہوں۔ مثیم بیچارا رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہا ہے۔'' انہوں نے بتایا اور پھر جیسے انہیں اچانک یاد آیا۔ ''ارے بھئی وہ بیچارا مثیم

کچن میں گھسا ہوا کچھ ناشتہ وغیرہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے رات بھی کچھ نہیں کھایا اسی لئے اسے جلدی تھی۔ تم ذرا دیکھو جا کے۔ کہیں کچھ اور گڑبڑ ہی نہ کر دے..... اسے اس قسم کے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ جاؤ تم۔'' وہ اتنا کہہ کر پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

خضرا اٹھ کر کچن کی جانب چلی۔ کچھ جھجک، کچھ ندامت اسے پشیمان کر رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی تو مثیم انڈا تلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

خضرا ہچکچاتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور محتاط سے لہجے میں بولی۔

''آپ پاپا کے پاس چل کر بیٹھیں..... میں ناشتہ بنا لیتی ہوں۔''

''سوری.....تم بہت لیٹ ہو گئی ہو.....اب تو میں نے سارا کام کر لیا ہے۔'' وہ اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر بولا۔

خضرا خفیف سی ہو گئی۔ ''میری آنکھ ہی نہیں کھلی.....اور پھر کسی نے جگایا بھی تو نہیں۔''

''بھئی ہمیں کیا خبر کہ تم کس وقت اٹھنے کی عادی ہو۔'' وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔

خضرا لاجواب سی ہو کر اپنی ندامت مٹانے کو بولی۔

''کوئی کام رہ گیا ہے تو میں کر لیتی ہوں۔''

''ہاں.....ایک کام رہتا ہے بھی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا.....؟'' خضرا نے مستعدی سے پوچھا۔

''کھانے کا کام.....'' اس کے انداز میں ایک مہذب چھیڑ تھی۔

''پلیز.....مذاق نہ اُڑائیں.....'' خضرا خجل سی ہو کر بولی۔

''اور مذاق کا برا نہیں مانا جاتا..... اس لئے تم بھی برا نہ منانا.....'' اس نے فرائی انڈے کو فرائنگ پین سے صحیح سلامت نکالنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس کا ملغوبہ سا بنا دیا.....اسے پلیٹ میں نکالتے ہوئے وہ بولا۔

''آج تو تمہیں ایسا ہی ناشتہ ملے گا.....بس تم جلدی سے ٹرالی میں برتن جماؤ اور پاپا کے کمرے میں لے چلو.....فٹافٹ.....'' اس نے الٹے سیدھے تلے ہوئے انڈوں کی ڈش اس کی طرف بڑھائی۔ سلائس بھی جگہ جگہ سے جل گئے تھے۔ خضرا اپنی ہنسی ہونٹوں میں دباتی، ٹرالی دھکیلتی اندر چلی آئی۔

''بہت جلدی تیار ہو گیا ناشتہ.....'' پاپا نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''سب کچھ انہوں نے ہی کیا ہے..... میں پہنچی تو وہ بنا چکے تھے۔'' خضرا نے اطلاع دی۔

''یہ تم مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو رہی ہو..... سب کچھ خود بنایا ہے اور نام میرا.....'' مثیم بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا۔

خضرا نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں اس طرح کا ناشتہ نہیں بناتی۔''

''یہ اچھی دھونس ہے.....اب گڑبڑ ہو گئی ہے تو میرا نام لگا رہی ہو.....'' مثیم ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ..... میں کس کی بات پر یقین کروں؟'' پاپا نے بھی دخل دیا۔

''آپ میری بات پر یقین کریں..... کیونکہ مجھے آپ بچپن سے جانتے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اسی لئے تو میں تم پر یقین نہیں کر سکتا کہ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں.....'' پاپا نے ہنستے ہوئے کہا اور خضرا سے بولے۔

''اور تم.....تم کیا کہتی ہو؟''

خضرا نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا..... ''میں..... میں کیا ہوں کہ یقین دلاؤں؟'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''تم میں..... میں کرنے کی بجائے ناشتہ کرو۔'' مثیم نے اسے ناشتے کی طرف متوجہ کیا۔

''ہاں بیٹی..... چلو پہلے ناشتہ ہی کر لو..... اگر یہ واقعی ناشتہ ہے تو۔'' پاپا نے مسکرا کر کہا اور پلیٹ اٹھا لی۔

ناشتہ کے نام پر بھرتہ بنے ہوئے انڈوں اور جلے ہوئے توسوں کو کھانا خاصا دشوار کام تھا۔ پاپا نے تو پریشان ہو کر کہہ دیا۔

''بھئی مجھے تو تم دودھ اور تھوڑے سے کارن فلیکس دے دو..... میں یہ عجیب وغریب چیزیں نہیں نگل سکتا.....ویسے بھی میں بیمار ہوں۔''

خضرا کی نگاہ غیر ارادی طور پر مثیم کی طرف گئی۔ وہ اس کے بنائے ہوئے ناشتے کی یہ

عزت افزائی دیکھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔

"محترمہ...... یہ آپ کیا مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھ رہی ہیں...... جیسے ناشتہ میں نے بنایا ہے۔" وہ پکا سا منہ بنا کر بولا۔

خضرا کو اس کے صفا جھوٹ پر بے اختیار ہنسی آ گئی تو وہ منہ بنا کر بولا۔

"یہ جو آپ نے ناشتہ بنایا ہے نا...... یہ سب کا سب آپ خود ہی نوش جان فرمائیں اور مجھے دودھ اور کارن فلیکس ہی دے دیں۔"

"بہت خوب......" پاپا کھل کر ہنسے۔ "تمہارے اس ناشتے کا حال میں عینی اور نینا کو ضرور بتاؤں گا۔"

ناشتہ ختم ہوا تو خضرا برتن سمیٹ کر کچن میں آ گئی۔ مثیم ہوسٹل جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ وہ ابھی برتن دھو رہی تھی کہ اس نے کچن کے دروازے میں سے جھانکا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں...... تمہیں کیا کہہ کر بات کی جائے؟"

"میرا نام خضرا ہے۔" خضرا نے اپنا نام بتایا۔

"تو ہاں خضرا...... میں ہوسٹل جا رہا ہوں...... تم پاپا کا خیال رکھنا...... انہیں وقت پر دوائی دے دینا۔ اور ہاں، کوئی ضرورت ہو تو مجھے فون کر لینا...... اچھا......" اس نے تاکید کی۔

"جی بہت اچھا......" خضرا نے مستعدی سے کہا۔

"اچھا...... خدا حافظ...... میں دو ڈھائی بجے تک آ جاؤں گا۔" اس نے یوں کہا جیسے اس کے خاندان کا کوئی فرد ہو۔"

خضرا کو نہ جانے کیوں ایک انجانی سی خوشی ہوئی...... اس نے جواباً خدا حافظ کہا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

وہ ابھی برتن دھو کر فارغ ہوئی تھی کہ صفائی کرنے والی آ گئی...... وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی اور کرید کرید کر اس کے بارے میں جاننے لگی۔ خضرا نے یہ کہہ کر اسے اطمینان دلایا کہ وہ پاپا کے دوست کی بیٹی ہے۔

وہ پاپا کے کمرے میں آئی تو وہ شیو کر رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" خضرا نے پوچھا۔

"دیکھ لو...... آرائش جمال میں مصروف ہوں۔" انہوں نے زندہ دلی سے کہا۔

"آپ نے دوائی لی......؟" خضرا نے استفسار کیا۔

"ہاں تھوڑی دیر ہوئی...... لی ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لنچ کے لئے کیا بناؤں؟" اس نے سوال کیا۔

انہوں نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"یہاں آؤ......" انہوں نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

خضرا ٹھٹک گئی۔ اسے عمر دراز کی خبیث آنکھیں یاد آئیں...... اسے چودھری صاحب اور ٹھیکیدار کی غلیظ نظریں یاد آئیں...... خوف کی ایک غیر مرئی کیفیت نے اسے سُن کر دیا۔

"یہاں آؤ نا بیٹی......" ان کا صاف لہجہ سنائی دیا۔ ان کے لفظوں کی پاکیزگی ان کی آنکھوں میں رچی بسی تھی۔

وہ چونک کر ان کے قریب آئی۔

"یہاں بیٹھو......" انہوں نے کہا۔ وہ پلنگ کی پٹی پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے آئینہ اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ "کچھ تمہیں اپنا بھی ہوش ہے...... ذرا دیکھو اپنا حلیہ...... اچھی بیٹیاں بھلا یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ رہتی ہیں...... ہیں؟" انہوں نے بے حد اپنائیت سے کہا۔

غیر ارادی طور پر خضرا کی نگاہ آئینے میں اپنے ہی عکس سے مل گئی...... اس نے صبح سے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔ صفائی کروانے میں چہرے پر گرد و غبار کی تہہ سی جم گئی تھی۔ کپڑے میلے اور سلوٹ زدہ تھے...... اپنے ہی بے ترتیب حلیے پر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"سنو...... عینی اور نینا کے وارڈروب سے کوئی کپڑے نکال لو اور نہا دھو کر اچھی بیٹی بنو...... پھر کھانے پکانے کی فکر کرنا......" انہوں نے اس کے بالوں پر ہلکی سی چپت لگائی۔

خضرا کی دلکش آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ اتنا خیال تو کبھی اس کی ماں نے بھی نہیں کیا تھا...... ایسی محبت، ایسا لگاؤ کا ذائقہ اس کے لئے نیا تھا...... اس نے عمر دراز اور ملک جیسے لوگوں کی آنکھوں میں ہوس اور آلودگی ہی دیکھی تھی...... ان کے رویے سے ہمیشہ کراہت ہی آتی تھی۔ ان کے وجود سے ایک ناقابل بیان خوف اور ناقابل برداشت گھن وابستہ ہو

گئی تھی ...... لیکن پاپا...... ان سے کتنے مختلف تھے...... جیسے کسی اور ہی دنیا کے باسی ہوں......ان کی صاف وشفاف آنکھیں آلودگی سے پاک تھیں......ان کے رویے کے لگاؤ اور محبت میں ایک پاکیزہ سی اپنائیت تھی۔ ان کے وجود سے ڈھارس سی ہوتی تھی۔ خضرا نہ جانے کس جذباتی کیفیت میں کچھ دیر ان کے پلنگ کی پٹی پر اسی طرح بیٹھی رہی...... اس کے ہاتھ میں آئینہ تھا......لیکن وہ اس میں دیکھ نہیں رہی تھی۔

''ارے بیٹی......اٹھو...... یہ تم کس سوچ میں پڑ گئی ہو......؟'' انہوں نے اسے چونکایا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ آپ ان سب لوگوں سے کتنے مختلف ہیں جن سے مجھے واسطہ پڑتا رہا ہے۔'' وہ شدید جذباتی غلبے کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکی۔

''سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے بیٹی......'' وہ بردباری سے بولے۔

''لیکن وہ سب تو ایک جیسے تھے...... بالکل ایک جیسے...... ان میں تو کوئی فرق نہیں تھا ......رتی بھر فرق نہیں تھا......صرف نام مختلف تھے۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

''بیٹی......تم ابھی بچی ہو...... اور یہ دنیا بہت بڑی ہے......تم نے اس کا جو چھوٹا سا حصہ دیکھا ہے، ساری دنیا ویسی نہیں ہے۔'' انہوں نے سمجھایا۔

''میری دنیا تو وہی ہے جو میرے اردگرد ہے۔'' خضرا نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''اور اس وقت جو دنیا تمہارے اردگرد ہے...... وہ اس سے مختلف ہے جس سے تم ہو کر آئی ہو...... ہیں ناں......'' وہ بولے۔

خضرا نے تائید میں سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''یہی میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں بیٹی......تمہارے محدود تجربے میں ساری دنیا نہیں سما سکتی۔ تھوڑے سے لوگ سارے انسانوں کی نمائندگی تو نہیں کر سکتے ناں...... ورنہ تو انسانیت سے اعتبار کب کا اٹھ گیا ہوتا......اور یہ دنیا انسانوں کی بستی نہیں، وحشیوں کا جنگل ہوتی۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں آہستگی سے کہا۔

خضرا کو ایسے میں وہ بہت اچھے لگے...... وہ اپنے دل میں امنڈنے والی عقیدت کو ان تک پہنچائے بغیر نہیں رہ سکی۔

''یہ دنیا مجھے بہت اچھی لگی ہے......اس لئے کہ یہاں آپ ہیں۔''

✿......✿

وہ سالن بنا کر روٹیاں بیل رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ ڈر کر یکدم پلٹی اور اس نے کھینچ کر وہ ہاتھ اپنی آنکھوں سے جدا کر دیئے۔ مثیم اس کے مقابل کھڑا تھا۔

''اوہ، معاف کرنا...... میں نے تمہیں عینی سمجھا تھا......تم اس کے کپڑے پہن کر بالکل اس کی طرح لگ رہی ہو۔''

خضرا کے سارے بدن میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ اسے عمر دراز کی میلی آنکھیں یاد آئیں...... اس کے وحشی بازوؤں کا حلقہ اپنی کمر کے گرد محسوس ہوا۔ اس کے کہے ہوئے لفظوں کی چنگاریاں گزرے وقت کی راکھ کو سلگانے لگیں۔

''......تمہیں تمہاری ماں کے کپڑے پہنے دیکھ کر مجھے مغالطہ ہو گیا تھا......''

اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ اس نے سہم کر سوچا کہ کیا یہاں بھی...... عافیت سے بھری اس دنیا میں بھی وہ میلی آنکھیں، وہ کراہت آمیز رویے اور آلودہ نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہوئی آن پہنچی تھیں؟ وہ خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔

''اوہو خضرا...... بھئی میں نے تمہیں ایسا کیا کہہ دیا ہے جو تم اتنی پریشان ہو گئی ہو؟'' مثیم اس کی طرف غور سے دیکھتا ہوا حیرت سے بولا۔

وہ خشک ہونٹوں کے ساتھ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے قریب آ کر اس کی نبض ہاتھ میں لی۔

''مت کرو!'' خضرا نے اچانک پوری قوت سے چیخ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

مثیم حیران رہ گیا۔

''خضرا...... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''چلے جاؤ یہاں سے...... چلے جاؤ...... مجھے کچھ مت کہنا...... مجھے مت چھونا...... مجھے ہاتھ نہ لگانا...... چلے جاؤ...... جاؤ......'' اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ دیوانی سی ہو رہی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور اس کی آواز کہاں تک جا رہی ہے۔

مثیم فوراً ہی کچن سے باہر نکل گیا۔ لیکن خضرا وحشت زدہ آنکھوں سے اس جگہ کو تکتی رہی

جہاں کچھ دیر پہلے مثیم کھڑا تھا، کسی خیالی پیکر کو مخاطب کر کے بے ربط جملے بولتی رہی۔

"جاؤ چلے جاؤ...... میرے قریب نہ آنا...... مجھے مت چھونا۔"

پاپا تیزی سے کچن میں داخل ہوئے اور خضرا کا شانہ ہلایا۔

"بیٹی...... بیٹی! ہوش میں آؤ...... وہ چلا گیا ہے...... وہ اب نہیں آئے گا...... تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

خضرا نے پلکیں جھپک کر ان کی طرف دیکھا۔ چند لمحے یوں دیکھتی رہی جیسے صاف نظر نہ آ رہا ہو۔

"بیٹی! تم محفوظ ہو...... بالکل محفوظ...... یہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔" پاپا نے شفقت سے پھر کئی بار دوہرایا۔ ان کے لفظوں کی ملائمت خضرا کے دل پر جا لگی۔ ان کے لہجے کی اپنائیت نے ضبط کے بندھن توڑ دیئے۔ ان کا مہربان چہرہ اسے اپنا اپنا سا لگا...... وہ بے ساختہ ان کے شانے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔

انہوں نے ہولے ہولے اس کے بال سہلائے۔

"رو لو...... رو لو بیٹی...... اس طرح دل کا غبار ڈھل جائے گا...... روح کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

نہ جانے کتنی دیر وہ آنسوؤں سے ان کا شانہ بھگوتی رہی...... پھر اس کی سسکیوں میں کمی آئی اور وہ ان سے علیحدہ ہو گئی۔ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بھی اسے ہچکیاں سی آ رہی تھیں۔

پاپا نے اسے مخاطب کیا۔

"پھلکے پکانے کا موڈ ہے یا میں بازار سے منگوا لوں؟"

وہ چونک کر سینک کی طرف بڑھی۔

"میں ابھی پکا لیتی ہوں......" اس نے بمشکل کہا اور پانی کا نل کھول کر ہاتھ دھونے لگی۔ پاپا کچن سے باہر نکل گئے۔

روٹیاں پکاتے ہوئے وہ دل ہی دل میں بے طرح خجل ہو رہی تھی۔ یہ اسے کیا ہو گیا تھا...... وہ کیوں آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو ان کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ پاپا اور مثیم اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ وہ یہی سوچ سوچ کر من ہی

من میں نادم ہو رہی تھی۔ ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن کھانا اسی کو لے کر جانا تھا۔ وقت کافی ہو چلا تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے کھانا ڈشوں میں نکال کر ٹرالی میں برتن رکھے اور کچھ شرمندہ شرمندہ سی ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ پاپا بستر پر دراز تھے اور مثیم قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ خضرا اس سے نگاہ ملاتے ہوئے بھی جھجک رہی تھی۔

"آہا...... ہماری بیٹی کھانا لے آئی۔" پاپا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ان کی آواز نے خضرا کو حوصلہ دیا۔ اس نے ٹرالی ان کے بیڈ کے ساتھ لگا لی۔

"یہیں بیٹھ جاؤ......" پاپا نے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے کہا۔

خضرا وہیں پر بیٹھ گئی۔ کھانا خاموشی سے کھایا جاتا رہا۔ کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ مثیم کھانا ختم کر کے ہاتھ دھونے کے لئے اٹھا تو پاپا نے خضرا کو مخاطب کیا۔

"بیٹی! مثیم مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولتا...... لیکن کوئی پتہ نہیں کہ کب انسان اس جفا کا شکار ہو جائے اسی لئے میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں کہ اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟ بیٹی، ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں...... سب کچھ مجھے صاف صاف بتا دو۔"

خضرا نادم سی ہو گئی۔ اس نے پشیمانی سے سر جھکایا اور ہونٹ چبانے لگی۔ انہوں نے تسلی کے لئے اس کی پشت پر ہلکی سی تھپکی دی۔

خضرا کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر خفیف سی ہو کر بولی۔

"نہیں...... انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا...... مجھے ہی کچھ ہو گیا تھا...... پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟...... یہ بہت بری بات ہوئی ہے۔ میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا...... میں نے آپ کو پریشان کر دیا، میں نے بہت غلط کیا۔ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"چلو جانے دو اس بات کو...... گزر گیا وہ وقت۔ تم مجھے اب یہ بتاؤ کہ تم ٹھیک ہو نا؟ کوئی خوف، پریشانی یا الجھن تو نہیں؟" انہوں نے بردباری سے پوچھا۔

خضرا نے نفی میں سر کو جنبش دی اور پشیمانی سے کہنے لگی۔

"آپ لوگ کتنے اچھے ہیں اور میں...... میں نے آپ کو کتنا پریشان کیا۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"تمہیں ایک شرط پر ہی معاف کیا جا سکتا ہے۔" پاپا کے بجائے مثیم کی آواز سنائی دی۔

خضرا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"فوراً اٹھو اور جلدی سے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔" مثیم نے حکم دیا۔

پاپا مسکرائے۔ "میرا خیال ہے یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔"

خضرا برتن سمیٹ کر چائے بنانے کے لئے اٹھ گئی۔

اگلی صبح وہ ناشتہ بنا چکی تھی کہ مثیم نے کچن کے دروازے میں سے جھانکا۔

"اجازت ہے...... اندر آ جاؤں؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

خضرا نے جھجک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اس سے شرمندہ شرمندہ تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے اسے اندر آ جانے کے لئے کہا۔

وہ کچن میں داخل ہوا۔

"اگر شور مچانے کا ارادہ ہے تو مجھے پہلے سے بتا دو کہ میں چلا جاؤں۔" اس نے چھیڑا۔

خضرا نادم سی ہو گئی۔

"پلیز...... اب اس بات کا تذکرہ نہ کریں۔"

"میں نے اپنی جان کی بھی تو خیر منانی ہے نا...... اس روز تو بچ گیا تھا لیکن اب پاپا مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔" وہ خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"آپ یونہی نہ کہیں...... پاپا بہت اچھے ہیں۔" خضرا نے اسے ٹوکا۔

"اوہ اچھا......" اس نے ابرو اچکائے۔ "اور پاپا کا فرزند ارجمند کیسا ہے؟...... وہ تو ہو بہو اپنے پاپا پر گیا ہے۔"

"لگتا تو نہیں......" خضرا کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"اچھا...... نہیں لگتا؟ کیوں بھئی، کس طرف سے نہیں لگتا؟" وہ اس کے سر ہو گیا۔ خضرا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی...... وہ زچ ہو کر کہنے ہی والی تھی کہ کال بیل زور سے بجی اور پھر مسلسل بجتی ہی چلی گئی۔ مثیم نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ آ گئے ہیں......" اس نے چٹکی بجائی اور کچن سے باہر نکل گیا۔

✿......✿

خضرا وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس نے خود کو پھر ایک بار شدید مشکل میں پایا۔ آنے والے لمحوں، خود پر پڑنے والی نگاہوں کے تصور سے ہی وہ لرز گئی۔ گھر کے اندر مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں اور ایک جیتی جاگتی سی چہل پہل چاروں طرف پھیل گئی۔

"السلام علیکم پاپا......"

"ہیلو پاپا......"

"پاپا آپ بہت یاد آتے تھے...... آپ کے بغیر دل نہیں لگتا تھا۔"

"پاپا آپ بڑے وہ ہیں...... ہمارے ساتھ کیوں نہیں گئے تھے؟"

"سنبھالئے اپنی ان لاڈلیوں کو...... انہوں نے تو پاپا پاپا کی رٹ لگا کر میرے ناک میں دم کر دیا۔"

ان سب آوازوں کے بیچ پاپا کی آواز بھی سنائی دی۔

"آپ نے بھی اپنے اس نیاز مند کو یاد کیا تھا کہ نہیں؟"

"کوئی نہیں پاپا...... بالکل نہیں...... ممی تو سارا وقت آنٹی سے باتوں میں لگی رہتی تھیں۔" کسی نے فوراً شکایت کی۔

"نہیں بھئی...... ہم یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ تمہاری ممی ہمیں دل میں یاد کرتی ہوں گی۔ ہم ایسے نہیں کہ کوئی ہمیں بھلا سکے...... پوچھو اپنی ممی سے۔" پاپا کے لہجے میں شوخی تھی۔

"ہٹیے بھی...... کیا آپ بچوں کے سامنے ہی......" آواز میں محبت آمیز سرزنش تھی۔

"اچھا بچو...... تم لوگ منہ دوسری طرف کر لو...... تمہاری ممی کو شکایت ہے کہ میں بچوں کے سامنے ہی......"

سب کا ملا جلا قہقہہ سنائی دیا۔

پھر پاپا نے کہا۔ "عینی بیٹے! ذرا کچن میں جاؤ اور وہاں جو کوئی بھی ہے اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔"

"کون ہے......؟"

"کون آیا ہے......؟"

"کس کی بات کر رہے ہیں......؟"

مختلف سوالوں کے درمیان کچن کی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

خضرا بری طرح پریشان ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود کو کہاں چھپا لے...... وہ لوگ نہ جانے اس کے بارے میں کیا خیال کریں گے؟ اسے کس نظر سے دیکھیں گے؟ اس کے اعصاب تن گئے تھے کہ نہ جانے اگلے لمحے اسے کن آنکھوں، کن چہروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کچن کے دروازے میں سے ایک نوخیز لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ بڑی بڑی شوخ آنکھوں اور پیشانی پہ کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ کوئی چھوٹی سی شریر لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ہنستی ہوئی شوخ آنکھوں کا زاویہ خضرا پر رکا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو......"

خضرا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی......صرف بے چارگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

وہ قریب آئی۔ "چلیے...... پاپا حضور نے یاد فرمایا ہے۔"

خضرا جھجکتی ہوئی اس کے ہمراہ چلی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ اندر موجود نئے چہروں نے دلچسپی اور تحیر سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں آؤ بیٹی......" پاپا نے اسے قریب بلایا۔

وہ سمٹی سمٹی سی ان کے قریب آئی۔ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"خواتین و حضرات! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟"

سارے چہروں نے نفی میں سر ہلایا۔

مثیم نے شرارت سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "سر! میں بتاؤں؟"

"چپ رہو......تم سے نہیں پوچھا۔" پاپا نے ٹوکا اور باقی کو مخاطب کر کے بولے۔ "یہ وہی بیٹی ہے جس کی وجہ سے میں یہاں ٹھیک ٹھاک، ہٹا کٹا تمہارے سامنے بیٹھا ہوں...... ورنہ ہوسکتا تھا کہ تم لوگ تشریف لاتے تو میں عالم بالا کی سیر کو جا چکا ہوتا۔"

"اوہ نو پاپا، پلیز......" عینی نے تیزی سے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" ممی نے ناگواری سے کہا۔

"اس طرح کے مذاق بالکل اچھے نہیں لگتے پاپا......" نینا نے احتجاج کیا۔

"اس طرح کے مذاق مجھے بھی اچھے نہیں لگتے۔ مگر مجبوری ہے۔ اس قسم کا مذاق آپ سے ہو چکا ہے۔ اگر آپ لوگ ایک صدمہ حوصلے سے برداشت کرنے کو تیار ہوں تو میں اس کی تفصیل بتاؤں۔" پاپا نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"کیا......؟" سب یک زبان ہو کر بولے۔

"بھئی اپنی ممی سے پوچھ لو، کہیں اسے ہارٹ اٹیک تو نہیں ہو جائے گا؟" پاپا مسکرائے۔

"جی نہیں...... اس گھر میں رہ کر میں اس قسم کی باتیں سننے کی عادی ہو چکی ہوں جن سے ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے۔" ممی نے ہنس کر جواب دیا۔

"پاپا بتائیں بھی...... کتنا سسپنس پیدا کر رہے ہیں آپ۔" عینی ٹھنکی۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ دو ہفتے پہلے ہم نے مسٹر اینڈ مسز خدا بخش کو گھر کے کام کاج کے لئے ملازم رکھنے کی غلطی کی تھی اور آپ لوگ انہی کے بھروسے پر مجھے چھوڑ کر شادی میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔" پاپا نے تمہید باندھی۔

"پھر......؟" تشویش بھرا سوال ہوا۔

"پھر یہ کہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد آدھی رات کو میں نے مسٹر اینڈ مسز خدا بخش کو کچھ پراسرار سرگرمیوں میں مصروف دیکھا۔ انہوں نے شاید کسی اور کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لیا تھا۔ کیونکہ وہ تین تھے۔ بدقسمتی سے میں انہیں ٹوکنے کی گستاخی کر بیٹھا۔ بس وہ دونوں تو چاقو لے کر مجھ پر چڑھ دوڑے...... شکر ہے گلا نہیں گھونٹ دیا۔ اسی ہاتھا پائی میں مجھے ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ ان کم بختوں نے یہ سمجھ کر کہ بڑے میاں اگلے جہان سدھار گئے ہیں مجھے پچھلے نالے میں جا پھینکا۔ میں تو وہاں پڑا پڑا شاید واقعی اگلے جہان کا ٹکٹ کٹا لیتا لیکن یہ بیٹی فرشتہ رحمت بن کر آ پہنچی۔ اس نے مجھے نالے کے اندر سے دریافت کیا اور بیچاری تب سے میرے کل پرزے مرمت کرنے میں لگی ہوئی ہے۔"

انہوں نے بات ختم نہیں کی تھی کہ عینی نے دوڑ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اوہ پاپا...... شکر ہے آپ کو کچھ نہیں ہوا۔"

"ہاں...... مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ البتہ انہوں نے تمہاری الماریوں کی خوب صفائی کی

ہے۔'' پاپا بولے۔

''دفع کریں......آپ کی جان کا صدقہ۔'' ممی نے تیزی سے کہا۔

''لعنت بھیجیں پاپا......اس گھر میں آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔'' ضرغام نے کہا۔

''ویسے دیکھو، وہ اٹھائی گیرے کیا کچھ لے گئے ہیں؟'' پاپا بولے۔

''اس گھر کی سب سے قیمتی چیز آپ ہیں پاپا، بس......'' ننھے ننھے پونی ٹیل ہلاتی نینا ان کے بازو سے لگ کر بولی۔

خضرا خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک انبساط آمیز استعجاب سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ان کی محبت، ان کا لگاؤ اسے متحیر کر رہا تھا۔ وہ ہر طرح کے نقصان سے بے نیاز تھے۔ کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ چوری میں ان کا کتنا مال چلا گیا ہے......وہ کون کون سی قیمتی چیز سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ صرف پاپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہی کی طرف متوجہ اور بار بار شکر ادا کر رہے تھے کہ وہ سلامت تھے۔

ان کے اس تعلق کی خوبصورتی، آپس کے رشتوں کی مضبوطی اور محبتوں کے اس والہانہ گداز نے خضرا کے دل کو رشک و ستائش سے بھر دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور دنیا میں چلی آئی ہے جس کے طور طریقے، انداز و آداب اس دنیا سے یکسر مختلف تھے جس نے اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں ڈالا تھا نہ محبت......نہ کوئی رشتہ!

''تم لوگ میری ہی تاج پوشی کرتے رہو گے یا اس بیٹی کا بھی شکریہ ادا کرو گے جس نے مجھے نئی زندگی دی ہے اور میرا اتنا خیال رکھا ہے کہ یہ شریر عینی بھی نہیں رکھ سکتی۔'' پاپا نے ان سب کو خضرا کی طرف متوجہ کر دیا۔

''پاپا......'' عینی نے مصنوعی غصے سے ان کا بازو جھنجھوڑا۔

خضرا جھینپ سی گئی۔

''آپ تو ایسے ہی......'' اسے کہنے کے لئے لفظ نہیں ملے۔

''نہیں بیٹی......یہ تمہارا احسان ہے......تم نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو محفوظ رکھا ہے......'' ممی نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

خضرا کو ایک ایسی تسکین کا احساس ہوا جو اس کے لئے نئی تھی۔ اسے خود پر فخر سا ہونے لگا۔ وہ سب کچھ بھول کر اسی چھوٹی سی جنت میں کھو گئی۔

۞......۞

وہ چھوٹی سی جنت بے حد خوبصورت تھی۔ پیار کے رنگوں میں بسی ہوئی......محبتوں کے روپ سے سجی ہوئی۔ وہ سب ایک دوسرے سے بے حد قریب رشتوں کی مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کا تعلق بے حد حسین اور اپنائیت سے بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے نہ اس سے کچھ پوچھا تھا نہ کوئی استفسار کیا تھا۔ اسے اپنے اندر یوں جذب کر لیا تھا جیسے وہ ان سے علیحدہ تھی ہی نہیں۔

عینی اور نینا کی طرح وہ بھی اس گھر کی بیٹی بن گئی تھی لیکن اسے اپنا وجود اس گھر میں اوپرا اوپرا سا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ بدنام ماں کے طعنے، مجرم باپ کی تہمت تھی۔ وہ اپنے ناگوار وجود کو اس شریف گھر کا حصہ نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ جنت جیسی اس دنیا کو اپنے دم سے مسموم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی دنیا میں لوٹ ہی جانا چاہئے تھا۔ اسی مکر و فریب سے بھری ہوئی دنیا میں جس کے دیئے ہوئے زخموں، تہمتوں اور ناکردہ گناہوں نے اسے اتنا بدل دیا تھا کہ وہ اس جنت جیسی دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ اسی موقعے کی تلاش میں تھی کہ پاپا سے بات کر کے جانے کی اجازت لے لے۔ اس کے راستے علیحدہ تھے۔ اس کو انہی پر چلنا تھا۔ وہ کتنے روز ان پر بوجھ بن سکتی تھی۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا......زندگی میں کوئی راہ اپنے لئے نکالنی تھی۔

پاپا اب مکمل طور پر تندرست تھے۔ اپنے آفس جانے لگے تھے۔ وہ عموماً دو ڈھائی بجے آفس سے واپس آ جاتے تھے۔ کھانا اسی وقت کھایا جاتا تھا۔ لیکن اس روز وہ خلاف معمول جلدی گھر آ گئے۔ عینی اور نینا تھوڑی دیر ہوئی کالج سے آئی تھیں۔

''آہا......آج تو پاپا بھی جلدی آ گئے ہیں۔'' عینی نے خوش ہو کر کہا۔

''بس پاپا......آج دوپہر کو کیرم کی بازی لگے گی۔'' نینا نے کہا۔

''صرف آج ہی نہیں، کیرم کی بازی تو روز ہی لگے گی۔'' وہ بوٹوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولے۔

''آپ کے اوقات بدل گئے ہیں کیا؟'' ممی نے پوچھا۔

''نہیں......ٹائم تو نہیں بدلا۔ ہاں میں نے ہی آج بات ختم کر دی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

"کیا مطلب؟" ممی نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آج میں نے استعفیٰ بیگ صاحب کے منہ پر مار دیا ہے۔ میں نے ملازمت کی ہے، اپنا ایمان تو نہیں رہن رکھ دیا...... نوکری کی ہے، ضمیر کا سودا تو نہیں کر لیا۔" انہوں نے خلافِ عادت درشتی سے کہا۔ شاید ان کے ذہن میں وہ تلخی ابھی تک تازہ تھی جس کے باعث نوبت یہاں تک پہنچی تھی۔

"چلیں اچھا کیا آپ نے...... کچھ دن آرام کریں۔" ممی نے کمال بے نیازی سے کہا۔ "رازق تو خدا کی ذات ہے...... یہ نا ہنجار بیگ تو نہیں۔"

"ویل ڈن پاپا...... بہت اچھے۔" عینی نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ "ذرا اس بیگ کے بچے کو بھی پتہ چلے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں خریدا نہیں جا سکتا۔"

"ہمارے پاپا تو انمول ہیں۔" نینا نے محبت سے ان کے بازو سے لگ کر کہا۔

"اوئے یہ کون گستاخ ہے جو پاپا کا مول تول رہا ہے۔" ضرغام کی آواز سنائی دی۔ وہ اور مثیم اکٹھے ہی باہر سے آئے تھے۔

"ہے ایک عقل کا اندھا، تمہارے پاپا کا باس، بیگ۔" امی نے ہنس کر کہا۔

"اس بیگ کی ایسی تیسی...... میں سرجری کر کے اس کی عقل نہ ٹھکانے لگا دوں۔" مثیم نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"دفع کریں مثیم بھائی...... آپ کے آلات مفت میں گندے ہوں گے۔" عینی نے ناک بھوں چڑھائی۔

"پاپا استعفیٰ منہ پر مار کر اس کا علاج کر آئے ہیں۔" نینا نے اطلاع دی۔

"ہرے...... پاپا زندہ باد......" مثیم اور ضرغام نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

مثیم ان کے قریب آیا۔

"پاپا! مجھے آپ پر فخر ہے...... میں سر اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میرا باپ میرا آئیڈیل ہے۔"

پاپا مسکرائے اور اس کے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں الجھا کر مصنوعی سنجیدگی سے بولے۔

"بیٹے...... تم مجھے صرف پاپا ہی رہنے دو...... یہ آئیڈیل والا جاب مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں۔"

ضرغام نے قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھی پاپا تو ممی کے آئیڈیل ہیں۔ وہ اس جاب سے تو استعفیٰ نہیں دے سکتے نا۔ مجبوری ہے۔"

"چل شریر......" ممی نے ضرغام کو پیار سے ایک چپت جمائی اور سب کو مخاطب کر کے بولیں۔ "سب لوگ پہلے کھانا کھا لیں۔ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

وہ سب ہنستے، خوش گپیاں کرتے یوں کھانا کھانے چل دیئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ خضرا کو حیرت ہوئی۔ نہ کسی کو تشویش تھی نہ کسی نے کوئی اعتراض کیا تھا نہ کسی کو کوئی فکر تھی۔ وہ سب پاپا کے فیصلے پر خوش اور مطمئن تھے۔

وہ اندر ہی اندر افسردگی سے ماں کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ باپ سے کتنی دور تھی۔ اس کے لئے باپ کی ہر بات کتنی ناپسندیدہ تھی۔ اسے باپ کی محبت، اس کی قربت سے زیادہ اس کی آمدنی کی فکر رہتی تھی۔ اس نے تو کبھی باپ سے نرم لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اور یہ لوگ آپس میں کتنے جڑے ہوئے تھے۔ محبت کے ساتھ، پیار کے ساتھ کتنی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔

✡......✡

پاپا اب ملازمت کی بجائے کسی کاروبار کی فکر میں تھے۔ وقت بے وقت گھر سے باہر رہتے تھے۔ گھر میں ہونے والی تبدیلیوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی بیکاری نے بجٹ پر اثر ڈالا ہے۔ لیکن ممی کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ گھر کی فضا میں کوئی تناؤ نہیں تھا۔ سب پہلے کی طرح خوش، آسودہ اور اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے۔

خضرا استعجاب سے ان کی دنیا کو دیکھتی تو اسے اپنا آپ بڑا اجنبی محسوس ہوتا۔ وہ اپنے وجود سے ان کے لئے کوئی پریشانی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہاں ٹھہرے ہوئے تقریباً ہفتہ بھر ہو چلا تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ان پر انحصار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی تھی۔

وہ ہر روز سوچتی کہ وہ پاپا سے بات کر کے یہاں سے رخصت ہو جائے۔ لیکن ہر روز نہ اسے موقع ملتا نہ ہمت پڑتی۔ پاپا گھر آتے تو وہ باتوں، خوش گپیوں میں مصروف ہو

جاتے۔ پاپا دن بھر کی روداد کہتے اور خضرا سوچتی ہی رہ جاتی کہ بات کس طرح اور کہاں سے شروع کرے۔

ایک شام اس نے ہمت کر ہی لی۔ ابھی سب اپنے اپنے کمروں میں تھے، شام کی چائے ابھی نہیں پی گئی تھی۔ پاپا بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان سے بات کرنے کے لئے خود کو تیار کرتی ان کے قریب پہنچی تو انہوں نے اخبار سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''آؤ، آؤ بیٹی...... لگتا ہے آج کوئی خاص بات ہے جو تم نے اتنا سنجیدہ چہرہ بنایا ہوا ہے۔''

خضرا قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، اسے اپنا مدعا لبوں تک لانے میں سہولت ہو گئی۔ اس نے بغیر کسی تمہید سے کہا۔

''پاپا! میں جانا چاہتی ہوں......''

''کیا مطلب ہے تمہارا بیٹی؟'' انہوں نے یوں کہا جیسے اس کی بات نہ سمجھے ہوں۔''

''پاپا میں جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے صاف لفظوں میں دوہرایا۔

انہوں نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا اور پڑھنے کی عینک اتار کر پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیوں بیٹی......؟''

خضرا نے لاجواب سی ہو کر اپنا ہونٹ کاٹا۔ ''اس کیوں کا جواب آپ کو معلوم ہے۔''

''نہیں بیٹی......'' پاپا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا صحیح جواب تمہارے ہی پاس ہے۔''

خضرا کچھ دیر متذبذب سی رہی، پھر قدرے افسردگی سے بولی۔ ''میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔''

''ارے بیٹی کیا یہ تم سب کچھ اس لئے کہہ رہی ہو کہ میں بے روزگار ہوں؟'' انہوں نے اپنائیت سے پوچھا۔

''نہیں، نہیں...... یہ بات نہیں ہے۔'' خضرا نے جلدی سے تردید کی۔ ''یہاں تو سب کچھ ہے، اس گھر نے مجھے بتایا ہے کہ دنیا میں سچے رشتے بھی ہیں، محبتیں بھی ہیں اور اچھے لوگ بھی ہیں۔ ورنہ اب تک دنیا میرے لئے جھوٹ، برائی اور فریب کے سوا کچھ نہیں تھی۔

اس گھر نے مجھے ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ اس نے میرا کھویا ہوا اعتماد مجھے لوٹایا ہے۔ یہ گھر میری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس نے مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ لیکن میں کچھ کرنا چاہتی ہوں، اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں...... میں سہاروں کے بغیر زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔''

''تمہارے ارادے بہت نیک ہیں...... تم ان پر ضرور عمل کرو۔ لیکن اس کے لئے گھر کو چھوڑنا تو ضروری نہیں۔'' انہوں نے ملائمت سے کہا۔

''میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس گھر میں رہوں۔'' وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اضطراب میں مسلتے ہوئے بولی۔

''کیوں بیٹی...... تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟'' وہ کہنے لگے۔

''آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے...... شاید اسی لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔

''میرا تجربہ بہرحال تم سے کچھ زیادہ ہے بیٹی...... مجھے بھلے برے چہروں کی تھوڑی بہت پہچان بھی ہے اور تمہارے بارے میں کم از کم مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ تم عینی اور نینا جیسی ایک معصوم بیٹی ہو...... ہاں وقت نے اور دنیا نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہاں اب بولو کیا اب بھی تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟'' ان کے انداز میں اپنائیت اور ہمدردی تھی۔

خضرا کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ چند لمحے اپنے حلق میں اٹکے ہوئے آنسوؤں کو پیتی رہی۔ اس سے بات نہیں ہو سکی۔

''ہاں بولو نا بیٹی......'' اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے اصرار کیا۔

خضرا نے بڑی کوشش سے اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ اس نے بات کی تو اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

''آپ...... آپ بہت اچھے ہیں...... لیکن میں عینی اور نینا جیسی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایک مجرم باپ، بدنام ماں اور آوارہ بھائی کی تہمت بھی ہے۔ یہ بیٹیوں والا گھر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے اس پر کوئی آنچ آئے۔ آپ جیسے لوگوں میں جذب نہیں ہو سکتی۔ میرا ماضی، میری اصلیت آپ کو بھی ڈس لے گی۔ میرا باپ جیل میں قتل ہوا تھا،

میری ماں کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ میرا سوتیلا باپ مجھ پر بری نظر رکھتا ہے۔ اس نے کاروبار میں شراکت کرنے کے لئے مجھ پر داؤ لگایا تھا لیکن خدا نے مجھے بچالیا...... اور میرا معصوم بھائی جرائم کے چنگل میں پھنس کر مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس گھر میں رہوں۔ مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہئے۔ میں کل چلی جاؤں گی۔''

''کہاں جاؤ گی تم...... اپنی ماں کے پاس؟ کیا وہاں تم محفوظ رہ سکو گی؟'' انہوں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں...... میری ماں میرے لئے مرگئی ہے۔ اپنی ایک سہیلی کے پاس جاؤں گی۔ وہ بھی میری طرح دکھی ہے اور اپنی بوڑھی نانی کے پاس رہتی ہے۔'' خضرا نے بتایا۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ تم وہاں محفوظ رہو گی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی......'' خضرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہوں...... تو گویا تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہاں سے چلی جاؤ گی؟'' انہوں نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔

خضرا نے جھکے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''ٹھیک ہے...... تمہاری مرضی ہے۔ لیکن اس گھر میں میرے علاوہ بھی تو کچھ لوگ ہیں۔ ان سے بھی تمہارا تھوڑا بہت تعلق تو بنتا ہے نا...... میرا خیال ہے ان سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے پاس کوئی بہتر مشورہ ہو، کوئی اچھی تجویز ہو جس پر تم غور کر سکو۔'' انہوں نے مفاہمت کے انداز میں کہا اور بلند آواز میں عینی کو پکارا۔

''جی پاپا...... یس سر......'' وہ مسکراتی ہوئی آئی۔

''بیٹی ذرا کورم تو پورا کرو یہاں...... ایک ضروری مسئلہ آن پڑا ہے۔'' انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے پاپا......؟'' اس نے بڑی بڑی شریر آنکھیں گھمائیں۔

''تم اپنی یہ تفتیش فی الحال رہنے دو اور جو کچھ تم سے کہا ہے وہ کرو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پیار سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد عینی پلٹی تو اس کے ساتھ ننھے ننھے پونی ٹیل ہلاتی نینا بھی تھی۔ چند لمحوں بعد ممی ہاتھ پونچھتے ہوئے آئیں۔

''ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی ہے؟''

''آپ کے ہوتے ہوئے کوئی ایمرجنسی، ایمرجنسی نہیں ہے۔'' پاپا نے چھیڑا۔

ممی کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ مثیم اور ضرغام بھی آگے پیچھے چلے آئے۔ خضرا جھجک سی گئی۔ اسے ان سب کی نگاہوں کا مرکز بننا بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کرسیاں اور مونڈھے گھسیٹ کر اطمینان سے بیٹھ گئے تو پاپا نے جیسے دھماکا کیا۔

''بھئی آپ لوگوں کو اس لئے زحمت دی گئی ہے کہ ہماری بیٹی خضرا اس گھر کو چھوڑ کر جانا چاہتی ہے۔''

سب نے ایک ساتھ خضرا کی طرف دیکھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور پشیمانی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''کیوں......؟'' ان سب نے ملا جلا سوال کیا۔

''لو بھئی خضرا بیٹی...... اس اجتماعی کیوں کا جواب دو۔'' پاپا نے اسے مخاطب کیا۔

خضرا گڑبڑائی اور اٹکتے ہوئے بولی۔ ''پاپا میں آپ کو بتا تو چکی ہوں''

''اچھا، اچھا......'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''تم نے بتایا تو ہے۔ لیکن ان سب کو بھی بتاؤ''

خضرا اور پریشان ہوئی۔ ''پلیز آپ...... آپ بس مجھے جانے دیں۔ سب کے لئے یہی بہتر ہے۔''

''سب کے لئے کس طرح بہتر ہے......؟'' مثیم نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''میں پاپا کو بتا چکی ہوں۔'' خضرا نے جواب دیا۔

''کیا بتایا اس نے آپ کو؟'' مثیم نے پوچھا۔

''خیر...... وہ تو کوئی ایسی یاد رکھنے والی چیز نہیں تھی جو مجھے یاد رہ جاتی۔ یادداشت میری ویسے بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ ہاں البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ خضرا کے پاس اس گھر سے باہر کوئی محفوظ پناہ گاہ نہیں...... آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟...... کیا ایسی صورت میں ہمیں اس کو چلے جانے کی اجازت دے دینی چاہئے؟'' انہوں نے بھرپور نگاہ سب پر ڈالی۔

خضرا کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگیں۔ اس کا سر آپ سے آپ جھک گیا۔ وہ آنے والے لمحوں سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں...... اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے...... آپ کی اپنی بیٹیاں نہیں ہیں کیا...... آپ عینی یا نینا کو اس قسم کے حالات میں جانے کی اجازت دے سکتے ہیں؟" ممی نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"خیر...... میں تو نہیں دے سکتا۔ لیکن میں نے خضرا کے خیال سے سوچا تھا کہ شاید آپ لوگوں میں سے کوئی اس کی مدد کر دے۔" پاپا نے فوراً صفائی پیش کی۔

"پاپا...... کیا ہم آپ سے الگ ہیں؟" عینی نے بھی دخل دیا۔

"پاپا...... اگر آپ اجازت نہیں دے سکتے تو ہم بھی نہیں دے سکتے۔" ضرغام نے اعلان کیا۔

"ارے لڑکی سنو...... تمہیں بالکل اجازت نہیں ہے۔" قریب پڑے ہوئے اخبار کے ساتھ اس کے گھٹنے کو چھو کر مشیم نے اسے متوجہ کیا۔

خضرا کی آنکھوں میں آنسو اس تیزی سے امنڈے کہ اسے خود بھی ان کے رخساروں پر بہہ جانے کی خبر نہیں ہوئی۔ اس کا متحیر ذہن سوچتا رہ گیا وہ کس دنیا میں چلی آئی تھی......؟ یہ حقیقت تھی یا جاگتی آنکھوں کا کوئی سہانا خواب......؟ وہ لوگ اسی دنیا کے رہنے والے تھے یا کسی دوسری دنیا کے باسی؟ اسے بار بار یہ گمان ہوتا تھا کہ کہیں یہ خواب ٹوٹ تو نہیں جائے گا۔

"کہو بیٹی...... اب کیا کہتی ہو تم؟" پاپا نے استفسار کیا۔

خضرا نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور بمشکل چند لفظوں میں اپنے دل کی کیفیات کو سمو سکی۔

"میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے...... آپ کی عظمت نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ آپ نے انسانیت پر سے اٹھا ہوا اعتبار لوٹا دیا ہے...... اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا بھی رہنے کی جگہ ہے۔"

"اور دنیا میں رہنے والوں کا تو جواب نہیں۔" مشیم نے اپنا کالر چھوتے ہوئے کہا۔

پاپا مسکرائے۔ "ہمارے مشیم کا کوئی جواب ہے یا نہیں یہ ہم خضرا سے پھر کبھی پوچھیں گے۔"

"آپ ابھی پوچھ لیں نا پاپا......" مشیم نے ان کے کندھے خوشامدانہ انداز میں دباتے

ہوئے کہا۔

"چپ رہو شریر......" ممی نے پیار سے اس کے سر پر چپت جمائی۔

پاپا نے خضرا کے شانے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے بولے۔

"بیٹی...... یہ دنیا تمہاری ہے...... تم نئے سرے سے، اپنے انداز میں زندگی کو شروع کرو اور اسے ویسا ہی بناؤ جیسا تم چاہتی ہو۔"

خضرا نے بھیگی ہوئی متشکر آنکھوں سے ان کی جانب دیکھا۔ اس کے زرد رخساروں پر ہلکی ہلکی سی سرخی پھوٹ رہی تھی۔

(ختم شد)